عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کا مطالعہ

(فنی اور ثقافتی تناظر میں)

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

جاوید اقبال

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مئی، ۲۰۲۱ء

عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کا مطالعہ

(فنی اور ثقافتی تناظر میں)

مقالہ نگار

جاوید اقبال

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مئی، ۲۰۲۱ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کا مطالعہ (فنی اور ثقافتی تناظر میں)

پیش کار: جاوید اقبال رجسٹریشن نمبر:620-Phd/Urd/S16

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان وادب

ڈاکٹر رخشندہ مراد ____________________
نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________
ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈیئر سید نادر علی ____________________
ڈائریکٹر جنرل

میجر جنرل محمد جعفر (ر)، ہلال امتیاز (ملٹری) ____________________
ریکٹر

تاریخ ____________________

اقرار نامہ

میں جاوید اقبال یہ حلفیہ اقرار کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد کے پی۔ ایچ۔ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر رخشندہ مراد کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونی ورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ پیش کروں گا۔

____

جاوید اقبال

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	viii
اظہارِ تشکر	ix
بابِ اول: موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف۔ تمہید	۱
i. موضوع کا تعارف	۲
ii. بیان مسئلہ	۲
iii. مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۲
iv. تحقیق کی اہمیت	۲
v. تحدید	۳
vi. مقاصد تحقیق	۳
vii. تحقیقی سوالات	۳
viii. نظری دائرہ کار	۳
ix. پس منظری مطالعہ	۴
x. تحقیقی طریقہ کار	۴
ب۔ عطاء الحق قاسمی۔۔۔ تعارف اور اصولی مباحث	۵

سوانح اور شخصیت ۵

ج۔ اردو ادب پر پنجابی زبان کے اثرات ۱۵

د۔ اردو زبان پر انگریزی زبان کے اثرات ۳۵

i۔ اردو اور پنجابی، لسانی اور ثقافتی اشتراکات ۴۸

ii۔ قیام پاکستان سے قبل اردو ادب میں پنجابی الفاظ کا پس منظری مطالعہ ۵۶

حوالہ جات ۶۰

باب دوم: عطاء الحق قاسمی کے کالموں میں پنجابی لفظیات کا فنی اور ثقافتی تناظر ۶۲

الف: عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی لفظیات کا ثقافتی تناظر ۶۲

☆ پنجابی معاشرت کی عکاسی ۶۲

☆ ایک ثقافت کے دوسری ثقافت پر اثرات مرتب ہونے کی وجوہات ۸۶

☆ پنجابی فنون لطیفہ کی عکاسی ۹۳

ب: عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی لفظیات کا فنی تناظر ۹۹

مصنف کا اسلوب ۱۰۰

بیانیہ انداز ۱۰۶

پنجابی لفظیات کا استعمال ۱۱۰

محاورات، تلمیحات، تشبیہات واستعارات وغیرہ ۱۱۷

اشاریہ پنجابی الفاظ ۱۲۶

حوالہ جات ۱۵۳

باب سوم: عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی لفظیات ثقافتی اور فنی ۱۶۲

تناظر
الف: عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی لفظیات کا ثقافتی تناظر ۱۶۲
انگریزی معاشرت کی عکاسی ۱۶۳
انگریزی رسم و رواج کی عکاسی ۱۸۱
انگریزی فنون لطیفہ کی عکاسی ۱۹۷
ب: عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی لفظیات کا فنی تناظر ۲۰۷
مصنف کا اسلوب ۲۰۷
بیانیہ انداز ۲۱۰
انگریزی لفظیات کا استعمال ۲۱۲
محاورات، تلمیحات، تشبیہات، استعارات وغیرہ ۲۲۶
اشاریہ انگریزی الفاظ ۲۳۲
حوالہ جات ۲۵۷
باب چہارم: عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کے متبادل اردو لفظیات کے ساتھ تقابل ۲۶۰
۱۔ پنجابی لفظیات کے متبادل اردو لفظیات کا تقابل ۲۶۰
۲۔ انگریزی لفظیات کے متبادل اردو لفظیات کا تقابل ۲۸۳
حوالہ جات ۲۹۲
باب پنجم: ماحصل ۳۱۳
الف: مجموعی جائزہ ۳۱۳
ب: نتائج ۳۲۶

ج: سفارشات ۳۳۲
کتابیات ۳۳۴
ضمیمہ مصاحبہ عطاء الحق قاسمی ۳۳۸

ABSTARCT

Ata-ul-Haq Qasimi is a multi-faceted personality. While he is a very good poet, he also has a prominent name in prose. Ata-ul-Haq Qasmi is best known for his prose, columnist, correspondent and playwright. In the research Thesis I look at, the topic of Punjabi vocabulary in the context of Attaul Haq Qasmi's prose is in the context of art and cultural. The linguistic diversity in Urdu literature is also due to the linguistic cultural background of the authors. The linguistic partnerships of Urdu and Punjabi have a history of more than a thousand years. Therefore, any author has any particular cultural and artistic background. He is not only an interpreter of his own culture, but is also expressive in the form of style in his writings. Its language and cultural context are distinguished by its style. The combination of Punjabi language vocabulary on Urdu language and literature can be seen in two different contexts.Here we will look at Ataul Haq Qasmi's columns, journals and readings in a technical and critical context and review and critique them. Columns have a specific literary language. Similarly, itineraries have their own special language and dramas have their own particular color. We will review all three of his essays, both technical and cultural. The cultural context is related to the author's linguistic and cultural background. Any author is not only an interpreter of his or her culture, but his language, his uniqueness, and his distinctiveness from other cultural groups are an important symbol. For example, the personal, cultural experience of Urdu writers from Lahore or Peshawar is different from the Urdu literature of Lucknow and Delhi and the major part of this disagreement is with the mother tongue or regional language. There are also effects of Punjabi vocabulary. What is the effect of English language on Urdu literature, since English is the second most spoken language in the world and in our literature, the influence of English words is often seen in the prose of most writers especially Ataul Haq Qasmi. Therefore, this study will consist of an overview of the use of these words in a technical and cultural context.

اظہارِ تشکر

رب ذوالجلال کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں تعلیمی اعلیٰ ڈگری پی۔ ایچ۔ ڈی کے حصول کے لیے تحقیقی مقالہ لکھ سکوں اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ اتنے شفیق اساتذہ ملے۔ مجھے ڈاکٹر رخشندہ مراد محنتی اور تحقیق کروانے والی استاد اور نگران مقالہ ملیں جنھوں نے میرے اندر تحقیقی ذوق کو اجاگر کیا اور میری اس سلسلہ میں رہنمائی فرمائی۔

کلاس ورک کے کٹھن مرحلے کے بعد موضوع کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو مجھے "عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کا مطالعہ (فنی اور ثقافتی تناظر میں)"کا موضوع تفویض ہوا۔ عطاء الحق قاسمی اردو ادب کا ایک معتبر نام ہے۔ ان کے سفر ناموں، کالموں اور ڈراموں میں پنجابی لفظیات کا مطالعہ فنی اور ثقافتی تناظر میں نہیں ہوا تھا میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے پہلی بار ان کی نثر پر کام کرنے کا موقع ملا۔

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز، اسلام آباد، شعبہ اردو کے تمام اساتذہ جنھوں نے میری رہنمائی فرمائی ان کا ممنون ہوں۔ خاص طور ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر روبینہ شہناز، ڈاکٹر رخشندہ مراد اور ڈاکٹر عابد سیال اور ڈاکٹر فوزیہ اسلم صدر شعبہ اردو کا سپاس گزار ہوں۔ اس کے بعد میں اپنے والدین کی دعاؤں کا شکر گزار ہوں اگر ان کی دعائیں شامل حال نہ ہوتیں تو شاید میں آج اس مقام تک نہ پہنچ پاتا۔

اپنے بہن بھائیوں کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالہ کی تکمیل تک میرا ساتھ دیا۔ اپنے دوست ذوالفقار احسن کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے مقالہ کی کمپوزنگ سے لے کر کتابوں کی فراہمی اور عطاء الحق قاسمی سے مصاحبہ میں بھی میرا ساتھ دیا۔

جاوید اقبال

باب اول

موضوعِ تحقیق کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوع کا تعارف(INTRODUCTION)

عطاء الحق قاسمی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ جہاں وہ ایک بہت اچھے شاعر ہیں وہاں پر وہ نثر میں بھی نمایاں نام رکھتے ہیں۔ نثر کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی کالم نگار، سفر نامہ نگار اور ڈرامہ نگار کے حوالے سے جانے جاتے ہیں۔ زیر نظر تحقیقی مقالے میں میرا موضوع عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی اور انگریزی لفظیات اور انگریزی فنی اور ثقافتی تناظر میں ہے۔ اردو ادب میں لسانی تنوع مصنفین کے لسانی ثقافتی پس منظر کی وجہ سے بھی ہے۔ اردو اور پنجابی کے لسانی اشتراکات ایک ہزار سال سے زائد کی تاریخ رکھتے ہیں۔ اسی طرح اردو ادب پر انگریزی زبان کے لسانی اشتراکات فورٹ ولیم کالج سے شروع ہو کر سرسید تحریک تک زیادہ نظر آتے ہیں۔

چنانچہ کوئی بھی مصنف کسی بھی خاص ثقافتی اور فنی پس منظر کا حامل ہوتا ہے۔ وہ فطری طور پر اپنی ثقافت کا نہ صرف ترجمان ہوتا ہے بلکہ اس کا اظہار گاہے بہ گاہے اس کی تحریروں میں اسلوب کی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اس کی زبان اور دیگر ثقافتی تناظر اس کے اسلوب کے امتیازات قرار پاتے ہیں۔ اردو زبان و ادب پر پنجابی اور انگریزی زبان کی لفظیات کی آمیزش کو دو مختلف تناظرات میں دیکھا جاسکتا ہے۔

یہاں پر ہم عطاء الحق قاسمی کے کالموں، سفر ناموں اور ڈراموں کو فنی اور ثقافتی تناظر میں دیکھا گیا ہے اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ کالم کی مخصوص ادبی زبان ہوتی ہے۔ اسی طرح سفر نامے کا اپنا مخصوص لب ولہجہ ہوتا ہے اور ڈراموں کا اپنا مخصوص رنگ ہے۔ ہم نے ان کی تینوں اصناف کا فنی اور ثقافتی جائزہ لیا ہے۔

ثقافتی تناظر کا تعلق خود مصنف کے لسانی اور ثقافتی پس منظر سے ہوتا ہے۔ کوئی بھی مصنف فطری طور پر اپنی ثقافت کا نہ صرف ترجمان ہوتا ہے بلکہ اس کی زبان، اس کی انفرادیت اور دیگر ثقافتی گروہوں سے اس کی امتیاز کی ایک اہم علامت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر لاہور یا پشاور سے تعلق رکھنے والے اردو ادیب کا ذاتی، ثقافتی تجربہ لکھنؤ اور دہلی کے اردو ادیب سے مختلف ہے اور اس اختلاف میں بڑا حصہ مادری یا علاقائی زبان کا ہے

اس لیے پنجاب سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے بیانیے میں بھی پنجابی لفظیات کے اثرات موجود ہیں۔ اردو ادب پر اگر انگریزی زبان کہ اثرات کو دیکھا جائے تو چونکہ انگریزی دنیا کی دوسری بڑی بولی جانے والی زبان ہے اور ہمارے ہاں اکثر ادیبوں بالخصوص عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی لفظیات کا اثر زیادہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ فنی اور ثقافتی تناظر میں انہی الفاظ کے استعمال کے جائزہ پر یہ تحقیق مشتمل ہے۔

ii۔ بیان مسئلہ (Statement of Problem/ THESIS STATEMENT)

مندرجہ بالا تناظرات میں پاکستانی اردو ادب میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے مصنفین کے یہاں خصوصاً عطاء الحق قاسمی کے ہاں پنجابی اور انگریزی لفظیات کے عمل دخل کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ تاحال اس موضوع پر کوئی کام نہیں ہوا اور اپنی ہمہ جہت اہمیت کی بنا پر اس موضوع کا تقاضا ہے کہ اس پر پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیقی و تنقیدی کام کیا گیا اور ان عوامل پر تفصیلی تحقیق کی گئی جو اس مظہر کے پس پردہ کارفرما ہے۔

iii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق (WORKS ALREADY DONE)

مجوزہ موضوع پر اس حوالے سے جامعاتی سطح کی کوئی تحقیقی کام ابھی تک نہ ہوئی ہے۔ اردو نثر / ادب میں دیہات نگاری کو مختلف زاویوں سے موضوع بنایا گیا ہے۔ جس میں دیہات کی معاشرت، دیہی آبادی کے مسائل، دیہات میں طبقاتی تقسیم اور دیگر پہلوؤں پر کام ہوا ہے لیکن ادب کا لسانی مطالعہ اس کے فنی اور ثقافتی پس منظر میں نہیں کیا گیا۔ جامعاتی سطح پر یہ میری پہلی تحقیقی کاوش ہو گی جس میں عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کو فنی و ثقافتی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔

iv۔ تحقیق کی اہمیت (SIGNIFICANCE OF STUDY)

دہلی اور لکھنؤ کے بعد اردو زبان و ادب کے دبستانوں میں سب سے اہم مرکز لاہور قرار پاتا ہے جو صدیوں سے پنجاب کا مرکز رہا ہے۔ اس لیے تاریخ اردو ادب کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ بیسیویں صدی میں اردو کے زیادہ تر لکھنے والوں کا تعلق پنجاب سے رہا، بالعموم جن کی مادری زبان پنجابی تھی۔ خاص طور پر پاکستان کے بعد اکثر اردو ادیب پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی دور کے ایسے اردو ادیب جن کا تعلق پنجاب سے ہے ان کی تحریروں میں پنجابی زبان کے جلی یا خفی اثرات بالعموم نظر آتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کی تینوں اصناف، کالم، سفر نامہ اور ڈراما کے حوالے سے اردو میں پنجابی الفاظ کے استعمال کا نہ صرف اردو ادب کے مجموعی ثقافتی پس منظر پر روشنی ڈالنے کی یہ کوشش ہو گی بلکہ اردو ادب کے اسلوب کا بھی ایک نیا پہلو دریافت

کرنے کا ایک اقدام ہے۔

v۔ تحدید (DELIMITATION)

اس مقالے کے دائرہ کار میں عطاء الحق قاسمی کی تین نثری جہات کالم نویسی، سفر نامہ اور ڈرامانگاری کو لیا گیا ہے جس میں عطاء الحق قاسمی کی نثر میں استعمال ہونے والے پنجابی الفاظ کے استعمال کا فنی اور ثقافتی تناظر میں جائزہ لیا جائے گا اور ان کے لسانی پیرائے اور اسلوب کو سمجھنے کی کوشش کیگئی ہے۔

vi۔ مقاصد تحقیق (RESEARCH OBJECTIVES)

۱۔ عطاء الحق قاسمی کے کالموں میں پنجابی الفاظ کے استعمال کا فنی اور ثقافتی تناظر میں جائزہ لے کر مجموعی طور پر ان کے نثری اسلوب کا جائزہ لینا۔

۲۔ عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی الفاظ کے استعمال کا فنی اور ثقافتی تناظر میں جائزہ لے کر مجموعی طور پر نثری اسلوب کا جائزہ لینا۔

۳۔ عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی اور انگریزی الفاظ کا فنی اور ثقافتی تناظر میں مجموعی طور جائزہ لے کر نثری اسلوب کی ادبی حیثیت کو دیکھنا۔

vii۔ تحقیقی سوالات (RESEARCH QUESTIONS)

۱۔ فنی اور ثقافتی تناظر میں عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی الفاظ کے استعمال کی نوعیت کیا ہے؟

۲۔ فنی اور ثقافتی تناظر میں عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی الفاظ کی نوعیت کیا ہے۔؟

۳۔ کیا پنجابی اور انگریزی الفاظ کے استعمال نے عطاء الحق قاسمی کی نثری اسلوب کی ادبی حیثیت کو متاثر کیا ہے؟

Viii۔ نظری دائرہ کار(THEORETICAL FRAMEWORK)

☆ عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی لفظیات کی کارفرمائی

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کی اس جہت کو تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں دیکھا گیا ہے اور پنجابی تہذیب وثقافت کی عکاسی کو نمایاں کیا گیا ہے۔

☆ **عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی لفظیات کی کارفرمائی**

مقالے میں قاسمی صاحب کی تحریروں کی انگریزی لفظیات کو انگریزی تہذیب و ثقافت کے تناظر میں سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے اور انگریزی تہذیب کے خدوخال انگریزی لفظیات کے مطالعے سے اجاگر کیے گئے ہیں۔

☆ **عطاء الحق قاسمی کی نثر نگاری کا فنی تناظر**

عطاء الحق قاسمی نثر نگاری کی اس جہت میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کے فنی تناظر کو نمایاں کرتے ہوئے پنجابی اور انگریزی لفظیات کے فنی امور پر بحث کی گئی ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ قاسمی صاحب کی تحریروں میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کے استعمال سے ان کا نثر نگاری کا فن کس حد تک انصاف کر پایا ہے اور اردو نثر میں انھوں نے پنجابی اور انگریزی لفظیات کو کسی فنی خوب صورتی سے استعمال کیا ہے۔

ix۔ پس منظری مطالعہ (LITERATURE RREVIEW)

اس موضوع پر اردو ادب کی کوئی مستقل تصنیف و تالیف موجود نہیں ہے البتہ اردو ادب کے تناظر میں کیے گئے کاموں میں بالواسطہ طور پر ایسے حوالوں کی موجودگی کا امکان ہے جن میں کرداروں کی زبان یا بیانیہ زیر بحث آیا ہے اس حوالے سے کیے گئے کام بھی پس منظری مطالعے میں شامل کیے جاسکتے ہیں جن سے کرداروں کی تلاش میں آسانی ہوگی جس کا پس منظر پنجاب کا ہے یا جن مصنفین کے ہاں انگریزی لفظیات کا استعمال زیادہ ملتا ہے بہر حال مجموعی طور پر یہ ایک نیا کام ہے اور اس سے براہ راست متعلق کوئی کتاب یا تحقیقی مقالہ نہیں ہے۔ البتہ مذکورہ بالا نوعیت کی چند بنیادی تحریریں پس منظری مطالعہ میں پیش نظر رکھی گئی ہیں۔

x۔ تحقیقی طریقہ کار (RESEARCH METHODOLOGY)

تحقیق کا موضوع چونکہ عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کا فنی و ثقافتی تناظر کے مطالعہ پر مشتمل ہے اس لیے زیر نظر تحقیقی مقالے میں میرا طریقہ تحقیق سندی، تاریخی اور دستاویزی ہوگا۔ موضوع کی تکمیل اس حوالے سے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مواد کی جمع آوری اور ترتیب اور عطاء الحق قاسمی کی نثری اصناف کے ناقدانہ جائزے کی متقاضی ہے۔ اس کے علاوہ بھی ضرورت کے کسی تحقیقی طریقہ کار کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ بنیادی ماخذات کی ضمن میں عطاء الحق قاسمی کے ڈراموں، کالموں اور سفرناموں کو شامل تحقیق کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے سرکاری اور نجی کتب خانوں کے علاوہ رسائل کے مدیران اور ناشرین کو

بھی مدعو کیا جائے گا۔ انٹرویوز، تاریخی دستاویزات، انسائیکلوپیڈیا، لغات، انٹرنیٹ، الیکٹرونک میڈیا، تحقیقی رسائل و جرائد، اخبارات، خودنوشت وغیرہ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

ب۔ عطاءالحق قاسمی۔۔۔ تعارف اور اُصولی مباحث

سوانح اور شخصیت:

قاسمی خاندان کے جدامجد عرب سے ہجرت کر کے آگرہ (ہندوستان) میں مقیم ہوئے اور پھر یہاں سے کشمیر کی طرف کوچ کر گئے۔ اس خاندان کے کئی افراد آٹھ صدیوں تک کشمیر میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے کئی بزرگ قاضی القضاۃ کے منصب جلیلہ پر متمکن ہوئے۔ عدل و انصاف کا بول بالا کرتے رہے۔ ان کے فیصلے قرآن و سنت کی روشنی میں طے پاتے اور جس پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ قاسمی خاندان کی عزت و تکریم میں بے پناہ اضافہ ہوا اور لوگوں میں ان کا احترام اور عقیدت بڑھنے لگی۔ آٹھ صدیوں کے بعد یہ خاندان کشمیر سے ہجرت کر کے امرتسر آکر آباد ہو گیا۔ امرتسر میں ڈیڑھ سو سال مقیم رہنے کے بعد وزیر آباد میں آکر آباد ہوئے۔ اسی قاسمی خاندان میں عطاالحق قاسمی نے جنم لیا اس ضمن میں سکندر حیات میکن لکھتے ہیں:

> "عطاء الحق قاسمی یکم فروری ۱۹۴۳ء کو امرتسر میں پیدا ہوئے پھر چار سال بعد ۱۹۴۷ء کو اپنے والدین کے ساتھ پاکستان ہجرت کر آئے اور وزیر آباد میں مقیم ہوئے۔ والد کا نام مولانا بہاء الحق قاسمی تھا جو وزیر آباد کے ایک سکول میں اسلامیات کے استاد تھے۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنی ابتدائی تعلیم وزیر آباد ہی سے حاصل کی۔ عطاء الحق قاسمی کے والد بڑے دین دار آدمی تھے انھوں نے عطا الحق قاسمی کی پرورش پر خصوصی توجہ دی۔" (۱)

عطاالحق قاسمی اردو کے ممتاز کالم نگار، مزاح نگار، ڈرامہ نگار، شاعر، سفرنامہ نگار، محقق اور ماہر تعلیم ہیں۔ عطاالحق قاسمی ستر کی دہائی میں اردو ادب میں آئے اور انھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے آسمان ادب پر ایک منفرد درخشاں ستارے کی طرح اپنی چمک دمک دکھائی۔ جس سے ہر طرف روشنی ہی روشنی پھیلنے لگی۔ عطاء الحق قاسمی نے مختلف سمتوں میں سفر کرتے ہوئے اپنی خداداد صلاحیتوں سے ادب کے میدان میں مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے شہرت کی ایسی بلندیاں عطا کیں جو ہر کسی کے

نصیب میں نہیں ہوتیں۔ عرب سے آنے والے اِس خاندان کا شجرہ نسب حضرت ابو بکر صدیقؓ سے مل جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے والد دینی و مذہبی سکالر تھے اس لیے ان کے والد کی تربیت ایک خاص قسم کے مذہبی و دینی ماحول میں ہوئی۔ عطاء الحق قاسمی کا بچپن سخت نگرانی میں بسر ہوا۔ عطاء الحق قاسمی کی شخصیت کی پروان میں ان کے والد بہاء الحق قاسمی کے مذہبی و دینی نظریات و افکار کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اگرچہ عطاء الحق قاسمی جدید علوم کی طرف مائل ہو چکے تھے لیکن پھر بھی ان کی شخصیت میں اپنے والد گرامی کی جھلک ضرور دکھائی دینے لگی تھی۔ دیگر بچوں کی طرح انھیں بھی بچپن میں کھیل، تماشوں اور شرارتوں سے دلچسپی رہی۔ وہ بچپن میں پتنگ بازی، بنٹے اور اخروٹ کھیلنے کا شوق رہا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے انہیں کئی بار والد کی طرف سے پٹائی اور سزا بھی بھگتنا پڑتی رہی۔ کبھی کبھار اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ لُڈو بھی کھیلتے رہے والد کی خواہش تھی کہ وہ فٹ بال کھیلیں یا پھر اکھاڑے میں جا کر کثرت کریں یا پھر کشتیاں دیکھیں۔ گھر میں لڈو کھیلنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اپنی شرارتوں کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں:

> "وزیر آباد سے کئی میل کے فاصلے پر ایک مزار تھا جہاں بیریوں کے کئی ایک درخت تھے، ایک دن ہم سب دوستوں نے وہاں جا کر بیر کھانے کا پروگرام بنایا اور اپنے اپنے ریڑھے گھماتے پیدل چل پڑے۔ سڑک پر بسیں آ جا رہی تھیں ہمیں شرارت سوجھی کہ بسوں کو روڑے مارے جائیں چنانچہ ہم سب نے ہاتھوں میں پتھر اٹھا لیے جونہی بس قریب آئی ہم نے نشانہ تاک کر بس کو پتھر دے مارے ان میں سے کئی مسافروں کو لگے اور بس کے شیشے بھی ٹوٹ گئے۔ ڈرائیور نے بس کو بریک لگا کر روک لیا ہم یہ دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے مگر بس کے مسافروں نے ہمیں جلد ہی آلیا اور پکڑ کر ایک ایک کی پٹائی شروع کر دی۔ ایک مسافر نے مجھے پہچان لیا اس نے یہ کہہ کر مجھے مارنے سے بچا لیا کہ میں اسے جانتا ہوں یہ ہمارے مولوی صاحب کا بیٹا ہے۔ میں مولوی صاحب سے اس کی شکایت کروں گا۔ لہٰذا میں وہاں تو مار سے بچ گیا لیکن جب ابا جی کو اس واقعے کا علم ہوا تو انھوں نے اس قدر مارا کہ اس کے مقابلے میں دوسرے بچوں کو مسافروں کے ہاتھوں پڑنے والی پٹائی کی حیثیت کچھ نہ رہی۔"(۲)

مولانا مفتی محمد حسن جو جامعہ اشرفیہ کے بانی تھے اور مولانا بہاء الحق قاسمی کے استاد بھی تھے انھوں نے مولانا کو لاہور آنے کا مشورہ دیا کہ لاہور ماڈل ٹاؤن میں آپ کی اشد ضرورت ہے۔ مولانا بہاء الحق قاسمی وزیر آباد کو خیر آباد کہہ کر لاہور منتقل ہوگئے۔ اور ماڈل ٹاؤن کی جامع مسجد میں امامت اور خطابت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ عطا الحق قاسمی نے ابتدائی تعلیم پرائمری تک وزیر آباد سے حاصل کی۔ تعلیم کا بقیہ سلسلہ لاہور آکر شروع کیا اس مقصد کے لیے ماڈل ہائی سکول ماڈل ٹاؤن میں داخلہ لیا اور میٹرک کا امتحان اسی سکول سے پاس کیا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ان کے والد کی خواہش تھی کہ وہ جامعہ اشرفیہ میں داخل ہوں اور دینی و مذہبی تعلیم حاصل کریں۔ جب کہ عطاء الحق قاسمی روشن خیال اور اس روایتی تعلیمی سلسلہ سے دور بھاگ جانا چاہتے تھے۔ ان کے والد دنیاوی تعلیم کے زیادہ حق میں نہ تھے۔ لہٰذا میٹرک پاس کرنے کے فوراً بعد انھوں نے اعلان کر دیا کہ دنیاوی تعلیم جس قدر ہونا تھی ہو چکی۔ ان کا خیال تھا کہ ماڈل ٹاؤن کے ماڈرن لڑکوں کے ساتھ رہ رہ کر ان کے بیٹے کی عادتیں قطعی بگڑ چکی ہیں اور اب وہ اسے جامعہ اشرفیہ میں داخل کرانا چاہتے تھے تاکہ وہاں رہ کر دینی تعلیم حاصل کر سکے۔ موصوف اپنے بیٹے کو اوّل و آخر ایک باعمل صوفی درویش کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر اشفاق ورک لکھتے ہیں:

> "میٹرک کے امتحان کے بعد ایک کھٹائیہ آن پڑی کہ والد صاحب نے ان کی صحبت اور اپنا دینی پس منظر دیکھ کر انھیں روایتی دینی تعلیم کی خاطر جامعہ اشرفیہ میں داخل کروانے کا عزم صمیم کر لیا۔ ایسا کرتے ہوئے اپنے بعد جامع مسجد ماڈل ٹاون کی امامت اور خطابت کا معاملہ بھی یقیناً ان کے ذہن میں تھا۔ دوسری جانب عطاء الحق قاسمی کو اونچے پاجاموں، بڑھی ہوئی داڑھیوں اور منڈے ہوئے سروں والے روایتی دینی تصور سے چڑ تھی۔"(۳)

مولانا بہاء الحق قاسمی کے صاحبزادے عطاء الحق قاسمی مذہبی اور دینی تعلیم کے بجائے دنیاوی تعلیم کی طرف توجہ دے رہے تھے ان کا خیال تھا کہ مولوی نہایت ظالم اور سفاک ہوتے ہیں جو الٹے استرے سے سر منڈوائے ٹخنوں سے اونچی شلواریں کروا دیتے ہیں وہ ان سب چیزوں سے بڑے خائف تھے۔ اس لیے وہ دینی و مذہبی تعلیم کے بجائے دنیاوی تعلیم حاصل کرنے پر زور دیتے رہے انھوں نے اپنے والدین کو بھی کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا کہ بی اے کرنے کے بعد جامعہ اشرفیہ کی تعلیم بھی حاصل کر لوں گا۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم اس حوالے سے رقم طراز ہیں:

"ان کے والد ایک مذہبی عالم تھے اس لیے ان کے والد اپنے مذہبی رجحان کے باعث عطا الحق قاسمی کو دینی تعلیم کے حصول کے لیے مسجد و مدرسہ بھی بھیجنا چاہتے تھے لیکن وہ ایم اے تک اپنے والد کو ٹالتے رہے کیوں کہ ان کا اپنا رجحان جدید تعلیم کی طرف تھا۔ لہٰذا انھوں نے ایم اے او کالج لاہور سے ایف اے، اور بی اے کیا، اور ینٹل کالج لاہور سے ایم اے اردو کیا۔ یہیں پر وہ یونی ورسٹی میگزین "محور" کے ایڈیٹر بھی رہے، اخبارات میں لکھنے لکھانے کا سلسلہ پہلے ہی سے شروع کر چکے تھے۔ ان کے استادوں میں سید وقار عظیم، سجاد باقر رضوی، وحید قریشی، سید عبد اللہ، اور خواجہ زکریا جیسی معروف شخصیات شامل تھیں" (۴)

عطاء الحق قاسمی میٹرک کے بعد ایم اے او کالج چلے آئے جہاں سے انھوں نے ایف، اے۔ پھر بی اے کے امتحانات پاس کیے۔ بی اے کرنے کے بعد ان کے والد گرامی نے ایک بار پھر وہی مسئلہ دہرایا کہ اب جامعہ اشرفیہ میں دینی تعلیم کے لیے چلے جاؤ مگر عطاء الحق قاسمی ہر بار اپنے والد کو ٹالتے رہے مختلف قسم کے بہانے اور دلائل سے ان کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کی والدہ ان کے دلائل کے آگے چپ ہو گئیں اور انھوں نے ان کے والد کو بھی سمجھایا کہ ایک بار بیٹے کو ایم اے کر لینے دو پھر جو جی چاہے کروا لینا۔ یوں ایک بار پھر بہاء الحق قاسمی کو ٹال دیا گیا اور عطاء الحق قاسمی ایم اے اردو کی غرض سے اورینٹل کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ انھیں لکھنے کا شوق کالج کے زمانہ سے ہی تھا یہاں پہنچ کے اس شوق کو مزید مہمیز لگی۔ اور وہ یونیورٹی میگزین "محور" کے مدیر مقرر ہو گئے۔

کالج کے زمانہ میں ہجو لکھنے کا آغاز کیا اور اسی زمانہ میں کالم وغیرہ بھی لکھتے رہے۔ ایم اے کرنے کے بعد انھیں روزگار کی تلاش تھی۔ کئی جگہوں پر ملازمت کے لیے درخواستیں بھی دیں۔ جب ان کے بڑے بھائی کو اس بات کا علم ہوا کہ چھوٹے بھائی نے ایم اے اردو کر لیا ہے اور اب ملازمت کے حصول کے لیے سرگرداں ہے تو انھوں نے عطاء کو حیدر آباد بلا لیا اور ایک بیکری کھول دی دو تین ملازم رکھ دیئے جو بیکری کا کام بھی کرتے اور سیلز مین بھی تھے۔ موصوف کو کاؤنٹر پر حساب کتاب کے لیے بیٹھا دیا گیا۔ عطاء الحق قاسمی کے مزاج کے خلاف کام تھا لیکن کرتے رہے کام چل نکلا اور ایک روز کسی گاہک سے تو تو میں میں ہو گئی جس پر عطاء نے اسے خوب مارا اور اسے دھمکیاں بھی دیں کہ آئندہ ادھر نظر نہ آئے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بیکری چھوڑ کر لاہور آ گئے اور ملازمت کی تلاش میں اِدھر اُدھر درخواستیں دینے لگے۔ اسی اثناء ماڈل ٹاؤن کے

دوست مسعود اللہ خان کے بہنوئی حبیب اللہ ککر کے ایک دوست احمد بشیر کی وساطت سے مجید نظامی سے ملاقات ہوئی۔ انھیں یونیورسٹی میگزین "محور" کا بھی حوالہ دیا۔ نوائے وقت کے سٹوڈنٹ ایڈیشن میں عطاء پہلے ہی لکھ رہے تھے۔ مجید نظامی نے انہیں ملازمت پر رکھ لیا اور پھر جب "ندائے ملت" کا اجراء ہوا تو عطاء الحق قاسمی کو سب ایڈیٹر کے عہدہ پر ترقی دے دی۔ عطاء الحق قاسمی بتاتے ہیں:

> "مسعود کے بہنوئی حبیب اللہ ککرو کے ایک دوست احمد بشیر اے پی پی کے جنرل مینجر تھے۔ اسی دوران مسعود نے ککرو صاحب سے بات کی انھوں نے احمد بشیر صاحب سے کہا احمد بشیر مجھے مجید نظامی صاحب کے پاس لے گئے۔ میں نوائے وقت کے سٹوڈنٹس ایڈیشن کے لیے کام کرتا رہا۔ یہ حوالہ بھی دیا "محور" کی ادارت کا ذکر بھی کیا چنانچہ انھوں نے مجھے بطور اپرنٹس رکھ لیا۔ جس کے بعد مجھے سب ایڈیٹر بننا تھا۔ اس دوران مجید نظامی صاحب نے اپنا روزنامہ "ندائے ملت" نکالا اور میں وہاں چلا گیا جہاں میں بطور سب ایڈیٹر کام کرنے لگا۔"(۵)

احمد بشیر کی وساطت سے ملنے والی "نوائے وقت" کی ملازمت عطاء الحق قاسمی کی زندگی کا ایک بہت بڑا موڑ ثابت ہوئی۔ اسی ملازمت نے انھیں لکھنے پر اکسایا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ مستعدی سے لکھنے لگے۔ ان کے کالم لوگ پسند کرنے لگے۔

عطاء الحق قاسمی ایک مزاح نگار ہیں ان کے مزاح میں وسعت خیال، اعتدال پسندی، طنز، ظرافت اور طبیعت کا کھلا پن نمایاں ہے۔ دیہی زندگی کی ترجمانی اس انداز سے کرتے ہیں کہ اس میں پنجابی ثقافت نمایاں ابھرتی ہے۔ ان کے کالم صحافتی دنیا میں ادبیت کا پیرہن رکھتے ہیں۔ ان کے مشاہدات و تجربات ان کی کالم نویسی کی روح تصور کیے جاتے ہیں۔ بحیثیت مزاح نگار وہ زندگی کی بے ضبطی، بے ترتیبی، اور حماقت انگیزی کو جس انداز میں نظم وضبط اور سلیقہ شعاری میں ڈھالتے ہیں، وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ان کی مزاح نویسی کا منفرد پہلو یہ ہے کہ وہ لفظوں کو مقصدیت کی کشتی میں سوار کرکے منزل مقصود تک پہنچتے ہوئے ہر نظارے کو حقیقتوں کے چپو سے چلاتے ہیں۔ قاری ان کے ہمراہ کبھی مسکراتا ہے تو کبھی ذخیرہ الفاظ اکٹھا کرنے لگتا ہے۔ بسا اوقات قاری کو نئی نئی سی معلومات سے آگاہی ملتی ہے۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مزاح کی پہلی ہی پرت کے نیچے زندگی کی سادگی پر انسانی تصنع کاری اور بناوٹوں سے پیدا شدہ تضادات ہمیں کھلے انداز میں نظر آجاتے

ہیں۔ اس سے ان کی فن کاری اور شعور کا اندازہ ہوتا ہے کیوں کہ وہ انھیں تضادات کو قابل برداشت بھی بنا دیتے ہیں اور آگہی وادراک کا ایک نیا دریچہ بھی روشن کر دیتے ہیں۔ اس عمل کے ضمن میں حقیقت وصداقت کے اظہار کے لیے وہ ان تمام فنی کفائیوں سے کام لے لیتے ہیں یہی عطا الحق قاسمی کے فن کالم نگاری کا کمال ہے۔

ایک روز عطاء الحق قاسمی ماہر تعلیم کرامت حسین بخاری کے انٹرویو کے لیے ایم اے او کالج پہنچے تو کرامت حسین بخاری کو دوران انٹرویو جب معلوم ہوا کہ عطاء الحق قاسمی مولانا بہاء الحق قاسمی کے صاحبزادے ہیں تو انھوں نے اپنی پرانی رفاقتوں کا ذکر کیا اور انھیں ایم اے او کالج میں بطور لیکچرار کی دعوت دی۔ ان دنوں عطاء الحق قاسمی امریکہ جارہے تھے۔ یہ کرامت حسین بخاری نے وعدہ لیا کہ امریکہ واپسی پر آپ نے یہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرنا ہے۔۱۹۶۹ء کی بات ہے جب قاسمی امریکہ چلے گئے۔ امریکہ میں وہ سینٹ لوئیس گئے جہاں ان کے دیگر دوست بھی رہ رہے تھے۔ امریکہ میں بلڈ ٹیکنیشن کی ملازمت کی۔ پھر ایک انڈوں کی فیکٹری میں بطور مزدور کام کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک ریستوران میں نائٹ مینجر کی ملازمت بھی کی۔ پھر کسی اور ریستوران میں ایگزیکٹو کی نوکری مل گئی۔ یہاں وطن واپسی تک کام کرتے رہے۔

ایسا ہی ہوا امریکہ سے واپسی پر عطاء الحق قاسمی ایم اے او کالج بطور لیکچرار مقرر ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے "نوائے وقت" میں کالم نگاری کا آغاز کیا۔ اب کے ان کے کالموں میں ایک تبدیلی رونما ہوئی کیونکہ اب کے ان کا وژن وسیع ہو چکا تھا وہ تجربات ومشاہدات کو بروئے کار لا رہے تھے۔ اشیاء کو دیکھنے اور پرکھنے کا انداز تبدیل ہو چکا تھا اس لیے ان کے کالموں میں بھی اس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ امریکہ سے واپسی ان کی شادی ۱۰ اپریل ۱۹۷۲ کو کر دی گئی ان کی شادی روبی شہناز سے ہو گئی۔ روبی شہناز ایک پڑھی لکھی سلیقہ شعار خاتون تھیں جنھوں نے ایم۔ ایس۔ ای کیمسٹری کیا ہوا تھا شادی کے بعد ہوم اکنامکس کالج لاہور میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عطاء الحق قاسمی کو تین بیٹوں سے سرفراز کیا۔ اس ضمن میں فوزیہ چودھری لکھتی ہیں:

> "شادی کے دوسرے سال ۲۴ فروری ۱۹۷۴ء کو ان کے ہاں پہلے بچے کی ولادت ہوئی۔ پیرزادہ محمد یاسر قاسمی ان کے تین سال بعد ۴ جنوری ۱۹۷۷ء کو پیرزادہ

محمد عمر قاسمی پیدا ہوئے اور ۲۸ اگست ۱۹۸۰ء کو ان کے ہاں تیسرے بیٹے پیرزادہ علی عثمان قاسمی کی ولادت ہوئی۔"[۶]

عطاء الحق قاسمی کی پہلی کتاب "روزن دیوار سے" مطبوعات لاہور نے ۱۹۸۷ء میں زیور طباعت سے آراستہ کی۔ اس کتاب میں ۱۹۷۲ء سے لے کر ۱۹۷۷ء تک تمام کالم موجود ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کتاب کو آدم جی ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ عطاء الحق قاسمی کی دوسری کتاب "عطایئے" ہے یہ کتاب ۱۹۸۲ کو پہلی مرتبہ شائع ہوئی۔ یہ کتاب چوبیس کالم اور سولہ خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو غالب پبلشر لاہور نے شائع کی۔ ان کی تیسری کتاب "خندِ مکرر ۱۹۸۳ء میں طبع ہوئی۔ عطاء الحق قاسمی کے کالموں کا چوتھا مجموعہ "جرم ظریفی" کے نام سے ۱۹۸۸ء میں سنگ میل لاہور نے شائع کیا۔ ۱۹۹۱ء میں مقبول اکیڈمی لاہور نے ان کی دو کالموں کے مجموعے "تجاہل کالمانہ" اور "سرگوشیاں" شائع کیے۔ ۱۹۹۳ء میں دو مزید کالموں کے مجموعے سامنے آئے جن میں "حبس معمول" سنگ میل لاہور نے شائع کیا جب کہ دوسرا مجموعہ "کالم والم" مقبول اکادمی لاہور نے زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ سنگ میل نے ۱۹۹۳ء میں "کالم تمام" کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی۔ جس میں "روزن دیوار سے"، "عطایئے"، "خند مکرر"، "جرم ظریفی"، "تجاہل کالمانہ" اور "شر گوشیاں" شامل ہیں۔ کالموں کے دو اور مجموعے "ہنسنا رونا منع ہے" اور "۱۲ سنگھے" دعا پبلی کیشنز لاہور سے ۲۰۰۰ء میں شائع کیے۔

عطا الحق قاسمی نے ایک علمی و ادبی رسالہ "معاصر" کے نام سے اکتوبر ۱۹۷۹ء کو جاری کیا لیکن دو پرچوں کی اشاعت کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا پھر ۱۹۹۴ء کو ایک نئے عزم کے ساتھ اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری کیا جو تاحال جاری و ساری ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے دنیا کے مختلف ممالک کے اسفار کیے ان میں یورپ، امریکہ، انگلینڈ، چین، انڈونیشیا، سنگاپور، آسٹریلیا، اسپین، ترکی، افغانستان، ایران، بھارت اور خلیج کے ممالک میں قطر، مسقط، اور سعودی عرب شامل ہیں انھوں نے ان ممالک کی نہ صرف سیر کی بلکہ وہاں کے تجربات و مشاہدات نے ان کے وژن کو مزید وسیع کیا۔

مختلف ممالک کی سیاحت نے عطاء الحق قاسمی کے تجربات و مشاہدات، احساسات، سوچ اور فکر پر بڑے مثبت اثرات مرتب کیے اس کا اثر نمایاں طور پر ان کی تحریروں میں دکھائی دینے لگا۔ انھوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کے دوران وہاں کی تہذیب، تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست حتیٰ کہ مذہبی رویوں تک کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ ان کے اچھے پہلوؤں کا برملا اعتراف اور قابل اعتراض پہلوؤں کی بھرپور مذمت کی ہے

یہاں تک کہ اگر انہیں کسی غیر اسلامی معاشرے میں اسلام کے مثالی اور فلاحی معاشرے کی کوئی جھلک بھی نظر آئی تو انھوں نے اپنی تحریر و تقریر میں اس کا کھل کر ذکر کیا ہے۔

عطاء الحق قاسمی آزادی اظہار کے قائل ہیں انھوں نے ہمیشہ سچ اور حق کا راستہ اپنایا۔ مارشل لاء کے دور میں بھی ان کا رویہ یہی رہا انھوں نے مارشل لاء حکومت کے خلاف کالم بھی لکھے اور اشعار میں بھی اس کا اظہار کیا جس کی پاداش میں انہیں کئی بار دھمکیاں اور سخت سزاؤں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ انھوں نے ایوب خان کا دور حکومت ہو یا پھر ذوالفقار علی بھٹو کا دور حکومت ہو انہیں مختلف قسم کی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بھٹو دور میں انھوں نے اپنے کالم کا انداز خاصا علامتی رکھا۔ دل کی ہر بات کو علامتی انداز میں عوام الناس تک پہنچا دیتے۔ عطاء الحق قاسمی کے اس دور کے کالموں کے حوالے سے ڈاکٹر اشفاق ورک لکھتے ہیں:

> "فوجی اور جمہوری آمروں کے خلاف ان کا مناقشہ ربع صدی سے زائد عرصے تک جاری رہا ہماری قوم کی ایک مستقل بد قسمتییہ بھی رہی ہے کہ اس کی آزادی کے شجرِ سایہ دار کے اوپر فوجی آکاس بیل مسلط رہی اور اس کی جڑوں کو کھوکھلا کرنے میں نام نہاد جمہوریت کی سنڈیاں سرگرم عمل رہیں۔ ہمارے اس طناز قلم کار کو روز اول ہی سے جمہوری مزاج راس آیا ہے اور کسی بھی حکمران کا آمرانہ رویہ اس کے قلم کو آگ اگلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔"(۷)

عطاء الحق قاسمی نے جنرل ضیاء الحق کے خلاف بھی کالم لکھے حتیٰ کہ انھوں نے نواز شریف حکومت کے خلاف بھی کالم لکھے اور حق کی آواز کو بلند کیا۔ وہ نظریاتی طور پر مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ وہ آزای اظہار کے علمبردار ہیں انھوں نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے شہرت اور کامیابیوں کی کئی منزلیں طے کیں۔ میاں نواز شریف نے ان کی صلاحیتوں سے متاثر ہو کر انھیں جون ۱۹۹۷ء میں ناروے بطور پاکستانی سفیر بھیجا۔ انھوں نے دونوں ممالک کے سفارتی تعلقات کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کی۔ ان میں دونوں ممالک کے درمیان ایک کلچرل یادداشت پر سمجھوتہ ہوا جس کے باعث دوطرفہ ثقافتی وفود کا تبادلہ اور ثقافتی سطح پر ایک دوسرے سے تعاون کییقین دہانی شامل ہے۔ کئی سرمایہ کار ناروے سے پاکستان تشریف لائے اور دیکھا کہ وہ کن منصوبہ جات میں سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔ اس حوالے سے فوزیہ چودھری نے لکھا ہے:

> "ناروے سے سرمایہ کاروں کا ایک وفد بھی پاکستان آیا تھا جس نے اس بات کا جائزہ لیا کہ پاکستان میں کس طرح اور کس کس سطح کی سرمایہ کاری کی جاسکتی ہے

اس سلسلے میں ناروے میں پاکستان سفارت خانے نے لارڈ میئر اوسلو کو دعوت دی کہ وہ پاکستان آئیں اور خاص طور پر گجرات شہر کا دورہ کریں تا کہ لاہور، اوسلو اور گجرات کو ٹوئن سٹی قرار دینے کے سلسلے میں پیش رفت کی جاسکے۔ ان کے عہد سفارت میں ایک سال کے اندر اندر بغیر کسی کمرشل اتاشی کے پاکستان کے ایکسپورٹ میں تیس فیصد اضافہ ہو جو سفارتی سطح پر بڑی کامیابی گردانی جا سکتی ہے۔"(۸)

ناروے میں بطور سفیر کی حیثیت سے انھوں نے وہاں "پرائم ٹیلی ویژن" کی نشریات کا آغاز کروایا پھر یہ نشریات آہستہ آہستہ پورے یورپ میں پی ٹی وی کے پروگرامز اور خبریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ پی ٹی وی کیپورپ میں سخت ضرورت محسوس کی جارہی تھی اس ضرورت کو عطاالحق قاسمی نے پورا کروایا۔ جولائی ۱۹۹۹ء میں عطاء الحق قاسمی اپنی دو سالہ مدت پوری کر چکے تو انہیں تھائی لینڈ میں سفیر بنا کر بھیجا دیا گیا ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو نواز حکومت ختم ہو گئی تو آپ بھی سفارتی ذمہ داریاں چھوڑ کر ۲۸ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو واپس پاکستان آ گئے۔ وطن واپسی پر انہیں OSD کے عہدہ پر فائز کر دیا گیا۔ انھوں نے درس و تدریس کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا اور ۲۰۰۲ء میں ریٹائرمنٹ لی۔ اب وہ تخلیقی کام پہلے سے بڑھ کر کرنے لگے۔ اسی اثناء پنجاب حکومت نے انہیں الحمرا آرٹس کونسل کا چیئرمین مقرر کر دیا انھوں نے یہاں بھی اپنی ذمہ داریاں بہت احسن انداز میں نبھائیں۔ اس کے بعد عطاء الحق قاسمی کو حکومت پاکستان نے پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کا چیئرمین مقرر کر دیا وہاں بھی آپ نے اپنی ذمہ داریاں نبھاتے ہوئے۔ پی ٹی وی کے لیے بہت سے اچھے اقدامات کیے۔

عطاء الحق قاسمی کو علمی وادبی حوالوں سے کئی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں ان کو ملک کا سب سے بڑا ایوارڈ پرائیڈ آف پرفارمنس دیا گیا جب کہ اس سے قبل ان کو ۱۹۸۲ میں اے پی این ایس ایوارڈ برائے بہترین کالم نگار سے بھی نوازا گیا یہ ایوارڈ آپ کو دومرتبہ ملا دوسری بار ۱۹۸۹ء میں ملا۔ ویسے تو کسی بھی شاعر، ادیب کے لیے سب سے بڑا ایوارڈ اس کے قارئین کی محبت اور عقیدت ہوتی ہے جو برس ہا برس قلم کار کو دلوں میں زندہ رکھتا ہے۔ اس کے باوجود مختلف حکومتی و نجی اداروں، تنظیموں کی طرف سے اہل قلم کی خدمات کے باقاعدہ اعتراف کا سلسلہ بھی جاری وساری ہے عطاء الحق قاسمی کے ایوارڈز کے حوالے سے اشفاق ورک نے لکھا ہے:

"عطاء الحق قاسمی کی ادبی وصحافتی خدمات پر انہیں درج ذیل اعزازات سے سرفراز کیا گیا۔

۱۹۷۸ء...... پہلی کتاب "روزن دیوار سے" پر آدم جی ادبی ایورڈ۔

۱۹۸۲ء...... اے پی این ایس کی طرف سے بہترین کالم نگار کا ایوارڈ۔

۱۹۸۹ء...... سات سال بعد اسی ایورڈ سے دوبارہ نوازا گیا۔

۱۹۹۲ء...... مجموعی ادبی خدمات پر ملک کا سب سے بڑا ایوارڈ پرائڈ آف پرفارمنس دیا گیا۔

۱۹۹۳ء...... میں ایشین آرٹ سوسائٹی انگلینڈ نے ان کی پچاسویں سالگرہ پر جشن عطاء الحق قاسمی کا اہتمام کر کے خصوصی اعزاز بخشا۔

۱۹۹۹ء...... میں حکومت پاکستان کی طرف سے ستارہ امتیاز کا حق دار قرار دیا گیا۔"(۹)

۲۰۱۹ء میں ان کے لیے دوبئی جشن عطاء الحق قاسمی کا اہتمام کیا گیا اس کو منعقد کروانے میں قمر ریاض اور سلیمان جاذب پیش پیش تھے۔ قمر ریاض نے ان کے نام پر ایوارڈ کا سلسلہ بھی جاری کیا ہے جو ۶ اپریل ۲۰۱۹ء لاہور میں منعقد کیا گیا اس ایوارڈ میں شاعری، صحافت، فکشن اور لائف چیومنٹ ایوارڈ رکھے گئے ان ایوارڈز کے ساتھ ایک ایک لاکھ روپے کی رقم بھی دی گئی۔ یہ بھی ان کے لیے بہت بڑے اعزاز سے کم نہیں کہ کسی زندہ شخصیت پر اس طرح کے ایوارڈز اجراء دیکھنے میں نہیں آیا۔

عطاء الحق قاسمی کے فکر و فن پر کئی ایک کتابیں بھی لکھی گئی ہیں جن میں پہلی کتاب "یہ نصف صدی کا قصہ ہے" یہ ایک طویل مصاحبہ ہے جو ازہر منیر نے کیا اور اسے تخلیقات لاہور نے مارچ ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔ دوسری کتاب منصور آفاق کی ہے جس کا نام ہے "میں، وہ اور عطاء الحق قاسمی"۔ عباس تابش نے "بازیچہ اعمال" کے نام سے نثری تحریروں کا انتخاب کیا یہ کتاب اکتوبر ۱۹۹۴ء میں الحمد پبلی کیشنز لاہور نے شائع کی۔ قمر ریاض کی کتاب ata ul Haqqasmi pictorial biography کے نام سے شائع ہوئی۔

عطا الحق قاسمی کالم نگاری میں اپنی گزشتہ روایت کے ہی نمائندہ ہیں لیکن ان کی انفرادی خصوصیات نے اس سلسلہ میں کچھ ایسی جدتوں کو ابھارا ہے جس نے کالم نگاری میں اسلوب، تکنیک اور موضوع کے حوالے سے جدید کالم نگاری کی بنیادیں فراہم کی ہیں۔ عطا الحق قاسمی کو اس ضمن میں یہ اضافہ ہی ان کو اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔

ج۔ اردو پر پنجابی کے اثرات:

پنجابی ثقافت کیا ہے؟

پنجاب برصغیر پاک وہند کا ایک اہم خطہ ہے۔ اس خطے کی اپنی تاریخی، تہذیبی، سماجی اور ثقافتی اقدار ہیں جو اسے دوسرے خطوں سے ممتاز اور منفرد کرتی ہیں۔ پنجاب کی تاریخ خاصی پرانی ہونے کے ساتھ ساتھ شاندار روایات کی حامل بھی ہے۔ اس خطے کی سماجی اور ثقافتی روایات اس کی اپنی ہیں جو مختلف اقوام کے میل جول سے پروان چڑھی ہیں۔ کسی بھی قوم کی ثقافت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسی اقدار پر قائم ہو جس کا تعلق عقیدہ، فکر، طرزِ زندگی اور زندگی کے مقصد کے تعین کے ساتھ ہو، اس طرح ثقافت روحانی، نفسیاتی اور معاشرتی اثاثہ قرار پاتی ہے جو تاریخ کا ایک ایسا مرکز و محور ہوتی ہے جس سے کسی بھی قوم کی تاریخ کے مختلف پہلو اور گوشے جنم لے رہے ہوتے ہیں۔ تاہم اگر ثقافت مثبت معاشرتی اقدار کو جنم نہ دے یا وہ اپنی اساس کے لحاظ سے مستقل اور آفاقی اُصولوں سے محروم ہو تو ایسی ثقافت کھوکھلی اور اُدھوری ثقافت قرار پائے گی۔ جو کوئی بھی بڑی تہذیب تشکیل دینے میں ایک فعال کردار ادا نہیں کر سکتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ ثقافت معاشرے میں ایسی بنیادی اقدار کی صحیح اور موثر تعبیر اور ترجمانی کرے جو اقدار معاشرے کے مثبت اور اہم خدوخال کا تعین کریں اور معاشرے کی ترقی اور نشوونما کی حرکت کو منظم کریں اور اس کے لیے ایک جامع فکر کا تعین کریں۔ کیوں کہ ثقافت کسی بھی معاشرے کے اجتماعی طرزِ عمل کا مظہر ہوتی ہے۔ سماج کے مختلف عناصر ثقافت کے ذریعے ہی اپنے وجود کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ثقافت ہی ہوتی ہے جو اس بارے میں رہنمائی کرتی ہے کہ ان عناصر میں کیا مشابہتیں اور اختلافات پائے جاتے ہیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ ثقافت کی تشکیل ٹھوس بنیادوں پر ہوئی ہو۔ ثقافتی اقدار ایسی ہوں جو سماج سے ہم آہنگ ہوں اور سماج میں مثبت رویوں اور مثبت اقدار کے فروغ کا سبب بن سکے۔ ثقافتی اقدار سماج کی آنے والی نسلوں کو اپنی اصل سے جوڑنے کا کام بھی سرانجام دیتی ہیں۔ اگر ثقافتی اقدار کھوکھلی ہوں اور ان پر مقامی ثقافت کی بجائے غیر ملکی یا کسی دوسری قوم کی ثقافت کا رنگ نمایاں ہو تو اس ثقافت کے تحت پروان چڑھنے والی نئی نسل اپنے اسلاف سے بے بہرہ ہوتی چلی جاتی ہے جس کے نتیجے میں ان کا اپنے ماضی سے رشتہ منقطع ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ثقافت کو اس کے اصلی روپ میں برقرار رکھا جائے اور مقامی اقدار کو ثقافت کا حصہ بنایا جائے۔

اگر ثقافت مذکورہ صفات کی حامل بنیادی اقدار سے خالی ہے تو اس کے اثرات معاشرے پر ہوں گے۔ نتیجتاً معاشرہ مختلف قسم کے بحرانوں کا شکار ہو جائے گا اور اس میں کسی بھی قسم کا تحرک پیدا نہیں ہو سکے گا۔ بالآخر مختلف انواع اور مسائل کے معاشرے میں در آنے سے معاشرہ افتراق اور انتشار کا شکار ہو جائے گا۔

اس تناظر میں جب ہم پنجابی ثقافت کا جائزہ لیتے ہیں تو پنجاب کی ثقافت کے کئی روپ سامنے آتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پنجابی ثقافت میں وہ تمام روایات، اقدار اور سماجی عناصر پائے جاتے ہیں جو کسی بھی ثقافت کی جان قرار دیے جاسکتے ہیں اور ان سے ثقافتی اقدار کے پروان چڑھنے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

پنجاب کی ثقافت کے تشکیلی عناصر پر غور کیا جائے تو ایک اہم زرعی خطہ ہونے کی وجہ سے اس کی ثقافت کی تشکیل میں سب سے زیادہ حصہ زراعت کا ہے۔ پنجاب کے زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی سے منسلک ہیں۔ فصلوں کی کاشت اور کٹائی کے وقت پنجاب میں ثافتی رنگ بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ کسان فصلوں کی کاشت اور کٹائی کے وقت ڈھول، بھنگڑے، ناچ اور دیگر اس طرح کی رسوم سے پنجابی ثقافت کو نمایاں کرتے ہیں۔ گاؤں کی سطح پر فصلوں کی کٹائی کے وقت ثقافتی رنگوں کی بہار ہوتی ہے۔ یہ ثقافتی رنگ پنجابی ثقافت کے نمایاں عناصر میں شمار ہوتے ہیں۔ فصلوں کی کٹائی کے وقت کھیتوں میں پنجابی عورتوں کا کھانا پہنچانا، مختلف لوگوں کا مل جل کر ایک دوسرے کی فصل کی کٹائی میں ہاتھ بٹانا اور دوسروں کے کام کو اپنا کام سمجھتے ہوئے خوشی سے کرنا پنجابی ثقافت کے رنگوں کو نمایاں کرتا ہے۔

پنجابی ثقافت کے عناصر میں زراعت کے علاوہ جو اہم عنصر ہے وہ مختلف اولیاء کے مزارات ہیں۔ پنجاب کو اولیاء کی کثیر تعداد نے اپنا مسکن بنایا تھا۔ جنوبی پنجاب میں ملتان شہر کو تو سرزمین اولیا کا شرف حاصل ہے۔ اولیا کے مزاروں اوران کے عرس پر ہونے والے مختلف اجتماعات سے بھی پنجابی ثقافت کے رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔ ان اجتماعات میں پاکستان کے مختلف خطوں کے لوگ مذہبی عقیدت کے تحت شرکت کرتے ہیں یوں مختلف اقوام کے جمع ہونے سے پاکستان کے مختلف خطوں کے ثقافتی رنگوں کی آمیزش بھی ان اجتماعات میں نظر آتی ہے۔

سماجی تہوار بھی پنجابی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہیں۔ پنجاب کا خطہ مختلف اقوام کا خطہ ہے۔ اس میں مختلف لہجوں سے بولنے والے کئی اقوام کے لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہر قوم کے اپنے خاص تہوار ہوتے ہیں۔ ان تہواروں پر بھی پنجابی ثقافت کے رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔

شادی بیاہ کی رسومات پنجابی ثقافت کا ایک اور اہم عنصر ہیں۔ پنجاب کے خطے میں بسنے والی مختلف اقوام کے ہاں شادی بیاہ کے موقع پر کئی قسم کی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ ان رسومات میں سماجی اور ثقافتی اقدار کا احیا نظر آتا ہے۔ یہ سماجی اور ثقافتی اقدار پنجاب کے کلچر سے مخصوص ہیں۔ بعض رسومات ایسی بھی ہیں جو خالص پنجابی ہیں۔ شادی کے موقع پر خوشی کا اظہار کرنے کے لیے کئی طرح کی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ خاص طور پر لڑکے والوں کی طرف سے بارات کے ساتھ ڈھول لے جانا اہم ثقافتی رجحان قرار دیا جاسکتا ہے۔ ڈھول کی تھاپ پر لڈی، بھنگڑا، ناچ وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے پنجاب کی ثقافت کی تشکیل ہوتی ہے۔

پنجابی ثقافت کے حوالے سے ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ پنجاب کے بعض شہر علم وادب کا اہم مرکز بھی رہے ہیں۔ علم اور ادبی فضا پروان چڑھانے میں پنجاب کا حصہ خاصا زیادہ ہے۔ اس علمی و ادبی فضا نے پنجاب کی ثقافت کے رنگوں کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

کسی معاشرے کی ثقافت کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس قدر موثر ہو کہ اقدار کا دائرہ کار متعین کرے اور انہیں مضبوط بنائے۔ کیونکہ کسی بھی معاشرے میں اقدار ہی وہ معیار ہیں جو معاشرے کو مضبوط بناتی ہیں اور اسے زندہ رکھتی ہیں۔ اقدار ہی معاشرے میں اچھی روایات کو فروغ دیتی ہیں۔ اس طرح معاشرہ مستقبل کی ایک ایسی مثالی تصویر پیش کرتا ہے جس کی بنیاد دیرپا اور آفاقی انسانی اقدار پر مبنی ہوتی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو پنجابی ثقافت اس معیار پر پورا اترتی ہے۔ اس میں وہ تمام خصائص پائے جاتے ہیں جو آفاقی انسانی اقدار سے پروان چڑھے ہیں اور آنے والی نسلوں کا اپنے اسلاف سے تعلق مضبوط بنانے کے حوالے سے خاص اہمیت کے حامل قرار پاتے ہیں۔

مجموعی طور پر پنجابی ثقافت کے خدوخال پنجاب کے خطے سے ہی ابھرے ہیں اور پنجاب ہی اس کا اصل منبع ومرکز قرار پاتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ انگریزی سامراج کے غلبے کی وجہ سے اس کی ثقافتی اقدار میں کسی قدر تبدیلی بھی واقع ہوئی ہے تاہم پنجاب کی اصل ثقافت آج بھی زندہ ہے اور پنجاب میں بسنے والی مختلف اقوام کے لوگ آج بھی اپنی ثقافتی اقدار پر کاربند نظر آتے ہیں۔ اگر ثقافت مذکورہ صفات کی حامل بنیادی اقدار سے خالی ہے تو اس کے اثرات معاشرے پر ہوں گے۔ نتیجتاً معاشرہ مختلف قسم کے بحرانوں کا شکار ہو جائے گا اور اس میں کسی بھی قسم کا تحرک پیدا نہیں ہو سکے گا۔ بالآخر مختلف انواع اور مسائل کے معاشرے میں در آنے سے معاشرہ افتراق اور انتشار کا شکار ہو جائے گا۔

اس تناظر میں جب ہم پنجابی ثقافت کا جائزہ لیتے ہیں تو پنجاب کی ثقافت کے کئی روپ سامنے آتے ہیں لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ پنجابی ثقافت میں وہ تمام روایات، اقدار اور سماجی عناصر پائے جاتے ہیں جو کسی بھی ثقافت کی جان قرار دیے جاسکتے ہیں اور ان سے ثقافتی اقدار کے پروان چڑھنے کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ پنجاب کا علاقہ اپنے خدوخال کی وجہ سے بہت اہمیت کا حامل ہے اس میں بہت ساری ثقافت کے لوگ بستے ہیں اور ان کی الگ الگ بولیاں ان کی پہچان ہیں۔ پنجابی ثقافت کے عناصر میں زراعت کے علاوہ جو اہم عنصر ہے وہ مختلف اولیاءکے مزارات ہیں۔ پنجاب کو اولیاء کی کثیر تعداد نے اپنا مسکن بنایا تھا۔ جنوبی پنجاب میں ملتان شہر کو تو سرزمین اولیا کا شرف حاصل ہے۔ اولیا کے مزاروں اوران کے عرس پر ہونے والے مختلف اجتماعات سے بھی پنجابی ثقافت کے رنگ نمایاں ہوتے ہیں۔

پنجابی زبان پر انگریزی چھاپ کی وجوہات:

ثقافتی اقدار کسی بھی خطے کی پہچان میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ کسی بھی قوم کو متعارف کرانے کے ساتھ ساتھ اس قوم کے ماضی سے بھی آگاہی دلاتی ہیں۔ ثقافت کی ایک بڑی خوبی اس کا لچکدار ہونا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر قوم کی سماجی اور ثقافتی روایات اوراقدار میں تغیر آتا جاتا ہے جس کے نتیجے میں خطے کی ثقافت بدلتی چلی جاتی ہے۔ ثقافت کییہ تبدیلی سماجی اقدار اور زبان کو بھی متاثر کرتی ہے۔

زبان میں تبدیلی پیدا کرنے والے عناصر میں سفر، تجارت، غلبہ، ترک وطن یاثقافتی یلغار اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان عناصر کی وجہ سے جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں توان مختلف لوگوں کے ہاں بولی جانے والی مختلف زبانیں ایک دوسرے سے الفاظ مستعار لیناشروع کردیتی ہیں یہیں سے لسانی تبدیلی کے عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ عمل دونوں زبانوں میں کبھی مساوی اور متوازی نہیں ہوتا اس کا انحصار طاقت پر ہوتا ہے او رغالب زبان وہ ہوتی ہے جو مقتدر حلقوں میں استعمال ہوتی ہے۔ مقتدر حلقوں میں بولی جانے والی زبان جسے حکمرانوں کی زبان بھی کہاجاتا ہے نو آبادیاتی زبانوں کے ساتھ رابطے کے دوران خود جس قدر اثر قبول کرتی ہے اس سے زیادہ ان زبانوں پر اثر انداز ہوتی ہے۔

برصغیر پاک وہند کی تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو اٹھارویں صدی میں یہاں انگریزوں کے عمل دخل کی وجہ سے یہاں کی ثقافت میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد اس علاقے پر اپنا قبضہ مکمل کرلیا تو اس علاقے کی ثقافت کے ساتھ ساتھ یہاں کے رہن سہن اور زبان میں بھی تبدیلی واقع ہونے لگی۔ پنجاب جو برصغیر کا ایک زرخیز خطہ ہے اور کثیر آبادی اس خطے سے وابستہ ہے اس میں بھی ثقافتی اور لسانی

تبدیلیوں کے اثرات نمایاں ہوتے چلے گئے جس کی وجہ سے پنجاب کی ثقافت کے ساتھ ساتھ اس کی لسانی صورت حال بھی بدلتی چلی گئی۔

کسی بھی زبان کے ارتقا اوراس کی بقا کے لیے لازم ہے کہ اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ سمونے کی گنجائش موجود رہے۔ اس کی وجہ یہ ہے یہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سماجی، ثقافتی اور تجارتی سطح پر بہت سی نئی اصطلاحات سامنے آتی رہتی ہیں۔ ان نئی اصطلاحات کے وجود میں آنے کے عوامل بھی مختلف ہوتے ہیں۔ گزشتہ تین سو سالوں پر نگاہ دوڑائیں تو مغربی دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ اس ترقی کی بدولت دنیا میں تجارت کے نئے معیارات قائم ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی لسانی صورت میں بھی تغیر واقع ہوا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے دنیائے مغرب میں ایسی نئی ایجادات سامنے آئی ہیں جو مغرب کے بعد مشرقی لوگوں کی زندگیوں میں بھی خاص اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔ یہ ایجادات اور اختراعات بڑی تیزی کے ساتھ ہماری روزمرہ زندگی میں داخل ہوتی جارہی ہیں۔ ان ایجادات واختراعات کے رواج پانے سے ان کے انگریزی نام اور اصطلاحات بھی بول چال کی زبان میں داخل ہوتے چلے جارہے۔ پنجاب جو کہ کثیر آبادی والا خطہ ہے اس میں تعلیم کی شرح بھی دیگر خطوں کی نسبت بلند ہے جس کی وجہ سے انگریزی ایجادات واختراعات کی طرف اس خطے کا رجحان بھی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی زبان میں انگریزی لفظیات عام بول چال میں بھی استعمال ہوتی ہیں۔ ان لفظیات کے کثرت استعمال سے وہ نامانوس بھی نہیں رہیں بلکہ تعلیم یافتہ اوران پڑھ سبھی ان کے مفہوم سے بخوبی آشنا ہو چکے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزی ایجادات واختراعات کے استعمال سے پنجابی زبان میں انگریزی زبان کی لفظیات کا عمل دخل بڑھتا چلا جارہا ہے۔

پنجابی زبان پر انگریزی کی لفظیات کے اثرات انداز ہونے کی ایک اور بڑی وجہ اس خطے میں تعلیم کی شرح کا بلند ہونا ہے۔ پنجاب کے لوگ خاص طور پر نئی نسل جدید تعلیم سے بہرہ ور ہورہی ہے۔ جدید نصاب میں موجود انگریزی لفظیات اور ان سے واقفیت پنجابی زبان بولنے والوں کی زبان پر بھی اثرانداز ہورہی ہیں۔ جس کی وجہ سے پنجابی زبان میں انگریزی لفظیات کا استعمال عام ہونے لگا ہے۔

انگریزی ایجادات واختراعات نے پنجابی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں بھی بہت اضافہ کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بہت سے پنجابی کے الفاظ ایسے بھی ہیں جو پہلے مستعمل تھے لیکن آج متروک ہوگئے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پنجابی زبان ایک زندہ زبان ہے جس میں دوسری زبانوں کے

الفاظ کو سمونے اور اپنے قواعد میں ڈھالنے کی صلاحیت موجود ہے۔ یہی صلاحیت پنجابی کے ارتقا کا باعث بن رہی ہے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو اس خطے میں صدیوں سے بولی جانے والی پنجابی نے گزشتہ تین صدیوں کے دوران انگریزی کو بھی خاص طور پر متاثر کیا ہے۔ انگریزی کا لسانی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انگریزی نے پنجابی کے کئی الفاظ کو بعینہٖ یا کچھ بدلی ہوئی صورت میں اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجابی اور انگریزی زبان میں انجذاب و قبول کا یہ عمل یک طرفہ نہیں بلکہ دوطرفہ ہے۔ مستند انگریزی لغات اور فراہنگ میں ایسے کئی پنجابی الفاظ مل جاتے ہیں جن کو انگریزی اپنے دامن میں جگہ دے چکی ہے اور وہ مقبولِ عام کا درجہ بھی حاصل کر چکے ہیں۔

پنجابی زبان میں انگریزی لفظیات کے عمل دخل کی ایک بڑی وجہ ادب بھی ہے۔ پنجابی اور اردو کے بہت سے ایسے ادیب ہیں جو انگریزی پر بھی خوب دسترس رکھتے ہیں۔ یہ ادیب انگریزی سماج اور ثقافت سے بھی خاص آگاہی رکھتے ہیں۔ ان میں کئی ادیب تو ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنی عمر کا کچھ نہ کچھ حصہ انگریزی سماج میں بھی گزارا ہوتا ہے۔ ایسے ادیبوں کی تخلیقات میں پنجابی کے ساتھ انگریزی لفظیات کا استعمال ہونا قرین قیاس ہونے کے ساتھ ساتھ ضروری بھی ٹھہرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی میں لکھنے والے ایسے ادیبوں کی تحریروں میں انگریزی لفظیات کا استعمال ملتا ہے۔ یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے پنجابی زبان پر انگریزی کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ جدید عہد میں تعلیمی ترقی کی وجہ سے یہ اثرات مزید گہرے ہوتے جارہے ہیں اور انگریزی لفظیات پنجابی زبان کا حصہ بنتی جارہی ہیں۔ لسانی تبدیلی کے حوالے سے یہ بات مسلمہ ہے کہ کسی زبان میں بھی ہونے والی لسانی تبدیلی کہیں بھی رکتی نہیں ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کچھ وقت یا عرصے کے لیے کوئی زبان جمود کا شکار ہو جائے لیکن زندہ زبانوں میں لسانی تبدیلی کا عمل جاری رہتا ہے اور یہی عمل کسی زبان کے ارتقا کا ضامن ہوتا ہے۔ پنجابی بھی اس حوالے سے اہم زبان قرار پاتی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں جمود پیدا ہونے کی بجائے دوسری زبانوں خاص طور پر انگریزی کی لفظیات کا عمل دخل جاری ہے جس سے اس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے ارتقا کا عمل بھی جاری ہے۔

اردو زبان پر انگریزی کے اثرات کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان کے بھی گہرے اثرات ہیں۔ دیکھا جائے تو انگریزی کی نسبت پنجاب کا اردو سے تعلق خاصا قدیم ہے۔ اردو اور پنجابی زبان کے لسانی روابط زمانہ قدیم سے ہیں۔ کوئی بھی زبان نہ صرف اپنے لسانی خصائص سے خاص پہچان رکھتی ہے بلکہ جس علاقے میں وہ بولی جاتی ہے وہاں کی تہذیب اور کلچر کا بھی اس زبان کے ارتقا میں خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔ اس حوالے سے

دیکھیں تو اردو اور پنجابی کو ایک جیسی تہذیبی فضا اور کلچر میسر رہا ہے۔ دونوں زبانیں ایک دوسری سے خاصی متاثر ہوتی رہی ہیں۔

اردو اور پنجابی کے تاریخی ارتقا کی کہانی ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہے اس لیے اردو پر پنجابی کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے بھی ہمیں تاریخی ارتقا کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اردو اور پنجابی کے مابین جو تاریخی، تہذیبی اور ثقافتی روابط قائم ہیں ان کو مستحکم بنانے میں اہم کردار مسلمانوں نے ادا کیا ہے۔ اکثر ماہرینا اس بات پر زور دیتے ہیں کہ برصغیر کی جدید زبانوں کا سرچشمہ کوئی ایک زبان ہے جس سے ان سب زبانوں کے سوتے پھوٹے ہیں۔

پنجابی کے صوفی شعرا نے پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی پنجابی میں تصوف اور روحانیت کے جو مضامین شامل ہوتے تھے ان سے عوام نہ صرف زبان دانی میں مہارت حاصل کرتی چلی گئی بلکہ روحانی حوالے سے بھی ان کی اصلاح ہوتی گئی۔ جب فرید الدین صاحب فرماتے ہیں کہ 'فریدا خاک نہ تندیے، خاکو جید نہ کوئے۔ جیوندیاں پیراں تھے موئیاں اپڑ ہوئے' تو جہان معنی کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور پھر اس کے بعد شاہ حسین، سلطان باہو، بابا بلھے شاہ، پیر وارث شاہ، خواجہ فرید، سچل سرمست جیسے عظیم صوفی بزرگوں علم، عشق اور عرفان کی چہار جانب جیسے دھنک سی بھیر دل، ابتدائی پنجابی لٹریچر کی روح روحانیت کے نور میں گندھی ہوئی تھی۔ ہمارا سارا فوک اور انہی صوفی بابوں کی دین ہے۔ کلونیل عہد جسے ہم دور غداری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اگرچہ بہت تاریک تھا۔ مگر اس میں زبان و ادب کے حوالے سے اچھے کام بھی ہوئے۔ مثلاً پنجابی زبان کے لیے جو خود پنجابی نہ کر سکے۔ وہ کام ماہر لسانیات (George Araham Grierson) نے کر دیا، linguistic survey of india کی شکل میں، جو ۲۱ جلدوں (volums) پر مشتمل تھا۔ اس کی نویں جلد کے پہلے حصے میں پنجابی زبان کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ قدیم ۱۹۰۴ء سے ۱۹۲۸ء تک کے اس سروے میں، Gaierson نے پہلی دفعہ اس زبان کے لیے پنجابی لفظ استعمال کیا۔ اور بتایا کہ پنجاب ریجن میں جو زبان بولی جاتی ہے۔ اس کا نام پنجابی ہے۔ جس کے بعد سرائیکی، پوٹھوہاری، اور ہندکو کو الگ زبانوں کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ صوبے کے انتظامی امور چلانے کے لیے، کلونیل عہد میں اردو کو پنجاب کی دفتری زبان کے طور پر ۱۸۵۴ء میں رائج کیا گیا۔ جس کے بعد اردو سے پنجابی کا رشتہ کچھ اس طرح استوار ہوا کہ اقبال، فیض، میراجی، راشد، بیدل، منٹو، کرشن چندر احمد ندیم قاسمی، مجید امجد، منیر نیازی، اور ظفر اقبال تک اردو زبان و ادب کے ایسے مینار دکھائی دیتے ہیں۔ جو بزعم خود اردو سے

پنجابی کے رشتے کی اک بہت بڑی دلیل ہیں۔ دونوں زبانیں چونکہ انڈو آرین زبانیں ہیں اور فارسی اسکرپٹ کی مماثلت کی وجہ سے، پڑھنے میں کچھ غیر نہیں لگتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں پنجابی بولی جاتی ہے۔ وہاں اردو ایک معتبر اور شناسا حیثیت میں موجود ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہو گا، یہ وہ زبان ہے، جو رابطے کی زبان ہے۔ مقامی زبانوں سے اردو کا یہ رشتہ ایسا ہے۔ جس نے سب کو وحدت کی لڑی میں پرو رکھا ہے۔ اور پھر ہمارے صوفی بابے، جنہوں نے انڈو پاک کے تہذیبی، تاریخی اور لسانی ورثے کو اپنے لافانی کلام کے ذریعے محفوظ کر کے ہمیں زمانے میں معزز کیا، کیا کوئی اردو بولنے والا ورثے کا انکار کر سکتا ہے۔

یہ ہمارا وہ مشترکہ ورثہ ہے جس پر ہم باقاعدہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ جنگ آزادی کا ایک ہیرو جسے تاریخ شہید ادھم سنگھ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ جس نے جلیانوالہ باغ معصوم شہریوں کا قتل عام کرانے والے جنرل ڈائر کو نے یہ تاریخی الفاظ کہہ کے Assassinate کیا تھا۔ جب اسے حلف اٹھانے کو کہا گیا۔ تو اس نے یہ تاریخی الفاظ کہے کہ میں کسی مذہبی کتاب پر ہاتھ رکھ کر حلف نہیں اٹھاؤں گا، ہیر و وارث شاہ لائیں کہ میرے لیے اس سے متبرک اور کوئی کتاب نہیں۔ یہ کتاب اور اس جیسی دیگر کتابیں، محبت کی کتابیں ہیں۔ امیر خسرو نے پہلے مجنوں اور شیریں فرہاد کے پنجابی قصوں کو فارسی مثنویوں میں ڈھال کر یہ ثابت کیا کہ بولی جانے والی زبان ہمیشہ کتھا میں ہوئی ہے۔ اور ہر نیا قدم یا تجربہ اس کے سرمائے میں اضافہ کرتا ہے۔ اور اسے اوپر کو اٹھاتا ہے۔ اردو کے مقامی زبانوں بالخصوص پنجابی سے رشتے کی غرض وغایت بھی یہی ہے۔ اس حوالے سے جب ہم اردو میں کلاسیکی ادب کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اساتذۂ سخن جن میں اکبرو حاتم، اور مرزا مظہر جان جاناں نے ریختہ کو بھاشا کے الفاظ، تلمیحات اور محاوروں سے پاک صاف کرنے کی ایک مہم کا آغاز کر دیا۔ اس دور میں سنسکرت بھاشا اور قدیم دکنی کے الفاظ کا اخراج ہوا جو مہر و سودا کے زمانے میں جاری رہا اور شیخ ناسخ کے عہد تک جس کی تکمیل ہوئی۔ زبان کو پاک کرنے کی اس مہم نے اردو کو ایک طویل عرصہ کے لیے مٹی کی زبان اور فضا سے گویا منقطع کر دیا، تاہم اردو کی خوش قسمتی کہ ۱۸۵۷ء کے بعد اسے درباروں اور درباری اثرات سے گویا نجات مل گئی۔ اور اس میں ایک ایسی قوت اور خوبصورتی پیدا ہوئی کہ آج اسے دنیا کی ترقیافتہ زبانوں کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر ہم آہستہ آہستہ اس زبان سے دور کیوں ہوتے جارہے ہیں؟ اس زبان کے شعر وادب اور اردو کتاب سے یہ دوری ہمیں کہاں لے کر جارہی ہے۔ کسی بھی قوم کی پہچان اس کی زبان، ادب اور اس کی ثقافت اور ثقافتی اقدار سے بھی بے گانہ ہوتے جارہے ہیں۔ خطہ پنجاب تہذیبی، تاریخی اور ادبی لحاظ سے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ پنجاب ایک مشترکہ تہذیب و

کلچر کی علامت ہے اور اس مشترکہ کلچر میں صوفیوں، سنتوں اور سکھ گوروصاحبان نے اہم کردار نبھایا ہے جیسے بابا فرید، بُلھے شاہ، شاہ حسین وغیرہ یہ وہ صوفی بزرگ تھے جنھوں نے اپنے کلام میں وحدت، اخوت، بھائی چارگی، ہمدردی انسانیت جیسی عظیم صفات کا درس دیا۔ سکھ مذہب کی مقدس کتاب گوروگرنتھ صاحب میں جن شعراء کا کلام موجود ہے ان میں مسلمان بزرگ بابا فرید، ہندو سنت کبیر اور نامدیو بھی شامل ہیں۔ یہ صوفی سنت، درویش گوروصاحبان سرزمینِ پنجاب میں اتنے ہر دلعزیز ہوئے کہ ان سب کے پیغامات پنجاب کی شناخت بن گئے۔

اس خطہ میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب بغیر مذہبِ ملت پنجاب کے مشترکہ کلچر کو آپسی رواداری اور بھائی چارگی کے ساتھ پروان چڑھا رہے ہیں۔ اس مشترکہ کلچر کے مختلف عناصر میں قومی جذبہ حبُ الوطنی، جذبہِ ایثار و قربانی، ایک دوسرے کا احترام پنجاب اور پنجابیت کی شناخت بنے ہوئے ہیں۔

پنجاب کے مشترکہ کلچر نے ہندوستان کو پنجابی زبان کے ساتھ ساتھ اُردو زبان سے بھی مالا مال کیا۔ جس کے متعلق اکثر ماہرین لسانیات کا کہنا ہے کہ اُردو کی اصل جائے پیدائش پنجاب ہی ہے۔ پنجابی اور اُردو زبان میں کثیر الفاظ مشترکہ بھی پائے جاتے ہیں۔ اُردو ہندوستان کی وہ قدیم زبان ہے جو نئے ہند آریائی دور میں شروع ہو کر پورے ملک میں پھلی پھولی ہے۔ ابتدا میں اِسے ہندوی' اور ہندی' کے نام دیئے گئے لیکن اِس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اُردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی اور یہی جوان ہوئی اِس زبان کی ترویج و ترقی میں سب سے نمایاں خدمات پنجاب کے قلم کاروں کی رہیں ہیں۔

اُردو چونکہ پنجاب میں پیدا ہوئی اِس لیے ضروری ہے کہ وہ یا تو پنجابی کے مماثل ہو یا اُس کی قریبی رشتہ دار ہو۔

بہر حال قطب الدین ایبک کے فوجی اور دیگر متوسلین پنجاب سے کوئی ایسی زبان اپنے ہمراہ لے کر روانہ ہوتے ہیں جس میں خود مسلمان قومیں ایک دوسرے سے بات کر سکیں اور ساتھ ہی ہندو اقوام بھی اس کو سمجھ سکیں اور جس کو قیام پنجاب کے زمانے میں وہ بولتے رہے۔

پنجاب ہر میدان میں اپنی برتری منواتا رہا ہے۔ علم و ادب اور تہذیب کے ارتقاء میں بھی اس علاقہ نے اہم رول ادا کیا ہے۔ یہاں تک کہ اُردو ادب کی تاریخ کا جب ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے ارتقائی پس منظر پر نظر ڈالتے ہیں تو حقیقت سامنے آتی ہے کہ پنجاب کے قلمکاروں کا ذکر کئے بغیر اُردو ادب کی تاریخ کسی طرح مکمل نہیں ہو سکتی۔ پنجاب نے اُردو شاعری اور نثر کے حوالے سے اُردو ادب کو ایسے معتبر، معتمد

شاعر اور ادیب عطا کئے جنھوں نے اُردو ادب کے حوالے سے مختلف اصناف میں گراں قدر کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ شاعری کے حوالے سے اقبال، فیض، حفیظ جالندھری، ساحر لدھیانوی وغیرہ۔ نثر کے حوالے سے الطاف حسین حالی، مولوی محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی، سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں یہاں کے ادیبوں نے طنز و مزاح اور صحافت کے میدان میں معرکتہ الآراکام انجام دیئے۔

پنجاب ہندوستان کا سرحدی صوبہ ہے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے شمال سے جتنے بھی حملہ آور یہاں پر باہر سے آتے ان کا پہلا پڑاؤ پنجاب ہی میں رہا۔ حملہ آوروں کے آنے اور آکر یہاں بس جانے کا سلسلہ ایک دو بار نہیں بلکہ صدیوں رہا ہے۔ باہر کے حملہ آوروں سے پنجاب کے لوگوں نے لڑائیاں لڑیں اور دلیری کے ثبوت دئے۔ بیرونی حملہ آوروں پر پنجابیوں نے اپنی تہذیب کے نقوش بھی چھوڑے اور ان کی تہذیبوں سے بھی بہت کچھ حاصل کیا۔ معاشرے میں جب تبدیلی رونما ہوتی ہے تو نئے الفاظ بھی وجود میں آتے ہیں اور پرانی زبانوں کے بہت سے لفظ خارج بھی ہو جاتے ہیں۔ وہ مسلمان جو پنجاب میں داخل ہوئے۔ اور جنہوں نے جنگ و جدال سے الگ ہو کر اس دھرتی کو اپنا وطن بنایا اور انہوں نے مقامی پنجابیوں کے دلوں میں گھر کر لئے۔ عوامی میل ملاپ بڑھا تو اظہار میں عمل حرکت پیدا ہونے لگا۔ زبانوں اور معاشروں کے قریب آنے سے پنجاب میں ایک نئے معاشرے اور ایک نئی زبان کی تشکیل کا آغاز ہوا۔ حقیقتیہ ہے کہ اُردو جس طرح ہندوستان کے اور صوبوں میں اسی طرح پنجاب میں برابر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ جہاں یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو پنجاب میں پیدا ہوئی وہاں یہ بھی ایک سچائی ہے کہ تقسیم ملک کے بعد اُردو کو صرف مسلمانوں سے جوڑ دیا گیا جبکہ زبانیں مذہبوں کی نہیں تہذیبوں کی علامت ہوتی ہیں۔

پنجاب کے مزاج میں مہمان نوازی کا عنصر ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد تک زبانوں اور تہذیبوں کے جذب و قبول سے پنجاب گزرتا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ شروع سے یہاں مختلف اور مخلوط زبانیں بولی جاتی رہی ہیں۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آمد سے سکھ مذہب کے دس گوروؤں کے دور تک اور پھر برطانوی حکومت سے تقسیم در تقسیم کے ادوار اور موجودہ عہد تک جب ہم پنجاب اور اُردو کے باہمی تعلق کا جائزہ لیتے ہیں تو اُردو کی ہر ترقی پسند تحریک کے روشن تانے بانے پنجاب سے ہی مربوط نظر آتا ہے۔ اُردو نے پنجاب کی تہذیب یہاں کے رسم و رواج، یہاں کے عوامی مزاج ان کی متنوع زندگی کی ترجمانی بھی کی ہے۔ دوسرے لفظوں میں پنجاب کے جوہر ایک طرف تو خود کو پنجابی زبان میں اور دوسری طرف اُردو زبان

میں منعکس کیا ہے۔سچ تو یہ ہے کہ پنجاب اپنی تمام تر ثقافتی توانائی اور برنائی کے ساتھ اُردو کی رگ رگ میں جاری وساری ہے۔

اُردو زبان و ادب اور اس کا لب و لہجہ ہر آدمی کی شخصیت کو نکھار دیتا ہے۔گفتگو میں دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔اُردو زبان دنیا کی بہترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔پنجاب اور اُردو کا ماں اور بیٹی کا رشتہ ہے۔اُردو زبان و ادب کی ترقی میں پنجاب کا بھی ایک اہم اور نمایاں رول رہا ہے۔اس صوبے میں اُردو پڑھنے اور لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔خاصی تعداد میں اُردو کے شاعر اور ادیب موجود ہیں۔ہندوستان کے بڑے شاعروں اور ادیبوں کا تعلق بھی اس صوبے سے رہا ہے۔اس کی آب و ہوا نے شاعروں اور ادیبوں کے کلام کو تازگی اور توانائی بخشی ہے۔آج بھی بہت سے شاعر، ادیب ایسے ہیں جن کا تعلق پنجاب سے بنا ہوا ہے۔پنجاب شروع ہی سے اُردو شعر و ادب کا مرکز رہا ہے۔یہ ادیبوں، شاعروں، مصّنفوں، فنکاروں اور دانشوروں اورارباب ِ ذوق کا صوبہ رہا ہے۔

پنجابی زبان کے تاریخی ارتقا کے حوالے سے دیکھا جائے تو شمالی ہند میں بولی جانے والی زبان کو پنجابی زبان کی قدیم صورت کہا جاتا ہے۔یہی پنجابی زبان مسلمان فاتحین کے ساتھ دہلی پہنچتی ہے اور پھر وہاں سے تغلق اور خلجی حکمرانوں کے توسط سے دکن کی سرزمین تک پہنچ جاتی ہے۔دلی اور دکن نے اس زبان کو پروان چڑھانے میں اہم کام کیا۔دکن میں اسی زبان کو دکنی کا نام دیا گیا اور بعد میں اسے اردو کہا جانے لگا۔یوں اردو کی اصل پنجابی ہی قرار پاتی ہے۔اردو میں بے شمار ایسے الفاظ موجود ہیں جو حقیقت میں پنجابی کے ہیں۔انہی الفاظ کی وجہ سے اردو پنجابی میں خاصی مماثلت اور مشابہت دیکھی جا سکتی ہے۔اگر تھوڑی دیر کے لیے ماضی میں جھانکا جائے تو قدیم اردو تو بالکل ہی پنجابی معلوم ہوتی ہے۔جیسے جیسے ماضی کی طرف بڑھتے چلے جائیں اردو اور پنجابی کی یکسانیت اور قربت کا احساس شدید ہوتا چلا جاتا ہے۔الفاظ کے حوالے سے دیکھا جائے تو بے شمار ایسے الفاظ موجود ہیں جو پنجابی کے ہونے کے باوجود اردو میں بھی استعمال کیے جاتے رہے ہیں اور ابھی بھی ہو رہے ہیں۔

قدیم اردو میں دکن، پنجاب اور دہلی کے مراکز کی تحریروں میں بہت زیادہ مماثلت اور لسانی اشتراک بھی ملتا ہے۔پہلے دور میں پنجابی کے تمام بڑے شاعر پنجابی کے ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے جس کی وجہ سے اردو پر شروع ہی سے پنجابی کے اثرات پڑنے شروع ہو گئے۔

تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو دکنی دور کی اردو اور پنجابی زبان میں بہت مماثلت ملتی ہے۔ یہ زبان اصل پنجابی سے قدرے مختلف صورت اختیار کر گئی، حالاں کہ اس کی اصل پنجابی ہی ہے اور اس کے اسماصفات پنجابی کے ہی ہیں۔ بہمنی خاندان دکن میں تقریباً دوسو برس تک حکمران رہا اس کے بادشاہوں میں محمد قلی قطب شاہ، عبد اللہ قطب شاہ ہے اعلیٰ پائے کے شاعر تھے، ان کی زبان پنجابی کی وہی شکل ہے جسے دکنی اردو کا نام دے دیا گیا تھا۔ ملاّ نصرتی دکن کا مشہور شاعر گزرا ہے۔ اس کی مثنوی ''گلشن عشق'' ولی دکنی سے کم و بیش ساٹھ برس قبل ۱۶۵۷ء میں شائع ہوئی اس میں پنجابی زبان کے بے شمار الفاظ ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ قاضی محمود بحری کی مثنوی ''من لگن'' اور ابنِ نشاطی کی مثنوی ''پھول بن'' جو کہ ۱۶۵۵ء میں تصنیف ہوئی اس میں بھی پنجابی زبان کے الفاظ کا اچھا خاصا ذخیرہ نظر آتا ہے۔ یہاں ایک اور بات قابلِ ذکر ہے کہ بہت سے ماہرین لسانیات نے پنجابی سے ناواقفیت کی بنا پر قدیم اردو میں مستعمل پنجابی کے بہت سے الفاظ کو پراکرت یا بھاشا کے الفاظ سمجھا ہے جب اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو وہ الفاظ آج بھی پنجابی میں مستعمل ہیں۔ اس ضمن میں ایک مثال دیکھیں کہ شوکت سبزواری نے اپنی کتاب ''اردو زبان کا ارتقا'' میں اردو اور پراکرتوں کے چند الفاظ کا جائزہ لیا ہے۔ وہ الفاظ یہ ہیں۔

اردو	پراکرت	اردو	پراکرت
اونچا	اُچّ	بھوک	بھکھ
پوت	پت	بوُجھ	بجّھ
سات	ست	میٹھا	مٹھا(۱۰)

اس تقابلی جائزہ میں دیکھا جائے تو شوکت سبزواری نے جن الفاظ کو پراکرت کا ظاہر کیا وہ نہ صرف یہ کہ پنجابی کے ہیں بلکہ آج بھی پنجابی میں اسی صوتی اور معنوی صورت میں استعمال بھی کیے جاتے ہیں۔ یوں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اردو میں پنجابی زبان کے الفاظ کی شمولیت آج کی بات نہیں بلکہ تاریخ میں بہت پہلے سے اردو دیگر زبانوں کی طرح پنجابی زبان کے بھی الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ اپنے دامن میں سموئے ہوئے نظر آتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو اور پنجابی دونوں ہی ہندوستانی زبانیں ہیں اس لیے دونوں کے آغاز اور ارتقا کی کہانی میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔ اردو اور پنجابی کا لاثانی ڈھانچہ بھی بڑی حد تک یکساں اور نمایاں ہے۔ قواعد اور زبان کی ساخت، آوازیں، سابقے اور لاحقے بھی دونوں زبانوں میں خاصی مماثلت رکھتے ہیں۔

اردو پر پنجابی کے اثرات کے حوالے سے بات کرتے ہوئے جب ہم اردو کے آغاز کو دیکھتے ہیں تو یہ اردو کے آغاز کے حوالے سے بہت سے نظریات سامنے آتے ہیں جن میں ایک مقبول نظریہ "پنجاب میں اردو" کی ابتدا کا ملتا ہے۔ یہ نظریہ معروف محقق حافظ محمود شیرانی نے پیش کیا اور اردو کی آغاز کے حوالے سے تمام نظریات میں سے یہ زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ حافظ محمود شیرانی جہاں پنجاب کو اردو کو مولد قرار دیتے ہیں وہاں ان کے خیال میں اردو اور پنجابی دونوں میں بہت سے الفاظ نہ صرف مشترک ہیں بلکہ ان کی تذکیر و تانیث اور جمع افعال میں بھی اتحاد پایا جاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو اور پنجابی دونوں نے ایک ہی جگہ جنم لیا اور ایک ہی جگہ ان کی پرورش بھی ہوئی۔

اردو پر پنجاب اور پنجابی کے اثرات نے نہ صرف اس زبان کو ترقی دی بلکہ اسے بنانے سنوارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اہل پنجاب نے اردو کو نکھارا اور ایک نیا خوب صورت روپ عطا کیا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> "یہاں یہ بات بے محل نہ ہوگی کہ پنجاب اور اہل پنجاب سے اس زبان (اردو) کا رشتہ تاروزِ ازل سے ہی قائم ہے اور اہل پنجاب نے شروع ہی سے اس زبان کو بنانے اور سنوارنے میں حصہ لیا ہے۔ وہ زبان جو عبوری دور میں دہلی سے دکن، گجرات، مالوہ اور دیگر صوبوں میں پہنچی، اس کی ساخت، اس کے مزاج، لہجے اور آہنگ پر پنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا۔ قدیم دکنی اور گجری ادب کے نمونوں میں جب ہم پنجابی اثر و مزاج کو دیکھتے ہیں تو ذرا دیر کو حیرت ضرور کرتے ہیں لیکن ہماری حیرت اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ہم اردو اور پنجاب کے اثر اور رشتے کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر ان نمونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔"(۱۱)

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو آغاز سے ہ پنجابی کے زیر اثر رہی ہے اور اس کے لہجے اور آہنگ پر پنجاب کا خاص اثر ہے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ اس زبان کی ترویج میں بھی پنجاب کا خاصا حصہ ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> "اس زبان کے فروغ میں اہل پنجاب کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ پنجابی لہجہ، آہنگ، تلفظ اور محاورے شروع ہی سے اردو زبان کے مزاج اور خون میں شامل رہے ہیں۔ اردو کو اہل پنجاب ہی نے اپنے سینے سے دودھ پلا پلا کر پالا پوسا اور جوان کیا

ہے۔ اردو کی روایت اور تاریخ میں پنجاب اس طرح شامل ہے جس طرح انسانی رگوں کے اندر دوڑتے ہوئے تازہ خون میں سرخ و سفید جسیمے۔ تاریخ گواہ ہے کہ شمال سے جو لوگ دکن، مالوہ کی طرف گئے اور وہ لوگ جو دہلی میں آباد ہوئے جن میں بادشاہوں سے لے کر سپاہی پیشہ اور دوسرے سب طبقوں کے لوگ شامل تھے پنجاب، ملتان و سرحد کی طرف سے آکر برِاعظم کے طول و عرض میں پھیلے تھے۔"(۱۲)

بعض ماہرین لسانیات یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو کی ابتدائی شکل پنجابی ہی ہے یعنی اس کا خمیر پنجابی ہی سے اٹھا ہے۔ مشہور محقق حافظ محمود شیرانی نے اپنی کتاب "پنجاب میں اردو" میں مختلف تاریخی حقائق اور لسانی خصوصیات سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو پنجابی ہی کی ترقیافتہ شکل ہے۔ وہ یہ تاریخی حقائق بطور دلیل پیش کرتے ہیں کہ جب مسلمان شمال کی طرف سے برصغیر میں داخل ہوتے ہیں تو ان کی ابتدائی بستیاں سندھ اور ملتان میں قائم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد جب لاہور غزنوی سلطنت کا مرکز بنتا ہے اور ایک سو ستّر سال تک یہاں اہل غزنہ کی حکومت قائم رہتی ہے تو یہاں یقینی طور پر کوئی ایسی زبان رائج ہو گی جو مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے درمیان افہام و تفہیم کا کام دیتی ہو گی۔ اس زبان کو وہ پنجابی کہتے ہیں۔ اس کے بعد جب غوری عہد میں لاہور کے بجائے اسلامی ہند کا مرکز دہلی بنتا ہے تو یہ زبان وہاں پہنچتی ہے اور وہاں برج بھاشا اور دوسری زبانوں کے اثرات قبول کرتے ہوئے اردو کی شکل اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔

اردو پر پنجابی کے اثرات کی ایک دلچسپ جہت الفاظ کی نوعیت کے حوالے سے بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ ان دونوں کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو ایک سے دوسری زبان میں جا کر نئے سرے سے زندہ ہو گئے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جس طرح زبان پیدا ہوتی ہے' بولی جاتی ہے اور پھر مر جاتی ہے۔ اسی طرح لفظ بولے جاتے ہیں اور پھر مٹ جاتے ہیں۔ ان کا وجود ختم ہو جاتا' یا پھر متروک' اور غیر مستعمل ضرور ہو جاتے ہیں۔ یہ اُن کا مغالطہ ہے۔ الفاظ نہ تو مرتے ہیں' نہ ہی آج تک کوئی زبان مری ہے بلکہ دنیا کے کسی نہ کسی علاقے میں وہ لفظ آج بھی اُسی معنی اور تلفظ کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ ہوتا کچھ یوں ہے کہ جس طرح اساطیری کہانیوں میں سانپ سو سال کے بعد اپنی جون بدل لیتا ہے۔ بالکل اِسی طرح چند صدیاں گزرنے کے بعد لفظوں میں سے بعض لفظ بھی اپنی ہیئت تبدیل کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرؔ اور سوداؔ کے دور میں اُردو زبان میں جہاں بڑی بڑی تبدیلیاں کی گئیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ بہت سے ایسے الفاظ جو غلط املا یا تلفظ سے

استعمال کیے جاتے تھے۔ ان کو درست کر دیا گیا۔ ایسے الفاظ کی فہرست ذوالفقار احسن نے اپنی کتاب "تنقیدی افق" میں اس طرح دی ہے۔

اِتّا	سے بدل کر	اتنا
بیجلی	سے بدل کر	بجلی
دوجا	سے بدل کر	دوسرا
اگے	سے بدل کر	آگے
سیں	سے بدل کر	سے
جھٹا	سے بدل کر	جھوٹا
انکھیاں	سے بدل کر	آنکھیں
کوے	سے بدل کر	کوئی
پگ	سے بدل کر	پگڑی
نزیک	سے بدل کر	نزدیک
کیتا	سے بدل کر	کرتا
سرج	سے بدل کر	سورج
انجھو	سے بدل کر	آنسو
اُن نے	سے بدل کر	اُس نے
یاں تئیں	سے بدل کر	یہاں تک
من	سے بدل کر	دل [۱۳]

ہندی اور دکنی کے بہت سے الفاظ ترک کر دیئے گئے۔ اُن کی جگہ فارسی اور عربی کے الفاظ نے لے لی مثلاً درشن کی جگہ "دیدار"۔ جگ کی جگہ "دنیا" ماس کی جگہ "گوشت"۔ آرسی کی جگہ "آئینہ" ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ لفظ مرتا نہیں بلکہ کسی نہ کسی دور میں اپنی ہیئت تبدیل کر لیتا ہے۔ ان الفاظ نے بھی اپنی "جون" بدلی ہے مرے نہیں ....

سینکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو مختلف ممالک میں صدیاں گزرنے کے باوجود ابھی تک اپنی اصل حالت میں بولے جا رہے ہیں۔ بعض الفاظ ایسے ہیں جو پاکستان کے علاوہ ازبکستان، آذربائی جان، ترکمانستان،

افغانستان، ایران، قازقستان میں بالکل اسی طرح بولے جاتے اور لکھے جاتے ہیں جس طرح پاکستان میں بولے اور تلفظ کیے جاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان الفاظ کا سماجی اور تاریخی پس منظر خاصا مضبوط ہے۔ یہ الفاظ صدیوں سے مختلف معاشروں میں مستعمل رہے ہیں۔ الفاظ کی زندگی کی بڑی وجہ ان کا استعمال ہے۔ جو لفظ ایک سماج سے دوسرے سماج میں سفر کرتا رہتا ہے وہ زندگی پاتا رہتا ہے۔ لفظ میں تبدیلی اس کے ارتقا کا باعث بنتی ہے۔ پاکستان اور دیگر بہت سے ممالک میں بسنے والی مختلف اقوام کے تاریخی اور سماجی پس منظر میں پائی جانے والی مماثلت مختلف الفاظ کی زندگی کا باعث بنی ہے۔ جغرافیائی طور پر یہ خطے تقسیم ہونے کے باوجود مختلف اقوام کے تاریخی مماثلات نے بہت سے الفاظ کے تلفظ کو اردو اور پنجابی میں ایک جیسا رکھا ہے۔ اسی تلفظ کی وجہ سے ہی یہ الفاظ صدیاں گزرنے کے باوجود ابھی تک اپنی اصل حالت میں ہیں ان کی نہ تو ہیئت تبدیل ہوئی ہے اور نہ ہی ان کے تلفظ میں کوئی فرق آیا ہے دوسرا یہ کہ ان ممالک کے درمیان اقتصادی ثقافتی اور لسانی یکجہتی کا شعور پہلے سے بھی زیادہ بیدار ہوا ہے، اگر تاریخی اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو یہ ممالک صدیوں سے ایک مشترکہ تہذیبی ورثے کے امین رہے ہیں۔ ان ممالک کے تہذیبی اور ثقافتی تعلقات بھی صدیوں نہیں ہزاروں سال پرانے ہیں۔ اس کی وجہ برصغیر میں ۱۸۵۷ء تک فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ ترکی میں بھی عہد عثمانی تک زبان کا رسم الخط عربی ہونے کی وجہ سے فارسی کا عمل دخل ہونا لازمی بات تھی۔ ان ممالک میں عہد قدیم سے لے کر ۲۰۱۹ء تک فارسی ہی علمی ثقافتی اور سیاسی زبان رہی پھر ان ممالک کی ثقافت ایک دوسرے کے بڑی قریب تھی۔ اس لیے زبانوں میں باہمی لین دین کا سلسلہ جاری رہا فارسی مشترک ثقافتی ورثے کی زبان ہونے کی وجہ سے تمام ملکوں میں پھیل گئی۔ ازبکی، تاجکی اور آذری زبانوں کا صوتی نظام کافی حد تک ملتا جلتا ہے۔ ان بعض الفاظ میں "ب" "و" سے اور "و" "ب" سے بدل جاتی ہے جیسے "باغبان" سے باغوان"۔ "وفا" سے "بفا"۔ "آب" سے "آو" وغیرہ لکھا اور تلفظ کیا جاتا ہے۔ ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جو جوں کے توں ہی بولے جاتے ہیں۔ قازیکستان اور قرغیزستان میں چند ایک الفاظ کا تلفظ بدلا ہوا ہے مثلاً آدمی سے آدمک۔ آداب سے آدب۔ آواز سے آباز وغیرہ جیسا کہ میں آغاز میں لکھ چکا ہوں کہ لفظ چند صدیاں گزرنے کے بعد اپنی ہیئت تبدیل کر لیتے ہیں۔ میرؔ اور سوداؔ کے دور کے بعد جب شیخ امام بخش ناسخ کا دور آیا تو انھوں نے بھی زبان میں اصلاح کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس ضرورت کو جس جامعیت سے پورا کیا اس کا اندازہ ذیل کی فہرست سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

پرے	کی جگہ	الگ
دوانہ	کی جگہ	دیوانہ
کسو	کی جگہ	کسی
ٹک	کی جگہ	ذرا
کبھو	کی جگہ	کبھی
نشا	کی جگہ	نشہ
اوس دم تئیں	کی جگہ	اس وقت تک
اپر	کی جگہ	اوپر
دریاکاسا	کی جگہ	دریاسا
لاگا	کی جگہ	لگا
تئیں	کی جگہ	کو
ایدھر	کی جگہ	ادھر
لیک	کی جگہ	لیکن
ایکوں	کی جگہ	ایک
ودا	کی جگہ	وداع [۱۴]

سوداؔ اور ناسخؔ کے دور کی اُردو میں بعض الفاظ بالکل پنجابی کے معلوم ہوتے ہیں جن کو ان دونوں نے اپنے اپنے دور میں اردو سے نکال کر ان کی جگہ نئے لفظ اردو ادب کی جھولی میں ڈالے وہ لفظ جو پنجابی کے تھے ان کی فہرست کچھ یوں ہے۔ پرے' دوجا' کدھی' لیک' تد' ٹک' جیویں' کیتا' کھوج' تئیں' انجھو' اونے' وغیرہ ان الفاظ کو اس وقت کے شعراء نے اپنے شعروں میں استعمال کیا (جو اب بھی ہمارے نصاب میں شامل ہیں) بعد میں ان الفاظ کو متروک قرار دے کر اردو سے نکال دیا گیا۔ یہ تمام الفاظ مرے تو نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ یہ تمام الفاظ پنجابی میں مستعمل ہو گئے ہیں ایک دو لفظوں کا مفہوم متاثر ضرور ہوا ہے لفظ کوئی بھی مرتا یا متروک نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی شکل تبدیل کر جاتا ہے اور وہ دنیا کے کسی نہ کسی علاقے میں اپنے اسی مفہوم کے ساتھ بولا جارہا ہوتا ہے۔ جس کے لیے وہ وضع کیا گیا ہوتا ہے' یہ سارے الفاظ جو اردو سے نکالے گئے پنجابی میں مستعمل ہیں۔ کلاسیکی اُردو میں ایک لفظ "انجھو" تھا۔ جس کے معانی آنسو کے تھے اگر اس لفظ کو غور سے

دیکھا اور پرکھا جائے تو یہ لفظ اصل میں پنجابی لفظ ''ہنجو'' ہے جس کے معانی بھی آنسو کے ہیں۔ ایسا کیوں ہوا شاید اس کی وجہ ۱۵۰۰ ق م میں آریاؤں کی وادی سندھ میں آمد ہو سکتی ہے۔ سندھی زبان اور سنسکرت زبان جو کہ آریاؤں کی زبان تھی برصغیر کی لسانی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے اس خطہ ءزمین پر بولی جانے والی زبانوں میں سے اکثر اس کی شاخیں ہیں کیونکہ آریا قوم اس خطے میں ایک ہی گروہ یا قبیلے کی صورت میں یا پھر ایک ہی دفعہ نہیں آئے بلکہ الگ الگ قبیلوں اور گروہوں کی شکل میں مختلف ادوار میں آتے رہے ہیں۔ وادی سندھ کی طرح ان کے چند گروہ روس، جرمنی، پولینڈ، وسطی ایشیاء اور ایران وغیرہ کی طرف بھی نکل گئے تھے۔ ان تمام ممالک میں پہلے سے بولی جانے والی زبانوں اور آریائی گروہوں کی زبان کے ملاپ سے (وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ) زبانوں کا رنگ وروپ تبدیل ہوتا رہا آریا قوم کا جب یہاں کے رہنے والوں میں میل جول بڑھا تو ان کی زبان کے بے شمار الفاظ یہاں کی بولی جانے والی زبانوں میں شامل ہوتے چلے گئے۔ اُردو زبان نے بھی کافی لفظ یہاں سے حاصل کیے جن میں سنسکرت زبان، دراوڑی زبان اور پالی زبان کے الفاظ زیادہ شامل تھے۔ سندھی زبان، دراوڑی زبان اور سنسکرت زبان کے الفاظ آپس میں ملتے جلتے ہیں جو غالباً تاریخی، مذہبی، سماجی اور سیاسی اثرات کے پیش نظر سب زبانوں نے ایک دوسرے سے حاصل کیے ہوں نمونے کے طور پر چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

سنسکرت	سندھی	اُردو	پنجابی
پنج	پنج	پانچ	پنج
شش	چھ	چھے	چھے
دش	ڈہ	دس	دس / دہ
اکائی	ایکو	ایک	ہک / اک
ویاپار	واپار	بیوپار	بے پار
نو	نو	نو	نو
لوہکار	لوہار	لوہار	لوار
سورنکار	سونارو	سنار	سنار
کمبھکار	کمبھر	کمہار	کمہار
اکھشر	اکھر	حرف	اکھر

ماتر	اما	ماں	اماں
بھاگیہ	بھاگ	بخت' مقدر	لیکھ' مقدر

ان الفاظ کو دیکھنے پڑھنے اور غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ سنسکرت دراوڑی زبانوں نے ہماری اردو اور پنجابی پر بھی کتنا گہرا اثر ڈالا ہزاروں لفظ تھوڑی بہت تلفظ کی ترمیم کے بعد اردو میں شامل ہوتے چلے گئے بعض ادوار میں اپنی ہئیت بھی تبدیل کرتے رہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔ شاعری کے پہلے اور دوسرے دور میں ہندی الفاظ رائج تھے جو چوتھے دور میں متروک ہوئے اور رفتہ رفتہ زبان فارسی' عربی' آمیز ہوتی گئی۔ مثلاً تیسرے دور میں شام کی جگہ سانجھ' محبوب کی جگہ سجن' شہر کی جگہ نگر' جدائی کی جگہ برہ' ذرا کی جگہ ٹک' چہرے کی جگہ مکھ' خوشبو کی جگہ باس' قول کی جگہ بچن' دنیا کی جگہ جگ' ہوا کی جگہ بادیاپون وغیرہ الفاظ مستعمل تھے۔ اس دور میں بہت سے الفاظ زبانوں پر جاری تھے جن کی شکل چوتھے دور میں بدل گئی۔ مثلاً اس دور میں مٹی کی جگہ ماٹی'لگائی کی جگہ لاگا' کیچڑ کی جگہ کیچ'مسیت کی جگہ بدل کر مسجد' قران کی جگہ بدل کر قرآن۔ اردو زبان دراصل منجھی ہوئی پنجابی زبان ہے۔اردو زبان کے آغاز و ارتقااور روایت پر مختلف نظریات کا جائزہ لینے سے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جاسکتا ہے کہ زبان کے خمیر میں جہاں دیگر کئی مقالی زبانوں کے الفاظ و محاورات کا حصہ ہے وہاں مسلمانوں کی برصغیر میں آمد کے ساتھ عربی اور فارسی الفاظ وتراکیب کا بھی خاصا کردار ہے۔ قرآن وحدیث کے الفاظ کے ساتھ ساتھ ہر دور کے شعرا اور ادباء کے ادب پاروں کے ذخیرہ الفاظ میں بھی اردو کے دامن کو وسعت بخشی ہے۔ مختلف اقوام وقبائل کی زبانوں اور بولیوں کے اردو زبان پر اثرات کی بناپر اسے لشکری زبان بھی کہاجاتاہے۔

اردو زبان پر پنجابی کے اثرات اور اردو، پنجابی کے لسانی اشتراک کو جب ہم ادبی تناظر میں دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پنجابی ادب نے بھی اردو زبان پر نہ صرف گہرے اثرات مرتب کیے ہیں بلکہ اردو کی ترویج میں بھی پنجابی کا خاصا حصہ ہے۔ متوسطینیعنی درمیانی دور کے شعرا خاص طور پر میر تقی میرؔ، سوداؔ، انشاؔ اور نظیرؔ کے کلام میں پنجابی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس دور کے نثر نگاروں کے ہاں بھی اردو میں پنجابی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔ مثلاً رتن ناتھ سرشار (خدائی فوجدار، فسانہ آزاد، جامِ سرشار)، محمد حسین آزاد (دربارِ اکبری، قصصِ ہند)، مولوی نذیر احمد دہلوی (المحصنات)، پیارے لال آشوب (من سکھی سندر سنگھ) میں پنجابی کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔

حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" ہمیں جہاں پنجاب میں اردو کے پیدا ہونے اور پروان چڑھنے سے بڑے مدلل انداز میں روشناس کرواتی ہے وہیں اردو اور پنجابی کے باہمی رشتے کے حوالے سے بھی خاصی معلومات بہم پہنچاتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں تاریخی شواہد سے یہ ثابت کیا ہے کہ بھاشا کے وہ الفاظ جو پنجابی الاصل ہیں وہ اردو میں وہی شکل و صورت رکھتے ہیں سوائے اس کے کہ پنجابی میں اگر یہ پہلے مصوتے کے بعد آئیں تو الف کی آواز چھوڑ دیتے ہیں۔ ذیل میں اس کی کچھ مثالیں دیکھیں:

ہندی	پنجابی	اردو
چچا	چاچا۔ چچا	چچا
باندر	باندر	بندر
ماچھر	مچھر	مچھر
سانچ	سچ	سچ
ماکھی	مکھی	مکھی
تاکڑی	تکڑی	تکڑی
ماٹی	مٹی	مٹی(۱۵)

اسی طرح صوتی حوالے سے دیکھا جائے تو بھی اردو اور پنجابی کے بہت سے الفاظ محض معمولی صوتی فرق سے دونوں زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً

پنجابی	اردو
ویچنا	بیچنا
وکاؤ	بکاؤ
وال	بال
وسنا	بسنا(۱۶)

ان الفاظ میں صرف 'و' اور 'ب' کا صوتی فرق ہے باقی ہر حوالے سے ان میں اشتراک پایا جاتا ہے۔ یوں ان تاریخی حقائق، لسانی دلائل اور معنوی صورت حال کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو پر پنجابی کے اثرات خاصے گہرے ہیں۔

د۔ اُردو زبان پر انگریزی زبان کے اثرات:

زبان کا ارتقائی عمل مختلف جہات سے سفر کرتا ہے۔ ہر زبان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مختلف سیاسی و سماجی عناصر کے زیر اثر اپنے ذخیرہ الفاظ میں اضافے کے ساتھ ساتھ مختلف الفاظ کے اخراج اور ادخال کا فریضہ بھی انجام دیتی چلی جاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر زبان میں دیگر زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے جاتے ہیں اور بہت سے الفاظ خارج بھی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ زبانوں کے ارتقا کا یہ عمل یک طرفہ نہیں ہوتا بلکہ کوئی زبان اگر کسی دوسری زبان کے اثرات قبول کرتے ہوئے اس کے بعض الفاظ کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے تو اپنے بہت سے الفاظ بھی اس دوسری زبان کو منتقل بھی کرتی چلی جاتی ہے۔ دوسری طرف الفاظ کے تبادلے کے اس عمل میں الفاظ کے استعمال کی صورت بھی بعض اوقات بدلتی چلی جاتی ہے۔

ایک زبان پر کسی دوسری زبان کے اثرات کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو ان میں بہت سے سیاسی اور سماجی عناصر کو مد نظر رکھنا ضروری ہو جاتا ہے جن کے زیر اثر وہ زبان پروان چڑھ رہی ہوتی ہے۔ کیوں کہ سیاسی اور سماجی عناصر مل کر ایک معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں اور زبان اس معاشرے کے باشندوں کے درمیان رابطے کا ایک مؤثر ذریعہ ہوتی ہے۔ اس لیے سیاسی و سماجی عناصر کو پس پشت ڈال کر نہ تو کسی زبان کو درست انداز میں سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس پر دیگر زبانوں کے اثرات اور اس کے ارتقائی عمل کی اصل تک رسائی کی جا سکتی ہے۔

اردو پر جب ہم انگریزی زبان کے اثرات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں تاریخ کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے اس دور تک پہنچنا پڑتا ہے جب ہندوستان میں انگریزوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ برصغیر کا یہ خطہ ہمیشہ سے دیگر قوموں کے لیے باعث کشش رہا ہے۔ اٹھارویں صدی میں انگریزوں نے تجارت کی غرض سے اس خطے میں آنا شروع کیا اور یہاں کی دولت کو اپنے مفاد میں اس طرح استعمال کرنے لگے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس دولت سے نہ صرف اپنی جدی ریاست کو خوشحال بنانے میں کامیاب ہو گئے بلکہ اس خطے میں اپنا کلچر اور اپنی تہذیب بھی رائج کرنے لگے۔ کلچر اور تہذیب کے رواج نے اس خطے کے لوگوں کی زبان میں انگریزی زبان کے عمل دخل کو بھی رواج دیا۔ یوں اس خطے میں انگریزوں کی آمد اور مقامی لوگوں کے ساتھ میل جول سے اردو زبان پر انگریزی کے اثرات پڑنے شروع ہوئے۔

اردو پر انگریزی کے اثرات دو بڑی صورتوں میں سامنے آتے ہیں۔ لاشعوری اور شعوری۔ لاشعوری حوالے سے دیکھیں تو اس کی بڑی وجہ ۱۸۵۷ء کے بعد سماج میں انگریزی کلچر کا عام ہونا ہے۔ انگریزوں سے

مقامی لوگوں کے میل جول سے بڑھنے سے لاشعوری طور پر گفتگو میں اردو کے ساتھ ساتھ بہت سے انگریزی الفاظ بھی زبانِ زدعام ہوتے چلے گئے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ غالبؔ کے خطوط جو اپنی ایک خاص سماجی اہمیت رکھنے کے ساتھ اس دور کی سیاست اور معاشرت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں ان میں بھی ہمیں پارسل، رجسٹری، پیڈ، ٹکٹ، پوسٹ ماسٹر، ڈگری، اپیل، سیشن جج، کورٹ، ریڈر، رپورٹ، کونسل، بورڈ، سرٹیفکیٹ، کمپنی، اگریمنٹ وغیرہ کے خالص انگریزی الفاظ بکثرت ملتے ہیں جب کہ اس دور میں بھی ان کے متبادل اردو الفاظ نہ صرف موجود تھے بلکہ رائج بھی تھے۔ شعوری طور پر دیکھا جائے تو اردو میں انگریزی الفاظ کے استعمال کا چلن ہمیں علی گڑھ کی تحریک سے شروع ہوتا نظر آتا ہے۔ سرسید احمد خان اپنے عہد کے نہ صرف ایک عظیم ادیب تھے بلکہ اس وقت کے سیاسی و سماجی حالات اور خاص طور پر اہل ہندوستان کی حالت زار پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ وہ اس قوم کے لیے ایک عظیم مصلح بن کر ابھرے تھے۔ یہ درست ہے کہ اس عہد میں ان پر بہت تنقید بھی ہوئی اور ان خیالات و عقائد کو اسلام سے متصادم بھی قرار دیا گیا لیکن وقت نے ثابت کیا کہ ان کی تحریک نے ہندوستانی لوگوں کو سامراجی طاقتوں کو ان کے اپنے میدان میں مقابلہ کرنے کا شعور دیا۔ سرسید نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے ہندوستان کے باشندوں کو شعوری طور پر انگریزوں سے مفاہمت کی طرف راغب کیا۔ یوں اس مفاہمت نے باشندگان ہندوستان کے ہر شعبے پر اثرات ڈالنے کے ساتھ اردو زبان پر بھی انگریزی کے گہرے اثرات مرتب کیے۔

سرسید نہ صرف عالم دین تھے بلکہ کمال کے انشاپرداز بھی تھے۔ انگریزی سے خصوصی لگاؤ ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنی نثر میں شعوری طور پر کثرت سے انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ ایک عظیم تحریک کے روح رواں ہونے کی وجہ سے ان کے تعبین کی بھی ایسی خاصی تعداد موجود تھی جنھوں ان کے اتباع میں انگریزی الفاظ کو اردو میں استعمال کیا اور یوں اردو میں انگریزی کے الفاظ کثیر تعداد میں شامل ہوتے چلے گئے۔ یوں اردو پر انگریزی کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ لیکنیہ ایک حقیقت ہے اردو زبان دیگر زبانوں کے الفاظ کو اپنے دامن میں سمونے کے حوالے سے بہت وسیع دامن ثابت ہوئی ہے۔ فارسی اور عربی کے حروف تو پہلے بھی اردو میں بہت حد تک شامل تھے انگریزی کے اثرات پڑنے پر بھی اس عظیم زبان کے بنیادی ڈھانچے نے بڑی وسیع دامنی سے اسے قبول کیا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اس دور میں انگریزی کے بڑھتے ہوئے اثرات کے بارے میں اپنی کتاب "اردو لسانیات" میں لکھا تھا:

"فارسی اور عربی کا مقروض ہونا تو خیر اس زمانے کے سیاسی حالات کے لحاظ سے اس کی سرشت میں داخل ہو گیا مگر وہ اب انگریزی کی اس قدر شرمندہ احسان ہوتی جارہی ہے کہ نہ معلوم آئندہ نسل کے لسانیاتی معاملات اس کے مقروض الفاظ کا کیا تناسب نکالیں"(۱۷)

سر سید تحریک نے مسلمانوں کو جدید علوم کی طرف راغب کیا۔ اور یہ اس وقت کے حالات تھے کہ جس طرح کسی دور میں یونان، اٹلی روم اور فرانس برطانیہ کے باشندوں کے لیے تہذیب و تمدن کے مراکز بنے ہوئے تھے تاریخ نے ایسا پلٹا کھایا کہ وہ برطانیہ خود اہلِ ہند کے لیے جدید علوم اور کلچر کا گہوارہ بن کر ابھرا۔ جس کے نتیجے میں یہاں کے لوگ علم و ہنر کی تحصیل، صنعت و حرفت کی ترقی اور سیر و سیاحت کے لیے برطانیہ کا رخ کرنے لگے۔ وہاں سے جب وہ واپس آتے تو نہ صرف وہاں کے علوم و فنون ساتھ لاتے بلکہ ان کی زبان کے بہت سے الفاظ بھی اپنی اردو کے ساتھ بولنے لگتے تھے یوں انگریزی زبان کے الفاظ اردو میں رائج ہوتے چلے گئے۔ اہل ہند برطانیہ کے سیاسی اور سماجی ماحول کو قریب سے دیکھتے اور ان کی معاشرت بھی کافی حد تک اپنانے لگے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں موجود انگریزی انجمنوں، سوسائٹیوں اور کلبوں نے بھی انگریزی سے اردو کو متاثر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

انیسویں صدی عیسوی میں انگریزی علم و ادب نے بھی اردو زبان کو خاص طور پر متاثر کیا۔ تعلیم یافتہ ہندوستانی جو کہ جدید انگریزی علوم پر دسترس رکھتے تھے وہ انگریزی کی ترقی سے اس قدر مرعوب ہو رہے تھے کہ انہوں نے علوم و فنون اور سائنس و ادب سے واقفیت حاصل کرنے اور ان کو ترویج دینے کے لیے انگریزی علم و ادب کے ذخائر کو اردو میں ترجمہ کرنے کا کام بھی شروع کر دیا۔ حکام کو حکومتی سرپرستی بھی حاصل تھی بلکہ حکومت نے خود ترجمے کے لیے ادارے بھی قائم کیے۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ اور دیگر ادارے اس فریضہ کو انجام دینے میں پیش پیش تھے۔ ان ترجمہ و تالیف کے مراکز اور اس طرح کے دیگر اداروں کی بدولت وہ لوگ جن کی انگریزی پر استعداد بہت کم تھی وہ بھی نہ صرف انگریزی علوم و فنون سے آشنا ہوتے چلے گئے بلکہ کئی انگریزی الفاظ، تراکیب، اصطلاحات، محاورات، تصورات اور خیالات سے بھی روشناس ہو گئے۔

تاریخ میں سفر کرتے ہوئے جب ہم بیسویں صدی عیسوی میں داخل ہوتے ہیں تو ایک نئی حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی عیسوی سائنس اور ٹیکنالوجی کی تیز رفتار ترقی کی صدی تھی۔ اس صدی

میں علم وفنون کی ترقی نے جہاں سماجی سطح پر اپنے گہرے اثرات مرتب کیے اور مختلف علاقوں کی سماجی فضا کو یکسر بدل کر رکھ دیا وہیں زبان وادب میں بھی خاصی تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ زبان جو کہ رابطے کا ایک اہم ذریعہ ہے جب رابطے کے انداز واطوار میں تبدیلی آئی تو زبانوں میں بھی تبدیلی آتی چلی گئی۔ اردو کے حوالے سے دیکھا جائے تو بیسویں صدی میں اردو زبان پر انگریزی کے اثرات بہت واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ بیسویں صدی میں مغرب نے سائنس و ٹیکنالوجی میں بے پناہ ترقی کی، اس ترقی کی بدولت اور نئی ایجادات سے جہاں سماجی سطح پر زندگی میں آسانیاں پیدا ہوئیں وہیں جدید ذرائع نقل وحمل کی ارزانی اور آسان فراہمی سے دنیا کے مختلف خطوں کے باشندے ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے، ہوائی جہاز اور بحری جہاز کے ذریعے جب دور دراز علاقوں کے سفر ممکن ہوئے تو ان اسفار نے لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زبانوں کو بھی متاثر کیا یوں سینکڑوں متعلقہ الفاظ اردو میں رائج ہو کر اس کے ذخیرہ الفاظ کو بڑھاتے چلے گئے۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی میں ہونے والی مختلف ایجادات سے بھی انگریزی زبان کا اردو پر اثر پڑا۔ بیشتر ایجادات چوں کہ مغرب میں ہوئی تھی اور ان کے نام انگریزی زبان میں ہی تھے یوں جب وہ اس خطے میں متعارف کروائی گئی تو اپنے اصلی انگریزی ناموں کے ساتھ وہ یہاں متعارف ہوئیں، یوں ان ایجادات کی بدولت، ٹیلی ویژن، ریڈیو، سینما، فلم، سینما سکوپ، تھٹر یکل کمپنی اور اس طرح کے دیگر بہت سے الفاظ اردو کے دامن میں جگہ لینے میں کامیاب ہوئے۔ یوں ان ایجادات کے متعارف ہونے اور پھر معاشرے میں ان کے استعمال سے اردو لفظیات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ ایجادات کے ساتھ ساتھ چھاپہ خانوں کے قیام اور ان میں ہونے والی جدت نے بھی بیسویں صدی میں اردو پر انگریزی کے اثرات کے حوالے سے خاص کام کیا۔ ہندوستانی معاشرے میں انگریزی اخبارات کی آمد، میگزین اور انگریزی رسالوں کی ترویج اور سستی انگریزی کتب پڑھنے کے رجحان میں اضافہ سے بھی انگریزی کے کثیر تعداد میں الفاظ اردو میں داخل ہوتے چلے گئے۔

بیسویں صدی میں جب نئی ایجادات مغرب سے آنی شروع ہوئیں اور جدید ذرائع نقل و حمل نے رواج پایا تو ہندوستانی معاشرے میں انگریز اور مغرب سے مرعوبیت کا ایک رجحان پروان چڑھنے لگا۔ ان ایجادات اور انگریزوں کی ترقی نے اس قدر مرعوب کیا کہ ہندوستان کے بہت سے باشندے انگریزوں کی سی وضع قطع اپنانے لگے۔ وہ ان جیسا لباس زیبِ تن کرنے اور ان جیسا انداز زندگی اپنانے میں فخر محسوس کرنے لگے اور ان کی زبان تک کو اپنی بول چال میں استعمال کرنے لگے۔ بول چال میں انگریزی زبان کے الفاظ داخل

ہونے سے بھی دو صورتیں پیدا ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ جو ہندوستانی انگریزی سے اچھی خاصی واقفیت رکھتے تھے انہوں نے بول چال کے ساتھ ساتھ تحریر میں بھی انگریزی الفاظ کو داخل کرنا شروع کر دیا یوں بہت سے انگریزی الفاظ درست ہجوں اور معنی کی صحت کے ساتھ اردو میں آگئے اور رائج ہو گئے۔ دوسری صورت جو سامنے آئی وہ خاصی دلچسپ تھی۔ یہ صورت اس وقت سامنے آئی جب تعلیم یافتہ طبقے کی دیکھا دیکھی نیم خواندہ افراد نے بھی انگریزی الفاظ کو اپنی بول چال میں استعمال کرنا شروع کرنا کر دیا۔ ان نیم خواندہ افراد کی درست ادائیگی نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے انگریزی الفاظ اصل صورت سے بگڑ کر اردو میں رائج ہوتے چلے گئے۔ اور یہ بگاڑ ایسا آیا کہ ان الفاظ کی اصل صورت کی پہچان ہی مشکل ہو گئی۔

ہندوستان کے کم تعلیم یافتہ لوگوں اور خاص طور پر ایسے لوگ جو انگریزی سے خاص واقفیت تو نہیں رکھتے تھے لیکن انگریز اور انگریزی کلچر سے مرعوب بہت تھے انہوں نے جب اپنی گفتگو میں انگریزی زبان کے الفاظ استعمال کرنا شروع کیے تو اپنے مخصوص ہندوستانی لہجے کی وجہ سے بھی ان الفاظ کو بگاڑ کر رکھ دیا اور بعض الفاظ ایسے بگڑے کہ آج بھی اسی بگڑی صورت میں ہی مستعمل ہیں۔ مثلاً آج 'پتلون' سے تو سب واقف ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ لفظ اصل میں 'پینٹلون' ہے۔ اسی طرح 'ترپال' کا لفظ تو ہر ایک کی زبان پر رائج ہو گیا لیکن اس کا اصل لفظ 'ٹارپالن' پسِ پردہ چلا گیا۔ لوگ 'کیتلی' کو تو خوب سمجھنے لگے لیکن 'کیٹل' سے نا آشنا ہو گئے۔ 'کمان' سے ہر ایک کو واقفیت ہے لیکن اس کی اصل 'کمانڈ' محض انگریزی کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اسی طرح 'کیمبرک سے کمرک'، 'پلاسٹر سے پلستر'، 'ٹربائن سے تربان'، 'کارٹریج سے کارتوس'، 'کارنس سے کانس'، 'رپورٹ سے رپٹ'، 'جنرل سے جرنل'، 'رڈرلی سے اردلی'، 'رکروٹ سے رنگروٹ'، لارڈ سے لاٹ اور پھر ہندوستانی رواج کے مطابق صاحب لگا کر لاٹ صاحب بنتے چلے گئے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر بگڑے ہوئے بہت سے الفاظ پر غور کیا جائے تو ایک روشن حقیقت سامنے آتی ہے کہ انگریزی سے اردو میں زیادہ تر وہی الفاظ آئے ہیں جو عام فرد بھی اپنی زبان میں استعمال کرتا تھا یا دوسرے لفظوں میں وہ الفاظ روزمرہ کی زبان میں بولے جاتے تھے۔ یوں عام بول چال کے ذریعے یہ الفاظ اردو میں داخل ہوتے چلے گئے۔

اردو زبان پر انگریزی کے اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے کہ اردو کے دامن کو انگریزی الفاظ سے بھرنے میں خاصا عمل دخل اس وقت کے اہل قلم کا بھی ہے۔ اس وقت چوں کہ انگریزی کے بہت سے حروف کا چلن عام بول چال کی زبان میں ہو چکا تھا اس لیے بہت سے ادیبوں، مقررین اور انشاپردازوں نے بھی سہولت سمجھتے ہوئے ان الفاظ کو بے دریغ اپنی تحریروں

اور تقریروں میں استعمال کیا جب کہ ان کے پاس ان انگریزی الفاظ کے متبادل اردو الفاظ موجود بھی تھے مگر سوسائٹی میں چوں کہ انگریزی الفاظ سے مزین اردو بولی جا رہی تھی تو تحریروں میں انہی الفاظ کو استعمال کرنے میں عافیت سمجھی جانے لگی۔ نہ صرف سہولت بلکہ بعض لوگوں نے اپنی انگریزی دانی اور قابلیت کی دھاک بٹھانے کے لیے بھی بے دریغ انگریزی الفاظ کو اردو میں استعمال کرنا شروع کر دیا یوں اردو کے ذخیرہ الفاظ میں انگریزی کے الفاظ داخل ہوتے چلے گئے۔

سیاسی اور سماجی حوالے سے دیکھا جائے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمے کے بعد برصغیر کا یہ خطہ براہِ راست تاجِ برطانیہ کی عملداری میں چلا گیا تھا۔ یوں دونوں ممالک کے درمیان سیاسی سطح پر تعلقات کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ سیاسی تعلقات جوں جوں مضبوط ہوتے گئے توں توں انتظامی، فوجی، تجارتی، سائنسی، علمی وادبی اور دیگر سطحوں پر روابط بڑھنے سے مختلف نوعیت کے انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہوتے چلے گئے۔ اور یہ الفاظ اس حد تک اردو میں رائج ہوگئے کہ اگست ۱۹۴۷ء میں انگریز کی حکومت تو ختم ہوگئی لیکن انگریزی کی حکومت ابھی تک جاری ہے۔ اور اردو میں داخل ہونے والے انگریزی الفاظ اب زبان زد عام ہو چکے ہیں۔ انگریزی کے یہ الفاظ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذیل میں چند ایک مثالیں پیش کی جاتی ہیں کہ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں کون کون سے انگریزی الفاظ اس دور میں رواج پائے تھے اور آج تک اردو میں بولے جا رہے ہیں۔

☆ نظم ونسق اور سیاسات میں مستعمل انگریزی الفاظ:

اسٹاف، لاک اپ، وارڈ، بائیکاٹ، لیڈر، اسمبلی، پارٹی، ممبر۔ چیئرمین، چیئرپرسن، اسپیکر، ڈیموکریسی، پارلے منٹ، کورٹ، اپوزیشن، میئر، اپوزیشن لیڈر،

تفریحات میں مستعمل انگریزی الفاظ:

ٹاکی، اور ٹاکیز، سینما، ڈربی، شو، فلم، باکسنگ،

ملبوسات میں مستعمل انگریزی الفاظ:

برجس، ٹائی، نکٹائی، ریڈی میڈ ڈریس، سوئٹر، سلیپر، وول، اپرن، ہیٹ، ہوڈ، پینٹ، شرٹ، ٹراؤزر، شوز، جاگر، ساکس، اوورکوٹ، سوٹ وغیرہ

نقل وحمل میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ واصطلاحات:

ڈرائیور، کلینر، کنڈکٹر، سیٹ، ٹائر، روڈ، ٹرین، برتھ، بوٹ، شنٹنگ، فرلانگ، بائیسکل، موٹر کار، اسپیڈ، میٹر، کلومیٹر، ریلوے لائن، ائیرپورٹ، بس اسٹینڈ وغیرہ۔

کھیلوں میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ:

ٹیم، پلئیر، چیمپئین، کوچ، بال، بالنگ، بیٹ، بیٹنگ، تھرو، اننگ، اسپن، اوور، بیاٹ، بڈ، برج، پلے، ڈمبل، ڈبل، سنگل، شیلڈ، فاؤل، گول، گراؤنڈ، کٹ، ٹائم، فیلڈنگ، سکور، رنز، وکٹ، وکٹ کیپر، گول کیپر، بیک ورڈ، فارورڈ، آؤٹ، سلیکشن بورڈ وغیرہ۔

تجارت میں رائج انگریزی الفاظ:

انگریز نے اس خطے پر قدم ہی چوں کہ تجارت کی غرض سے جمائے تھے اور پھر یہاں کے خام مال کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے یہاں تاجر سے تاجور تک کا سفر طے کیا۔ تجارت کی غرض سے ہی انہوں نے یہاں پالیسیاں تشکیل دی۔ یہ بات درست ہے کہ انگریز نے اس خطے پر اپنا کلچر اور تہذیب لاگو کرنے اور عیسائیت کو فروغ دینے میں بھی خاصی دلچسپی لی لیکن اس کا بنیادی نقطہ نگاہ تجارت ہی تھا۔ کمپنی کی حکومت میں جہاں بھی کمپنی کو محسوس ہوا کہ تجارت یا عیسائیت کی ترویج میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہو گا تو انہوں نے تجارت کو ہی ترجیح دی۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ:

> "جوں جوں کمپنی کی سیاسی طاقت بڑھتی گئی اور اس کے مقبوضات وسیع ہوتے گئے اس نے عیسائی پادریوں کی راہ میں روڑے اٹکانا شروع کر دیے۔ اب اسے یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو، یہاں کے باشندے ان لوگوں کی سرگرمیوں کو مذہبی مداخلت خیال کریں اور اگر کمپنی ان کی حمایت کرے گی تو لامحالہ یہاں کے باشندے اس کے اسے ذمہ دار گردانیں گے۔"[۱۸]

یوں تجارت ہی انگریزوں کا بنیادی مقصد ٹھہرا جس پر وہ مذہبی سرگرمیوں کو بھی قربان کرنے پر تیار ہو گئے تھے۔ تجارت میں اس قدر گہری دلچسپی نے جہاں تجارتی امور کو فروغ دیا وہاں تجارتی زبان بھی نئی جہتوں سے آشنا ہوئی اور مقامی زبان اردو سے ملنے کی وجہ سے بہت سی انگریزی تجارتی اصلاحات اور الفاظ اردو میں بھی رائج ہوتے چلے گئے مثلاً اسٹال، اسٹامپ، اسٹاک، ٹریڈ، ٹریڈ یونین، سیل، پرچیز، پرچیز کمیٹی، میک،

مارک، ٹریڈ مارک اور پھر آگے مالی امور میں پڑتے ہوئے انکم، انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس، شلنگ وغیرہ جیسے الفاظ اور اصطلاحات اردو میں رائج ہوتی چلی گئیں۔

اردو پر انگریزی کے اثرات کی ایک جہت عالمگیر نوعیت کی بھی ہے۔ اس جہت کو دیکھا جائے تو بیسویں صدی میں سائنس کی تیز ترین ترقی کی وجہ سے بہت سی سائنسی اصطلاحات بھی سامنے آئیں۔ ان میں سے اکثر انگریزی میں ہیں۔ اب یہ اصطلاحات ایسی ہیں کہ ان کے تراجم یا تو کیے ہی نا جاسکے اور اگر بعض کے کیے بھی گئے تو وہ اردو میں مستعمل نہ ہو سکے کیوں کہ دنیا بھر میں وہ اصطلاحات انگریزی میں ہی رائج تھی اور اب تک انگریزی میں ہی رائج چلی آرہی ہیں۔ مثلاً آکسیجن، نائٹروجن، ہائڈروجن، کلورین، فلورین، آیوڈین اور پھر ان سے آگے بننے والے سائنسی الفاظ آکسائڈ، نائٹریٹ، ہائیڈرائیڈ وغیرہ دنیا بھر میں انہی الفاظ میں ہر جگہ ایک معنوں میں استعمال ہوتے ہیں یوں اردو میں بھی ان کا چلن عام ہوتا چلا گیا۔ اب صورت حال یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اردو میں ان کے متبادل الفاظ رائج کرنے کا خیال تک معدوم ہو کر رہ گیا ہے اور انہیں بعینہ اردو کے الفاظ مان لیا گیا ہے اب اردو میں یہ اور اس طرح کے دیگر بہت سے الفاظ جب اور جہاں بھی استعمال ہوتے ہیں وہ اردو کے ہی سمجھے جاتے ہیں۔ انگریزی کے بہت سے الفاظ کو آج اردو کا مان لینے کے پیچھے بڑی وجہ وہ سیاسی اور سماجی پس منظر ہے جس میں انگریز اور مقامی ہندوستانی طبقہ تقریباً دو سو سال تک اکٹھا رہا۔ ایسٹانڈیا کمپنی کے یہاں قدم جمانے سے لے کر ۱۹۴۷ء میں انگریزی اقتدار کے خاتمے تک طویل عرصے میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مابین ہمہ گیر تعلقات پیدا ہو گئے تھے ان تعلقات کی نوعیت بعض جگہ تو ایسی بھی نظر آتی ہے کہ مقامی باشندے شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بنے بھی نظر آتے ہیں۔ ایسے گہرے تعلقات لازمی طور پر زبان کی ترویج کا بھی ذریعہ بنتے ہیں اور بنے بھییوں انگریزی زبان اشرافیہ سے ہوتی ہوئی عوام کی روزمرہ گفتگو میں بھی داخل ہوتی چلی گئی۔ اور یہ اس قدر اردو پر اثرانداز ہوئی کہ آج کئی سال گزرنے کے بعد بھی اردو نہ صرف یہ کہ ان اثرات سے نکل نہ پائی بلکہ اب اردو نے ان بدیسی الفاظ کو بھی اپنا ہی قرار دے دیا اور کھل کر ان کا استعمال بطور اردو الفاظ ہونے لگا ہے۔

اردو اس حوالے سے خاصی خوش قسمت رہی ہے کہ اس میں جس زبان سے جو بھی لفظ آیا وہ اس کے دامن میں اس طرح سما گیا کہ اس کا ہی ہو کر رہ گیا۔ دنیا کی شاید ہی کوئی اور ایسی زبان ہو جس نے دوسری زبانوں کے اتنے الفاظ اپنے اندر داخل کیے ہوں جتنے اردو نے کیے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اتنی کثیر

تعداد میں مختلف زبانوں کے الفاظ کے داخل ہونے کی باوجود اس کے بنیادی ڈھانچے میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوئی اور نہ ہی دوسری زبانوں کے الفاظ پر اردو کے قواعد کو لاگو کرنے میں کوئی مشکل پیش آئی ہے۔

قواعد کی بات آئی تو اس بارے میں بھی کچھ امور کی وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ قواعد دراصل کسی بھی زبان کو بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتے ہیں، اپنے موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے جب دیگر زبانوں اور خاص طور پر انگریزی زبان کے الفاظ کے اردو میں آنے اور اردو قواعد کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انگریزی کے بہت سے الفاظ اردو میں آنے کے بعد ان پر اردو قواعد بڑی آسانی سے اسی طرح لاگو ہو رہے جیسے اردو کے اپنے الفاظ پر لاگو ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قواعد کے اعتبار سے وہ لفظ اردو کے ہی بن کر رہ گئے ہیں۔ مثلاً واحد کے جمع بنانے کے حوالے سے اگر ہم دیکھیں تو انگریزی سے اردو میں آنے والے الفاظ کی جمع بھی اردو ہی کے قواعد کے اعتبار سے بنائی جاتی ہیں جبکہ انگریزی میں ان کی جمع کے لیے اور الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں چند مثالیں بات کو واضح کرنے کے لیے پیش کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی کا لفظ(College)اردو زبان میں بھی کثرت سے مستعمل ہے

لیکن جب اس کی جمع بنائی جائے گی تو انگریزی میں ’کالجز‘ (Colleges) بنے گی جب کہ اردو قواعد کے حوالے سے اس کی جمع ’کالجوں‘ بنتی ہے اور اردو میں کالجز کی بجائے کالجوں ہی مستعمل ہے کیوں کہ یہ اردو قواعد کے مطابق جمع کا صیغہ بنا ہے اسی طرح یونی ورسٹی (University) سے یونیورسٹیز(Universities) کی بجائے اردو میں ’یونی ورسٹیاں یا یونی ورسٹیوں‘ استعمال ہوتا ہے، کلاس (Class) کی جمع کلاسز(Classes) کی بجائے ’کلاسوں‘ ، سکول(School) کی سکولز(Schools) کی بجائے ’سکولوں‘، کاپی (Copy) کی جمع کاپیز(Copies) کی بجائے کاپیاں یا کاپیوں کی جاتی ہے اس طرح کی اور بے شمار مثالیں ملتی ہیں جن میں انگریزی لفظ اپنی صوتی صورت میں تو اردو میں انگریزی ہی کی طرح بولا جاتا ہے لیکن جب اس پر قواعد لاگو کیے جاتے ہیں تو وہ انگریزی کی بجائے اردو کے قواعد کے مطابق ڈھلتا چلا جاتا ہے جس سے اس کی صوتی صورت بھی تبدیل ہو جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ بلاشبہ اردو پر انگریزی کے اثرات کا نتیجہ تو ضرور ہیں لیکن اب وہ الفاظ اردو کے ہی گردانے جائیں گے۔ قواعد اور بنیادی ڈھانچے کے حوالے سے مولوی عبدالحق کی رائے خاصا وزن رکھتی ہے۔

"بعض غیر زبانوں کے اسمائے صفات کے اضافے سے اس کے ہندی (یہاں ہندی سے مراد اردو ہی ہے) ہونے میں مطلق فرق نہیں آسکتا۔ مثلاً آج کل بہت سے انگریزی لفظ داخل ہوتے جاتے ہیں لیکن اس سے زبان کی اصلیت وماہیت پر کوئی فرق نہیں پڑ سکتا"(۱۹)

اردو میں انگریزی زبان کے الفاظ کا بلا سوچے سمجھے دخول اور وہ بھی خاص طور پر اس وقت جب ان الفاظ کے اپنے مستعمل اردو متبادل موجود ہوں، بعض ناقدین اور ماہرین لسانیات کے نزدیک درست بھی نہیں۔ اکثر ماہرین لسانیات اس حوالے سے اعتدال کی راہ اپنانے پر زور دیتے ہیں۔ اس بارے میں رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں۔

"اردو میں انگریزی الفاظ بکثرت داخل کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے، اسی طرح وہ انگریزی الفاظ جو اردو میں داخل اور مستحکم ہو گئے ہیں ان کو خارج کرنا بھی اندیشے سے خالی نہیں"(۲۰)

ان آراء کی روشنی میں دیکھا جائے تو بعد میں آنے والی نسلوں نے اس اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جس کی وجہ سے اردو پر انگریزی کے اثرات گہرے ہوتے چلے گئے۔ انھی اثرات کا نتیجہ ہے کہ آج ہم کسی چھوٹے سے بازار سے بھی گزریں اور دکانوں کے اشتہاری بورڈ پڑھیں تو سینکڑوں میں سے کوئی ایک آدھ ایسا نظر آئے گا جو اردو میں ہو ورنہ مختلف پیشہ وروں نے خود انگریزی سے مرعوب ہو کر دوسروں کو مرعوب اور اپنی طرف راغب کرنے کے لیے انگریزی کا بے تحاشہ استعمال کر رکھا ہوتا ہے۔ آج 'حجام' کی دکان پہ ہمیں 'ہیئر ڈریسر' (Hair dresser)، بزاز کی دکان پر 'کلاتھ مرچنٹ' (Cloth Merchant)، بساطی کی دکان پر 'جنرل سٹور' (General Store) اور دھوبی کی دکان پر 'ڈرائی کلینر' (Dry Cleaner) کے بورڈ لگے نظر آتے ہیں۔

اردو پر انگریزی کے اثرات نے سماجی سطح پر بھی خاصی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ آج گلی، محلے اور قصبے ختم ہوتے جا رہے ہیں جب کہ ان کی جگہ سٹریٹ(Street)، سیکٹر (Sector) اور ٹاؤن (Twon) نے لی ہے۔ اب کالونیوں اور سکیموں کا رواج چل نکلا ہے۔ اسی طرح مختلف کھیلوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، گولف، بیڈ منٹن، ٹیبل ٹینس، بلئیرڈ، سنوکر اور ویڈیو گیمز تو رائج تھے اب ان کھیلوں کے ملبوسات میں بھی انگریزی کا استعمال بہت زیادہ نظر آنے لگا۔ اب ٹراؤزر، سکرٹ، سویٹر، کوٹ، ہاف

سلیو، شارٹس وغیرہ پہننے کا رواج عام ہونے کے ساتھ ساتھ ان ملبوسات کے یہ نام ہی معاشرے میں رائج ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اور ان ملبوسات کو تیار کرنے والی درزی اب ٹیلر ماسٹر لکھے، پڑھے اور بولے جارہے ہیں۔

انگریزی زبان کے الفاظ کو اردو میں داخل کرنے کا جو رواج دورِ سرسید میں چلا تھا یوں معلوم ہوتا ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ اور میڈیا کے توسط سے وہ اب ایک بار پھر پورے زوروشور سے جاری ہو چکا ہے۔ انگریزی معاشرت میں چوں کہ خاندانی نظام کی کوئی خاص اہمیت نہیں اور نہ ہی وہاں مشترکہ خاندانی نظام (Joint Family System) اس طرح رائج ہو پایا ہے جیسا ہمارے ہاں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس مشترکہ خاندانی نظام میں مختلف رشتوں کی اپنی پہچان اور انفرادیت ہوتی ہے اسی انفرادیت اور اہمیت کی بنا پر ہر رشتے کا اپنا ایک مخصوص نام ہے جو رشتے کی پہچان کرواتا ہے لیکن انگریزی معاشرت میں مشترکہ خاندانی نظام نہ ہونے کی وجہ سے رشتوں کی انفرادیت اور اہمیت ایسی نہیں جیسی ہمارے ہاں ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں رشتوں کو مختلف ناموں سے پکارے جانے کا رواج نہیں۔ وہاں چچا، ماموں، تایا، خالو حتیٰ کہ کسی انجان کو بھی محض 'انکل (Uncle) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسی طرح چچازاد، ماموں زاد، خالوزاد وغیرہ کی انفرادیت سے قطع نظر محض 'کزن' (Cousin) کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ سے انگریزی سے مرعوبیت کا جو رواج ادھر بھی چل نکلا ہے اس کے زیرِ اثر اب ہمارے سماج میں رشتوں کے مخصوص ناموں کی بجائے محض 'انکل'، آنٹی' اور 'کزن' کو رواج دیا جارہا ہے۔ دیکھا جائے تو اس رواج کی بڑی وجہ اردو کی تنگ دامنیا تنگ دستی نہیں بلکہ سماج میں انگریزی سے مرعوبیت کا رجحان ہے جو ایک طرف تو رشتوں کی پہچان چھینتا چلا جارہا ہے تو دوسری طرف اردو پر انگریزی کے اثرات کو مزید گہرا کرتا چلا جارہا ہے۔

اردو پر انگریزی کے اثرات کو رواج دینے میں ایک اہم عنصر میڈیا کا بھی ہے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ میڈیا کی تیز ترین ترقی کی بدولت ہماری روزمرہ کی بول چال میں بے شمار الفاظ ایسے استعمال ہو رہے ہیں جن کا متبادل اردو لفظ نہ صرف موجود ہوتا ہے بلکہ اپنی صوتی اور معنوی صورت میں اردو میں مستعمل بھی ہوتا ہے۔ لیکن میڈیا پر بیٹھے اینکر پرسنز اور دیگر تجزیہ کاروں کے تجزیوں میں استعمال ہونے والی انگریزی تراکیب و الفاظ عوام کو بھی اس طرف راغب کیے جارہے ہیں۔ آج ہمارے سیاست دان "ہارس ٹریڈنگ" کرتے ہیں۔ "فلور کراسنگ" اپنا رنگ جمارہی ہے۔ "کرپشن" کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ سفارتکار "بیک ڈور ڈپلومیسی" کر رہے ہیں۔ "ڈیموکریسی" سب سے بہتر انتقام ہے۔ یہ اور اس طرح کے دیگر بے شمار تجزیے جو

دن رات جاری رہتے ہیں ان کو دیکھ اور سن کر مجموعے طور معاشرے میں یہ الفاظ رائج ہوتے چلے جارہے ہیں۔ عہد سرسید میں میڈیا اتنا تیز نہیں تھا لیکن انگریزوں کے یہاں اس خطے میں موجود ہونے اور اور لوگوں کے ساتھ براہ راست بات چیت سے انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہوتے چلے گئے تھے جب کہ آج کے ترقی یافتہ دور کے تیز ترین میڈیا اور ذرائع ابلاغ نے یہ فریضہ سنبھالا ہوا ہے۔ عمیق نظر سے دیکھا جائے تو تو عہدِ سرسید اور موجودہ دور میں انگریزی کے الفاظ کو بے جا طور پر اردو میں داخل کیے جانے کے اسباب دونوں جگہ پر یکساں ہی ملتے ہیں۔ دونوں جگہ پر بڑی وجہ انگریزی سے مرعوبیت ہے۔

میڈیا کے علاوہ ایک اور اہم عنصر جو اردو پر انگریزی کے اثرات کو گہرا کرتا چلا جارہا ہے وہ ہے اشیائے خورونوش کی تیاری اور فراہمی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ اردو میں انگریزی کے الفاظ کا داخل ہونا اور اردو پر انگریزی کے اثرات پڑنے کی بڑی وجہ اردو کی تنگ دامنی نہیں بلکہ اردو بولنے والے باشندوں کی مغربی کلچر سے مرعوبیت کا نتیجہ ہے، اسی تناظر میں دیکھا جائے تو آج ہر چھوٹے بڑے شہر میں بے شمار طعام گاہیں ایسی ملیں گی جن کے اشتہاری بورڈز سے لے کر کھانے پینے کی اشیاء کے نام تک انگریزی میں چھپے ملیں گے۔ اس کے علاوہ بعض عالمی سطح کی خوردونوش کی کمپنیوں کی شاخیں اس خطے میں قائم ہونے سے جہاں ایک طرف روزگار میں اضافہ ہورہا ہے وہیں زبان کے معاملے میں بھی تبدیلیاں واقع ہوتی چلی جارہی ہیں۔ اب آپ کو کسی بڑے شہر کو جانے والی سڑک کے کنارے رہنمائی کے لیے لگے بورڈوں پر تو شاید "طعام گاہ" کے الفاظ نظر آجائیں تو آجائیں لیکن جوں ہی شہر میں داخلہ ہوگا طعام گاہیں غائب ہوتی چلی جائیں گی اور ان کی جگہ پہلے "ہوٹل" اور اب "ریسٹورنٹ" نے لی ہے۔ نانبائیوں کی جگہ "بیکرز" لکھنے پڑھنے اور بولنے کا رواج اس قدر بڑھ چکا ہے کہ نانبائی پس پشت ڈال دیا گیا ہے۔ اور پھر ان "ریسٹورنٹ" میں پیش کی جانے والی مختلف "ڈشز" نے اصل اردو الفاظ کو نکال باہر کرکے خود اس طرح جگہ بنالی ہے کہ اردو کے ہی ہو کر رہ گئے ہیں۔

ایک وقت تھا کہ اشیائے خوردونوش میں اتنی جدت نہیں آئی تھی۔ گھر میں روٹی اور سالن پکتا تھا۔ ہنڈیا کے اندر پکنے کے لیے جو چیز بھی ڈال دی جاتی پکنے کے بعد وہ محض سالن ہی کہلاتی یا زیادہ سے زیادہ اس پکی ہوئی دال، سبزی یا گوشت کا نام لے لیا جاتا تھا۔ پھر زمانہ بدلا اور نئے نئے "ریسٹورنٹ" کھلتے چلے گئے، اور محض روٹی سالن سے اڑان بھرتے ہوئے کھانوں نے "فاسٹ فوڈز"، برگر۔ شوارما، ڈونٹ، پیزا اور دیگر نام اختیار کر لیے اور وہی روٹی سالن ان ریستورانوں میں پہنچ کر ہزاروں ناموں میں ڈھلتے چلے گئے۔ دیکھا دیکھی یہ رواج اس قدر چل نکلا کہ آج گھر بیٹھے ایک فون کال پر محض ایک نام بتادینے سے چند لمحوں بعد اسی علاقے کی اجناس

سے تیار کردہ خوراک کی کوئی بھی قسم اپنے انگریزی نام کے ساتھ گھر پہنچ جاتی ہے۔ خوردونوش کی بات چلی تو یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اب خوردونوش کے اوقات کا تعین بھی دیکھا دیکھی انگریزی میں ہونا شروع ہو گیا ہے۔ پہلے ناشتہ، دوپہر کا کھانااور رات کا کھاناہوتے تھے جب کہ اب بریک فاسٹ(Break fast)، لنچ (Lunch)اور ڈنر(Dinner)زبانِ زد عام ہو گئے ہیں۔ اس سب کی وجوہات تلاش کرنے کی اگر سعی کی جائے تو نو آبادیاتی عہد میں اردو میں انگریزی الفاظ کے رواج پانے اور آج کے عہد میں ان کے رواج پانے کے اسباب مشترکہ ہی ملتے ہیں۔ نو آبادیاتی عہد میں یہاں کے باشندے برطانیہ اور یورپ برائے حصول علم جاتے تھے اور جب وہاں سے واپس لوٹتے تو علم کے ساتھ وہاں کا کلچر اور زبان بھی اپنی زبان مین شامل کر کے لاتے اور دوسری طرف نو آبادکاروں کے یہاں اس خطے میں آنے اور عوام سے براہ راست تعلق پیدا ہونے سے انگریزی الفاظ اردو میں داخل ہوئے۔ آج کے دور میں دیکھا جائے تو بھی یہ دو بڑی صورتیں نظر آتی ہیں، آج بھی یہاں سے بہت سے افراد بیرون ملک تعلیم یا کاروبار کی غرض سے جارہے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو انگریزی آمیز اردو بولنے پر فخر کرنے کے ساتھ ملبوسات اور طرزِ زندگی میں بھی انگریزیت اختیار کر کے خود کو معاشرے میں معزز اور معتبر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری طرف بہت سی عالمی کمپنیوں نے نہ صرف کاروباراور دفاتر یہاں قائم کیے ہوئے ہیں بلکہ مختلف صورتوں میں وہ عوام سے بہت قریبی تعلق بھی رکھتے ہیں جس کی وجہ عام آدمی کی اردو بھی انگریزی کے اثرات قبول کرتی چلی جارہی۔

اردو پر انگریزی کے ان اثرات کو دیکھا جاے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ زبان کے معاملے میں یہ اثرات عامۃ الناس کے مقابلے میں خواص پر زیادہ ہیں۔ عوام تو ایک طرح سے خواص کی بھونڈی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو قوم کا نابغہ بھی ان اثرات کی زد میں چلا آرہاہے۔ ہمارے ارباب اختیار اور دانشوروں کے نزدیک ترقی اور خاص طور پر علمی وادبی ترقی کا راز انگریزی میں پوشیدہ ہے یہی وجہ ہے کہ پہلی جماعت سے لے کر گریجویشن تک انگریزی کو لازمی کرنے کے بعد دیگر مضامین کے نصاب بھی انگریزی میں تیار کیے جارہے۔ یہ عمل ایک طرف تو اپنی زبان کو پس پشت ڈالنے کے مترادف ہے تو دوسری طرف اپنی آئندہ نسل کو اپنے کلچر، تہذیب اور شاندار روایات سے بے بہرہ کرنے میں بھی خاصے عمل دخل کا سبب بنے گا۔ انگریزی کی اہمیت تجارتی اور دیگر عالمی امور کے حوالے سے اپنی جگہ لیکن محض گلوبلائزیشن کی دوڑ میں شمولیت کی آڑ میں بن سوچے سمجھے زمینی حالات کو نظر انداز کر کے ہر معاملے میں اس کو ترجیح دینا بھی

سود مند نہیں۔ادبی حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں بھی اردو پر انگریزی کے اثرات خاصے توانا نظر آتے ہیں۔ادب میں جدیدیت کے نام پر دیکھا دیکھی بے تحاشہ انگریزی اثرات قبول کیے گئے۔

i: اُردو اور پنجابی کے لسانی اور ثقافتی اشتراکات

اردو اور پنجابی کے لسانی اشتراکات کو جاننے کے لیے ہمیں تاریخ میں سفر کرنا پڑتا ہے اور یہ دیکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ان دونوں زبانوں کا آغاز کب اور کیسے ہوا اور کن کن علاقوں میں یہ اکٹھی پروان چڑھیں جس کی وجہ سے ان دونوں میں لسانی سطح پر اشتراکات سامنے آئے۔

لسانی اشتراکات اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب دونوں زبانیں ایک ہی وقت میں ایک ہی خطے میں تواتر کے ساتھ بولی جاتی ہوں۔ بول چال کے دوران میں ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔ یہ شمولیت دوطرفہ ہوتی ہے۔یعنی دونوں زبانیں ایک دوسرے کے الفاظ کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہیں جس کی وجہ سے ایک طرف ان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوتا جاتا ہے تو دوسری طرف بعض ایسے الفاظ بھی سامنے آتے ہیں جو دونوں زبانوں کے بولنے والوں کا مافی الضمیر مشترکہ طور پر ادا کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ایسے مشترک الفاظ ہی آگے چل کر لسانی اشتراکات کا باعث بنتے ہیں۔

اردو اور پنجابی دونوں پنجاب کے علاقے میں پروان چڑھیں۔پنجاب کی دھرتی نے ان دونوں زبانوں کے ارتقامیں اہم کردار ادا کیا۔پنجاب کی تاریخ کے حوالے سے دیکھا جائے توہندوؤں کی مقدس مذہبی کتاب رگ وید میں سات دریاؤں کی سرزمین کا ذکر ملتاہے۔بعدمیں یہ علاقہ پنجاب کے نام سے مشہور ہوا:

> "پنجاب کا لفظ خود ہماری یعنی ہندوپاک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جہانگیر کے عہد ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء میں استعمال ہوا ہے۔اور غالباًوہی پہلا شخص ہے جو اپنی توزک میں اس لفظ کو استعمال کرتا ہے۔"(۲۲)

پنجابی، پنجاب ہی کی زبان ہے، یہیں کی پیداوار ہے اور ارتقاء کی منازل بھی اسی علاقے میں طے کیں۔ یہاں پنجاب سے مراد صرف پاکستانی پنجاب نہیں بلکہ ہندوستانی پنجاب بھی ہے۔یہ زبان اس خطہ میں سب سے زیادہ سمجھی اور بولی جاتی ہے۔پاکستان میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کی بیشتر اقدار ایک جیسی ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق ہند آریائی خاندان سے ہے۔اس لیے ان کا منبع اور مآخذ ایک ہی ہے۔اس بات کا اندازہ ہم اس طرح کرسکتے ہیں کہ پاکستان میں بولی جانے والی ایسی زبانیں جن کے بولے جانے والے علاقے کا جغرافیائی لحاظ سے کافی فاصلہ ہے۔ان زبانوں میں بیک وقت ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کا مآخذ ایک ہے۔ان تمام زبانوں

نے ایک جیسے ماحول میں پرورش پائی اور تقریباً ایک جیسے ماحول میں پروان چڑھیں۔ اس لیے ان زبانوں کا آپس میں لسانی و لغوی اشتراک پایا جاتا ہے۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پنجابی اور اُردو کا تعلق بھی ایک ہی خاندان سے ہے۔ ان دونوں زبانوں کے لسانی ڈھانچے بھی تقریباً ایک جیسے ہیں۔ اُردو کے حوالے سے ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> "گزشتہ بارہ سو سال کے معلوم سفر کے دوران میں نہ صرف برصغیر پاک و ہند کی کم و بیش سب زبانوں کی خصوصیات کو جذب کیا ہے بلکہ بیرونی زبانوں مثلاً فارسی، عربی، ترکی، یونانی، پرتگالی اور انگریزی وغیرہ سے بھی خوب خوب استفادہ کیا ہے۔"(۲۳)

گیارھویں صدی عیسوی جدید ہند آریائی زبانوں کے اُبھرنے کا زمانہ ہے۔ اس دور میں بہت سی زبانوں نے اپنے مخصوص دائروں سے نکل کر دوسری زبانوں کے اثرات سے نئی شکل اختیار کی۔ یہی دور اُردو کی پیدائش کا بھی دور ہے۔ اس دور میں یہاں مسلمانوں کی حکومت تھی جنہوں نے اس کی خوب آؤ بھگت کی اور اسے مزید نکھرنے میں کافی مدد دی۔ اُردو، عربی اور فارسی سے مدد لے کر پروان چڑھی اور اس میں سنسکرت کے الفاظ نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ سنسکرت کی مداخلت کی بدولت اُردو دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ہندی اور اُردو۔ بظاہر یہ دونوں زبانیں ایک جیسی ہیں لیکن ہندی پر سنسکرت کے اثرات زیادہ گہرے ہیں اور ان دونوں کا اصل فرق رسم الخط کا ہے۔ اُردو عربی رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہے جبکہ ہندی دیوناگری رسم الخط میں یعنی دونوں زبانوں کا ادبی روپ مختلف ہے۔

برصغیر میں انگریزوں کی آمد نے جہاں اس خطے کے ثقافتی اور سماجی منظرنامے میں تبدیلیاں پیدا کیں وہاں لسانی اور ادبی حوالے سے بھی خاصا تغیر رونما ہوا۔ اردو بھی اس تغیر کے دھارے میں بہتی چلی گئی۔ اُردو زبان کا یہ روپ انگریزوں کے یہاں آنے کے بعد استوار ہوا۔ ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہندی ہندوستان کی اور اُردو پاکستان کی قومی زبان بنی۔ اُردو کے آغاز کے بارے میں ہندوستان کے بیشتر علاقوں کے لکھنے والوں کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ اُردو نے ان کی سرزمین سے جنم لیا ہے۔ کسی نے اُردو کا ہیولہ سندھ کو کہا تو کسی نے پنجاب سے اس کا خمیر اٹھایا۔ کسی نے دکن میں اس کا ہیولہ تیار کیا تو کسی نے گجرات کو اس کی جنم بھومی قرار دیا۔ کسی نے اسے اکبر بادشاہ اور شاہجہان کے دربار اور لشکر میں اس کی پیدائش کا کھوج لگایا تو کسی نے برج بھاشا سے اس کو نکالا۔ یہ اور اس طرح کے کئی نظریے پاکستان کے مختلف علاقوں میں اُردو کی مقبولیت کو ظاہر کرتے ہیں۔

۱۹۰۳ء میں پنجاب سے بھی اسی حوالے سے کام کا آغاز ہوا کہ اُردو نے پنجاب کی زرخیز سرزمین سے جنم لیا ہے۔ اس دور میں یہ دعویٰ درست معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اسی لیے اہل زبان نے اس کی سخت مخالفت کی مگر محققین نے پرانے مخطوطات کو سامنے لاتے ہوئے اپنے اس دعوے کی تائید میں کئی ثبوت پیش کر دیئے۔ ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اُردو" لکھی اور پنجاب کو اُردو کی جنم بھومی ثابت کرنے کے لیے دلائل مہیا کئے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "غزنویوں کے قبضے میں تمام پنجاب، سندھ اور ملتان تھا۔ ہانسی، سرسیتی اور میرٹھ تک ان کے قبضے میں تھے۔ بلکہ یوں کہیے دہلی کے قریب تک پھیلے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے علاقے کے مالی و ملکی انتظام کے لیے عمال کو اس ملک کی زبان سیکھنی ضروری تھی۔ چونکہ لاہور ہند کا دارالسطنت تھا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس خطے کی زبان کو اس عہد کی حکومت اوپر مسلمانوں نے ترجیح دی ہوگی۔ یہ خیال کرنا کہ جب تک مسلمان پنجاب میں آباد رہے۔ انہوں نے کسی ہندی زبان سے سروکار نہ رکھا اور جب دہلی گئے تب برج بھاشا اختیار کی، ایک ناقابلِ قبول خیال ہے۔"(۲۴)

حافظ محمود شیرانی کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک تو زبان کی ترویج کے لیے سماجی ضروریات نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ غزنیوں کو حکمرانی کرتے ہوئے وسیع خطے پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے کے لیے اس خطے کی تمام زبانوں سے آشنائی حاصل کرنا ضروری تھا۔ دوسری طرف وہ اس بات کی تردید بھی کرتے ہیں کہ پنجاب میں مسلمانوں کی موجودگی کے عہد میں وہ اردو سے نابلد تھے۔ اپنے اس دعوے کی تائید میں ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> "دلچسپی کا امر یہ ہے کہ غیاث الدین پنجابیوں کے لشکر کے ساتھ دہلی میں میں داخل ہوتا ہے جس نے وہاں آباد ہو کر دہلی کی زبان پر بے حد اثر ڈالا ہوگا اور دہلی کے کوچہ و بازار میں ہر طرف پنجابی بولنے والے نظر آتے ہوں گے۔ جب نارمنوں کی فتح نے انگریزی زبان پر ایک نہ مٹنے والا اثر ڈالا اور ہمیشہ کے لیے اس کی رفتار کو بدل دیا تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ دہلی پر ان پنجابیوں نے کس قدر اثر ڈالا ہوگا۔"(۲۵)

حافظ محمود شیرانی کے اس نظریے نے بہت مقبولیت حاصل کی اور بہت سے اہل علم نے اس کو درست جانا۔ انھوں نے استدلال کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ اردو پنجاب میں پروان چڑھی اور پنجاب ہی اس کا اصل گھر ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اس نظریے کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حافظ محمود شیرانی کا یہ استدلال بہت مضبوط ہے کہ شمال مغرب سے آنے والے مسلمانوں کی اولین فرودگاہ پنجاب تھا۔ ان کا قیام بھی اسی خطے میں ہوا اور پھر یہیں سے وہ فاتحانہ حیثیت میں دہلی کی طرف بڑھے۔ چنانچہ زبانوں کا طویل اختلاط اسی خطے میں عمل میں آیا اور یہیں سے اس زبان نے وسطی اور جنوبی ہند کی طرف سفر کیا۔"(۲۶)

اردو نے پنجاب سے دہلی اور لکھنؤ کا رخ کیا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ پنجاب میں اُردو زبان کا جو ہیولہ تیار ہوا وہ مسلم حکمرانوں کے ساتھ دہلی اور لکھنؤ میں پہنچا۔ دہلی اور لکھنؤ دونوں ایسے علاقے ہیں جنہوں نے اُردو ادب کی ترویج اور ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

"مسلم حکمرانوں کے عہد میں دہلی (اور کچھ عرصے کے لیے لکھنؤ) دارالحکومت رہنے کی وجہ سے یہ شہر تہذیب و تمدن اور ادب و شائستگی کا گہوارہ بنے رہے۔"(۲۷)

اردو نے دہلی پہنچ کر اپنا خوب رنگ دکھایا اور خوب ترقی کی۔ دہلی میں اسے خوب ارتقا اور پذیرائی نصیب ہوئی۔ اس ارتقا اور پذیرائی کے بعد جب اردو نے لکھنؤ کا رخ کیا تو یہاں بھی اسے کامیابی ملی۔ لکھنؤ میں اردو ادب کی ترقی کے حوالے سے عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

"دہلی کے مشہور داستان گو لکھنؤ میں آنا شروع ہوئے۔ یہاں افینیوں نے ان کی یہاں تک قدر کی کہ داستان سننے کو اپنی صحبتوں کا ایک عنصر اعظم قرار دے دیا۔ چند ہی روز میں لکھنؤ کے اندر اس کو اس قدر فروغ ہو گیا کہ کوئی دولت مند نہ تھا جس کی سرکار میں داستان گو نہ مقرر ہو۔۔۔۔۔اور ان کی طرزِ تقریر کا اثر عوامِ شہر کی زبانوں پر بے حد پڑ گیا۔"(۲۸)

عبدالحلیم شرر کے اس بیان کو دیکھا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں اردو زبان کی ترقی میں مقامی عناصر کے ساتھ ساتھ بیرونی عناصر نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ یہ بیرونی عناصر ہی تھے جنہوں نے لکھنؤ کی ٹھہری ہوئی زندگی میں لسانی حوالے سے تحرک پیدا کیا اور اس تحرک نے لکھنؤ میں اردو کی ترویج کی راہ ہموار

کی۔ لکھنؤ میں ان بیرونی عناصر کے طفیل اردو نے ترقی کی کئی منازل طے کیں۔ اُردو زبان کی لکھنؤ میں ترقی کے حوالے سے عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں:

"اُردو زبان کو جو ترقیاں لکھنؤ میں حاصل ہوئیں وہ شاعروں، ادیبوں، نثاروں اور مصنفوں تک محدود نہیں ہیں مختلف سوسائٹیوں اور طبقوں میں ترقی و وسعت زبان کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوئیں۔ جنہوں نے ہر گروہ والوں کے لیے خاص دلچسپیاں پیدا کیں۔"(۲۹)

دہلی اور لکھنؤ میں اُردو زبان نے ٹھیک رنگ وروپ نکالا اور ایک مضبوط زبان کے طور پر سامنے آئی۔ یہاں کے ادیبوں نے اس کی نوک پلک کو خوب سنوارا۔ ان علاقوں کی تہذیب و معاشرت کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے اُردو نے دوبارہ پنجاب کا رُخ کیا۔

"۱۸۵۷ء کے بعد دہلی، لکھنؤ اور دیگر علاقوں کے تباہ حال شرفاء اور تعلیم یافتہ مگر بے کار نوجوانوں کے لیے پنجاب نے ایک طرح سے دوبئی کی صورت حال اختیار کر لی تھی کہ اس عہد کے بعض لٹے پٹے شرفاء نے لاہور میں ملازمت اور عافیت پائی۔"(۳۰)

اس طرح بہت سے ادیب لاہور میں آ کر آباد ہوئے اور یہاں اپنی تحریروں اور دوسری زبانوں سے تراجم کے ذریعے اُردو کے ذخیرۂ الفاظ میں خوب اضافہ کیا۔

"حقیقت تو یہ ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے تہذیبی سقوط کے بعد لاہور میں جدید خیالات اور تصورات نو کے چراغ فروزاں ہوئے۔ ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کے منظوم مشاعرے اس انداز کی اوّلین مساعی تھے۔ ۱۹۰۱ء میں مخزن کا اجراء علامہ اقبال کی شاعری اور پھر فیض، راشد اور میرا جیجیسی شخصیات، الغرض برصغیر میں تخلیقی سطح پر فکرِ نو کی ہر تحریک کا بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر پنجاب ہی سے تعلق نظر آتا ہے۔"(۳۱)

یوں حافظ محمود شیرانی کی دلیل اور بھی مضبوط ہو جاتی ہے کہ پنجابی بیرونی حملہ آوروں کے ساتھ میل ملاپ کے بعد دہلی گئی اور پھر دہلی کی مقامی زبانوں کے اختلاط سے جو نئی زبان وجود میں آئی وہ اُردو ہے۔ اُردو اور پنجابی میں جو یک جہتی اور یک رنگی پائی جاتی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان کی تاریخ مشترک ہے۔ پہلے وہ ایک تھیں پھر جب علیحدہ ہوئیں تو ایک جیسے مراحل اور عوامل سے گزریں اور ارتقائی منازل بھی ہاتھ پکڑ کر

طے کیے۔ اب علیحدہ علیحدہ زبانیں ہونے کے باوجود ان کے درمیان مضبوط تعلق پایا جاتا ہے جس کا ہم کئی سطحوں میں جائزہ لے سکتے ہیں۔

سب سے پہلا تعلق خاندانی اور نسلی تعلق ہے۔ ان کی لسانی تاریخ پر نظر ڈالیں تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مورثِ اعلیٰ ایک ہے۔ ماہرِ لسانیات کا کہنا ہے کہ یہ دونوں زبانیں "ہند آریائی" خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ آج سے تقریباً ساڑھے تین ہزار سال پہلے آریہ قبائل برصغیر کے مختلف علاقوں میں آکر آباد ہوئے۔ چونکہ وہ مختلف گروہوں میں مختلف راستوں سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے اس لیے ان کے آپس کی زبان میں ہی کافی فرق آ گیا تھا۔ اسی اختلاط سے نئی زبانوں کا جنم ہوا۔

اُردو اور پنجاب کا دوسرا اہم تعلق وطن کا ہے۔ حسب و نسب کے بعد وطن کا تعلق بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دونوں جب علیحدہ ہوئیں تو ایک ہی وطن میں وقت گزارا لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے سے بالکل مختلف زبانوں کے طور پر اُبھریں۔ حالانکہ دونوں یہیں کی زبانیں ہیں۔ یہی پیدا ہوئیں، یہیں پروان چڑھیں اور صدیوں تک یہیں آباد رہیں۔ اسی لیے ان زبانوں میں جو مشترک لسانی خوبیاں کا ہونا کوئی حیران کن بات نہیں۔

اُردو اور پنجابی کے درمیان تیسرا اہم تعلق تہذیبی ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کی زبان (عربی اور فارسی) کا میل بھی یہاں کی زبانوں سے ہوا۔ اس طرح مسلم تہذیب نے اپنا اثر یہاں کی تہذیب و زبان پر بھی ڈالا۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے یہاں تسلط قائم کرنے سے انگریزی تہذیب کا بھی اس پر کافی زیادہ اثر انداز ہوئی۔ اس طرح اُردو اور پنجابی پر ایک جیسے تہذیبی اثرات مرتب ہوئے۔ ان میں سب سے پہلے اثرات عربی کے تھے پھر فارسی اور اس کے بعد انگریزی اثرات تھے۔ اس کے بعد ان دونوں زبانوں نے ایک دوسرے پر بھی اثرات مرتب کئے اور مقامی زبانوں کا اثر بھی قبول کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر حمید اللہ ہاشمی لکھتے ہیں:

> "پنجابی اور اُردو بنیادی طور پر ایک ہی کنبے سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کے لسانی سانچے بھی تقریباً ایک سے ہیں۔ پنجابی اور اُردو کی صرف و نحو میں بھی مماثلتیں پائی جاتی ہیں اور ذخیرہ الفاظ بھی بہت حد تک مشترک ہیں۔"(۳۲)

اردو اور پنجابی کے اس مشترکہ تاریخی اور تہذیبی تناظر نے ان دونوں زبانوں میں کئی حوالوں سے اشتراک پیدا کیا۔ دونوں زبانوں کے بہت سے الفاظ کے ساتھ ساتھ تذکیر و تانیث اور دیگر قواعد کے حوالے

سے بھی خاصی لسانی ہم آہنگی سامنے آئی۔ ذیل میں ان امور کا جائزہ لیا جاتا ہے جن میں اردو اور پنجابی میں لسانی حوالے سے خاصا اشتراک پایا جاتا ہے۔

(۱) حروف تہجی

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد موجود پنجابی ادب نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ مسلمان اپنے ساتھ جو زبانیں لائے تھے جن میں عربی، فارسی اور ترکی شامل ہیں۔ ان تینوں زبانوں کی آمیزش سے نئی زبان کی تخلیق کا آغاز ہوا۔ شروع میں عربی کے اصوات کو استعمال کیا جاتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں چار حرفوں پ، چ، ڑ اور گ کا اضافہ ہو گیا۔ بہت عرصے تک پنجابی کے لیے عربی رسم الخط ہی استعمال ہوتا رہا۔ جب اُردو ادب کا آغاز ہوا تو اس رسم الخط میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ پنجابی نے بھی ان تبدیلیوں سے استفادہ کیا۔ اس طرح اگر غور کریں تو اب پنجابی کا رسم الخط اور حروفِ تہجی وہی ہیں جو اُردو میں مستعمل ہیں۔ پنجابی کے کچھ ماہرین نے اس سلسلے میں کافی کوشش کی کہ چند الفاظ کی تبدیلی سے ہی پنجابی اور اُردو کے حروفِ تہجی کو جدا کر دیا جائے لیکن ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔

(۲) صوتی اشتراکات

پنجابی اور اُردو میں نمایاں صوتی اشتراک موجود ہے۔ کیونکہ دونوں زبانوں میں بنیادی قرابت، مشابہت اور مماثلت پائی جاتی ہے اور ان میں سے سب سے پہلا اشتراک تلفظ کا ہے۔ پنجابی بولنے والے لوگ آسانی سے اُردو کے تلفظ ادا کر سکتے ہیں اور اسی طرح اُردو بولنے والے پنجابی کا تلفظ ادا کر سکتے ہیں لیکن دیگر زبانوں کا اُردو سے اس طرح کا اشتراک نہیں ہے۔ مثلاً پشتو بولنے والا شخص جب اُردو سیکھتا ہے تو وہ پنجابی بھی بولنے کی کوشش کر لیتا ہے اور سمجھ بھی لیتا ہے لیکن ایک پنجابی کو اُردو آنے کے باوجود وہ پشتو کا تلفظ درست ادا نہیں کر سکے گا۔ کیونکہ اُردو اور پنجابی میں صرفی و نحوی مماثلت اور مطابقت بھی پائی جاتی ہے۔ اور ان دونوں زبانوں کا ذخیرہ الفاظ بھی ملتا جلتا ہے۔ اسی لیے ان دونوں زبانوں میں یکساں خوبیاں موجود ہیں۔

اُردو اور پنجابی کے صوتیاتی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ چونکہ ان دونوں پر ایک ہی طرح کی بیرونی زبانوں کے الفاظ شامل ہوئے ہیں۔ اس لیے ان میں ایک جیسی ہی آوازوں کا اضافہ ہوا ہے۔ صرف کہیں کہیں معمولی سا فرق نظر آتا ہے۔ چند ایسی اصوات ہیں جو صرف اہل پنجاب کے لیے ہی مخصوص ہیں۔

(۳)ذخیرہ الفاظ

پنجابی اور اُردو کا ذخیرہ الفاظ بھی کافی حد تک مشترک ہے۔ اُردو اور پنجابی کا آپس میں کافی مضبوط اور گہرا ربط ہے۔ اصل میں ان دونوں زبانوں کی نسل اور ساخت ایک جیسی ہے۔ اس لیے ان کا ذخیرہ الفاظ بھی مشترک ہی محسوس ہوتا ہے۔ انہوں نے ایک جیسی زبانوں اور لوگوں کے ساتھ وقت گزارا اور ایک جیسے اثرات کو قبول کیا۔ اگر ان دونوں زبانوں کے ذخیرہ الفاظ پر نظر ڈالی جائے تو اس میں ہمیں سب سے زیادہ الفاظ، عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے ملیں گے۔ اس کے علاوہ دیگر زبانوں مثلاً سنسکرت، پراکرت، اپ بھرنش وغیرہ کے الفاظ بھی موجود ہیں۔

(۴)رسم الخط

رسم الخط کسی بھی زبان کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کا ایک اور اہم مشترک پہلو رسم الخط کا ہے۔ دونوں کے لیے ایک ہی رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے پہل پنجابی لکھنے کے لیے عربی رسم الخط استعمال کیا جاتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اُردو زبان ایک علیحدہ زبان کے طور پر اُبھری تو فارسی کے اثرات کے بعد اس کے رسم الخط میں تبدیلیاں آتی گئیں۔ ان تبدیلیوں کے اثرات کو پنجابی نے بھی قبول کیا اور دونوں ایک ہی رسم الخط میں لکھی جانے لگیں۔

(۵) محاورات اور ضرب الامثال

محاورات اور لسانیات جہاں کسی زبان کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں وہاں مختلف زبانوں کے اشتراک میں بھی ان کی اہمیت مسلمہ ہے۔ ماہر لسانیات کا کہنا ہے کہ اگر زبانوں میں محاورات اور ضرب الامثال ایک جیسے ہوں تو ان کا لسانی رشتہ مزید گہرا ہوتا ہے۔ محاورات اور ضرب الامثال قوموں کی تاریخ اور ان کے تہذیب و تمدن پر روشنی ڈالتے ہیں۔ محاورات دراصل کسی بھی زبان کی جان ہوتے ہیں۔ اگر ہم پنجابی اور اُردو کے محاورات کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا آپس میں بہت گہرا رشتہ ہے۔ دونوں زبانوں میں ایک ہی جیسے محاورات اور ضرب الامثال استعمال ہو رہے ہیں۔

(٦) گرامر

اُردو اور پنجابی کی گرامر پر نظر ڈالی جائے تو یہاں بھی تمام تر مشترک خصوصیات ہی نظر آئیں گی۔ یہ اشتراک مندرجہ ذیل سطح پر دیکھا جاسکتا ہے۔

(۱) مصادر

(۲) تذکیر و تانیث

(۳) اضافت و غیرہ

اس طرح ان میں فعل حال، ماضی اور مستقبل سے جملوں میں جو تبدیلیاں کی جاتی ہیں ایک جیسی ہیں۔ جس سے بخوبی یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کی گرامر میں بہت حد تک اشتراک پایا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اردو اور پنجابی میں گہرا لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔ یہ لسانی اشتراک اصل میں اس مشترکہ تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر کی وجہ سے جس میں یہ دونوں زبانیں پروان چڑھی ہیں۔ ان دونوں زبانوں نے اکٹھے ایک جیسے ماحول میں ایک جیسے لوگوں میں رواج پایا اور دونوں ہی اپنے خطے کی مقبول زبانیں ہونے کے ناطے خوب بولی اور سمجھی جاتی ہیں جس کی وجہ سے ان میں خاصا لسانی اشتراک پایا جاتا ہے۔ اُردو اور پنجابی کے صوتیاتی مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ چونکہ ان دونوں پر ایک ہی طرح کی بیرونی زبانوں کے الفاظ شامل ہوئے ہیں۔ اس لیے ان میں ایک جیسی ہی آوازوں کا اضافہ ہوا ہے۔ صرف کہیں کہیں معمولی سا فرق نظر آتا ہے۔ چند ایسی اصوات ہیں جو صرف اہل پنجاب کے لیے ہی مخصوص ہیں۔ جب اُردو ادب کا آغاز ہوا تو اس رسم الخط میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ پنجابی نے بھی ان تبدیلیوں سے استفادہ کیا۔ اس طرح اگر غور کریں تو اب پنجابی کا رسم الخط اور حروفِ تہجی وہی ہیں جو اُردو میں مستعمل ہیں۔ پنجابی کے کچھ ماہرین نے اس سلسلے میں کافی کوشش کی کہ چند الفاظ کی تبدیلی سے ہی پنجابی اور اُردو کے حروفِ تہجی کو جدا کر دیا جائے لیکن ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ اُردو اور پنجاب کا دوسرا اہم تعلق وطن کا ہے۔ حسب و نسب کے بعد وطن کا تعلق بھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ دونوں جب علیحدہ ہوئیں تو ایک ہی وطن میں وقت گزارا لیکن اس کے باوجود ایک دوسرے سے بالکل مختلف زبانوں کے طور پر اُبھریں۔ حالانکہ دونوں یہیں کی زبانیں ہیں۔ یہی پیدا ہوئیں، یہیں پروان چڑھیں اور صدیوں تک یہیں آباد رہیں۔

ii۔ قیامِ پاکستان سے قبل اردو میں پنجابی اور انگریزی زبان کے الفاظ کا پس منظری مطالعہ

تقسیمِ برصغیر نے نہ صرف دو آزاد مملکتوں کے قیام کو عملی جامہ پہنایا بلکہ اس واقعے نے تہذیبی، ثقافتی اور تاریخی تشخص کو بھی خاص طور پر متاثر کیا۔ اگر ہم تقسیم ہند کے اسباب پر غور کریں تو دیگر بہت سے اسباب کے ساتھ ساتھ لسانی مسائل بھی کسی نہ کسی حد تک اس تقسیم کا باعث بنے ہیں۔ اردو اس دور میں ایک ایسی

زبان تھی جو برصغیر کے بہت سے علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی بلکہ اس میں وسیع ادبی سرمایہ موجود تھا۔ اس کے مقابلے میں دیگر زبانیں بھی تھیں لیکن عوامی سطح پر جو مقبولیت اردو کو حاصل تھی وہ کسی اور زبان کے مقدر میں نہ تھی۔

اردو کی اسی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے انگریزوں نے فارسی کی بجائے پہلے اردو کو رائج کیا لیکن بعد میں اپنی غلطی کا احساس (یہ غلطی ان کے مفادات کے حوالے سے تھی ورنہ ہندوستان اور اردو کے لیے اردو کے نفاذ کا فیصلہ ہر حوالے سے درست تھا) ہونے پر انگریزی کو آگے لایا گیا۔ انگریزوں کی اردو میں دلچسپی کی بنا پر عوام میں اردو کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اردو کی اس مقبولیت نے عوامی سطح پر لسانی حوالے سے بھی خاص اثرات مرتب کیے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اردو کسی مخصوص نسل یا قوم یا جغرافیائی، حدود کی پیداوار نہیں ہے بلکہ یہ وہ زبان ہے جس کے مختلف نقوش مختلف خطوں میں ان خطوں کی مقامی بولیوں کے زیر اثر ایک ساتھ ابھرے۔ مذاہب اور رنگ و نسل کی تخصیص کے بغیر اور مادری زبانوں کے افتراق کے باوجود اردو سب کی ہر دل عزیز ٹھہری اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے برصغیر کے طول و عرض میں پھیل گئی۔ اس زبان نے انتہائی قلیل مدت میں نہ صرف علمی اور ادبی، حیثیت حاصل کر لی بلکہ جلد ہی پورے خطے میں مقبول بھی ہو گئی۔ خلیل صدیقی نے اس سلسلے میں تاریخی حوالوں سے تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "جنوبی ایشیا کی لسانی تاریخ میں ایک بات نمایاں نظر آتی ہے اور اکثر دانشور اور ماہرین لسانیات نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ اکثر ادوار میں کوئی نہ کوئی زبان بہت سے علاقوں میں ثانوی زبان کی حیثیت سے سمجھی اور بولی جاتی رہی ہے اور ایک طرح کی مشترکہ زبان یا لنگوا فرینکا کا حق ادا کرتی رہی ہے۔ اس کی حیثیت سلی، بگروم یا علاقائی، نہیں رہی بل کہ اس کی بدولت مختلف معاشروں اور تہذیبی اکائیوں میں ذہنی اور عقائدی ہم آہنگی بھی پیدا ہوتی رہی اور کاروباری تقاضے بھی پورے ہوتے رہے۔"(۲۲)

مقامی بولیوں اور مقامی زبانوں کے حوالے سے بات کی جائے تو برصغیر میں پنجابی زبان کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ پنجابی ایسی زبان تھی (اور اب بھی ہے) جو برصغیر کے طویل خطے میں نہ صرف بولی جاتی تھی بلکہ اس میں ادبی سرمایہ بھی بہت زیادہ موجود تھا۔ اس زبان میں ادبی حوالے سے قدیم پنجابی صوفیا کے کلام کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔ تقسیم سے قبل اردو میں پنجابی زبان کے استعمال کی بڑی وجہ یہ صوفیا کا کلام

اور ملفوظات بھی ہیں۔ ان صوفیا کا چونکہ عوام سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ عوام نہ صرف ان کے کلام کے دلدادہ ہوتے ہیں بلکہ عوام کے دلوں میں ان کے لیے خاص عقیدت بھی ہوتی ہے یہی عقیدت ان کے کلام کی مقبولیت کا سبب بھی بنتی ہے۔

برصغیر کے خطے میں ان صوفیا کرام کی خدمات عوام میں تحسین کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام اور دیگر تحریریں کو عوام میں مقبولیت بھی حاصل تھی اور بہت سے عوام کو ازبر بھی تھے۔ اردو کو بھی چونکہ پنجاب اور برصغیر میں خاص عمل دخل حاصل رہا ہے۔ اردو اور پنجابی کے مشترک ادبا، شعرا اور اہل قلم نے ان دونوں زبانوں میں کافی اشتراکات پیدا کیے۔ دونوں زبانوں کے بہت سے الفاظ تقسیم سے قبل ہی ایک دوسرے میں منتقل ہو چکے تھے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ پنجابی زبان کے شعرا کی عوامی مقبولیت اور اردو شاعری کی مقبولیت ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ یہی صورت حال نثر کے بارے میں بھی سامنے آئی۔ عوام کو جب اردو اور پنجابی ایک ساتھ ملی اور ایک ہی خطے میں ایک ہی وقت میں دونوں پروان چڑھنے اور عوامی مقبولیت حاصل کرنے لگیں تو دونوں میں ایک دوسرے کے الفاظ بھی شامل ہوتے رہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج کے اردو نثر نگاروں کے ہاں اردو نثر میں جو پنجابی زبان کے الفاظ ملتے ہیں یہ تقسیم سے قبل سے چلے آرہے ہیں۔ دونوں زبانوں میں شروع ہی سے خاصا لسانی اشتراک پیدا ہوا جس کی وجہ سے دونوں زبانوں کے الفاظ ایک دوسرے میں استعمال ہوتے آرہے ہیں۔

یہاں ہماری بحث اردو کے حوالے سے ہے تو یہ حقیقت ہے کہ پنجابی کی نسبت اردو نے اپنا دامن زیادہ وسیع کیا ہے۔ دیگر زبانوں کے الفاظ کی شمولیت ہو یا ارضی حوالے سے وسعت کو دیکھا جائے تو اردو نے پنجابی کی نسبت زیادہ وسعت سے کام لیا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل جب اردو کو انگریزی عتاب کا نشانہ بننا پڑا اس دور میں بھی اس میں دیگر زبانوں کے الفاظ خصوصاً انگریزی کے الفاظ کی شمولیت ہوتی رہی۔

اگر ہم تاریخ میں جاکر تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے دیکھیں تو بات زیادہ واضح ہو جاتی ہے کہ پنجاب میں پنجابی تہذیب و ثقافت نے اردو پر بھی اثر ڈالا اور اردو نے پنجابی کو اپنے دامن میں جگہ دینے میں اس حد تک وسعت کا مظاہرہ کیا کہ دونوں ایک ہی وقت میں ایک ہی علاقے میں یکساں بولی اور سمجھی جانے لگیں اور جب برصغیر پر انگریزوں اور انگریزی کی یلغار ہوئی اور انگریزی تہذیب اس خطے میں پروان چڑھنے لگی تو عوامی سطح پر زبان پر بھی اثر پڑا اور اردو میں بھی انگریزی زبان کے بہت سے الفاظ داخل ہو کر اردو کا حصہ بنتے چلے گئے۔ یوں اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آج اردو نثر میں جو پنجابی اور انگریزی زبان کے الفاظ استعمال

ہو رہے ہیں یہ کوئی شعوری کوشش نہیں بلکہ تقسیم سے قبل بھی یہ صورت حال موجود تھی اور اس کی بڑی وجہ وہ تہذیبی اور ثقافتی تبدیلیاں ہیں جو سماجی سطح پر رونما ہوتی رہی ہیں اور انھوں نے دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح زبان کو بھی خاصا متاثر کیا ہے۔

حوالہ جات

١ سکندر حیات میکن، شگفتہ مسافر، عطاالحق قاسمی، لاہور بکس ظفر اللہ چوک، سرگودھا، ٢٠١٢ء، ص ٧

٢۔ امجد رؤف خان، انٹرویو، مطبوعہ، سیارہ ڈائجسٹ لاہور جون ١٩٩١ء، ص ١٨

٣۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، عطاء الحق قاسمی شخصیت اور فن، ص ٢٨

۴۔ ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر، ٥٢١۔ اہل قلم، مقبول اکادمی، لاہور، ٢٠١٧ء،، ص ٦٥٠

٥۔ ازہر منیر، یہ نصف صدی کا قصہ ہے (لاہور: تخلیقات، مارچ ١٩٩٣ء) ص ٦٥

٦۔ فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، عطاالحق قاسمی شاداب موسموں کی آواز، ص ١٣

٧۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، عطاء الحق قاسمی شخصیت اور فن، ص ٣٦

٨۔ فوزیہ چودھری، ڈاکٹر، عطاالحق قاسمی شاداب موسموں کی آواز، نستعلیق پبلشرز، لاہور، ٢٠٠٩ء، ص ۴٦

٩۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، عطاء الحق قاسمی شخصیت اور فن، ص ٦١

١٠۔ شوکت سبزواری، اردو زبان کا ارتقا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ١٩٩٦ء، ص ٦٧

١١۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد اول، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ٢٢

١٢۔ ایضاً، ٥٩٣

١٣۔ ذوالفقار احسن، تنقیدی افق، نقش گر، راولپنڈی، ٢٠١۴ء، ص ٢٣۔٢۴

١۴۔ ایضاً، ص ٢٥۔٢٦

١٥۔ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ١٩٨٨، ص ١٢٧

١٦۔ ایضاً، ص ١٣٢

١٧۔ محی الدین زور، ڈاکٹر، سید، ہندوستانی لسانیات، مکتبہ معین الادب، لاہور، جنوری ١٩۴١ء، ص ٥۴

١٨۔ مالک رام، قدیم دلی کالج، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی، ٢٠١١ء، ص ١٩

١٩۔ عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر، قواعد اردو، اکیڈمی، لاہور، ١٩٥٨ء، ص ٨

٢٠۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، نول کشور پریس، لکھنو، ١٩٥٢ء بار چہارم، ص ٩

۲۱۔ خلیل صدیقی، لسانی مباحث، زمرد پبلی کیشنز، کوئٹہ، س۔ن، ص ۸۰

۲۲۔ محمد باقر، ڈاکٹر، اُردوئے قدیم۔ دکن اور پنجاب میں، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲، ص ۴

۲۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو (جلد اوّل)، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع ہفتم، ۲۰۰۸ء، ص ۶۹۶

۲۴۔ محمود شیرانی، حافظ، پنجاب میں اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸، ص ۵۰

۲۵۔ ایضاً، ص ۶۰

۲۶۔ انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، عزیز بک ڈپو، لاہور، طبع سوم ۱۹۹۸ء، ص ۴۳

۲۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو زبان کیا ہے، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۱۲۵

۲۸۔ شرر، عبدالحلیم، لکھنؤ، پرنٹ لائن پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۴۲

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۳۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو زبان کیا ہے، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۱۶۲

۳۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو زبان کیا ہے، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳، ص ۱۲۷

۳۲۔ حمید اللہ ہاشمی، ڈاکٹر، اُردو اور پنجابی۔ لسانی و ادبی اشتراک، مشمولہ پاکستانی زبانیں مشترک لسانی و ادبی ورثہ، مرتب ڈاکٹر انعام الحق جاوید/عبداللہ جان، شعبہ پاکستانی زبانیں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۹ء، ص ۱۹

باب دوم:

عطاالحق قاسمی کی نثر میں پنجابی الفاظ کا سماجی، ثقافتی و فنی تناظر

الف۔ پنجابی معاشرت کی عکاسی

برصغیر پاک و ہند میں پنجاب کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جو اپنی سماجی، ثقافتی اور تہذیبی اقدار کے حوالے سے اہم اہمیت کا حامل ہے۔ جہاں ایک طرف اس خطہ ارض میں جغرافیائی لحاظ سے قدرت کی فیاضی نظر آتی ہے وہیں سماجی حوالے سے بھی اس کا سماج مختلف رنگوں کے گلدستے کی مانند ہے اس خطہ میں کثیر تعداد میں اقوام موجود ہیں۔ ہر قوم کی اپنی خاص سماجی اور تہذیبی اقدار اور رسوم ورواج ہیں جو اس قوم کو ایک خاص پہچان عطا کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ پنجاب کا سماجی ڈھانچہ مختلف طرز کی اقدار اور روایات سے تشکیل پاتا ہے۔اس سماجی ڈھانچے میں جہاں شہری زندگی کی جدت اور ترقی یافتہ اقوام کی اقدار ملتی ہیں وہیں دیہاتی سطح پر قدرت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ پنجاب کا سماجی ڈھانچہ جس قدر متنوع اقوام سے تشکیل پاتا ہے اسی قدر اس کی سماجی اقدار میں بھی خاصا تنوع دیکھنے کو ملتا ہے لیکنیہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تنوع میں تضاد کا عنصر شامل نہیں بلکہ یہ سب سماجی اقدار اور تہذیبی روایات مل کر پنجاب کی معاشرت کی تشکیل کرتی ہیں۔

کسی بھی ادیب کے لیے معاشرے سے کٹ کر رہنا ممکن نہیں بلکہ ادیب معاشرے کے دیگر افراد کی نسبت معاشرے کے مسائل، روایات، اقدار اور دیگر عناصر میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ ادیب کی حساس طبیعت ایسے معاشرے کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا عادی بناتی ہے اور اگر اتفاق سے وہ ادیب مزاح نگار ہو تو پھر اس کا معاشرے کے ساتھ تعلق اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے اور وہ معاشرتی ناہمواریوں کو ایک خاص انداز میں دیکھتااور دکھاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی ڈگر میں اس عہد اور علاقے کی معاشرت جھلکنے لگتی ہے۔ معاشرت کی یہ عکاسی کئی زاویوں سے اپنا جلوہ دکھاتی ہے کہیں تو فکری سطح اس کا تخیل سماجی اقدار اور روایات سے متاثر نظر آنے لگتا ہے تو کہیں فنی سطح پر لاشعوری طور پر اس کی تحریر میں اس معاشرے کی زبان کے الفاظ شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان الفاظ کے شامل ہونے کی بڑی وجہ وہ سماجی اقدار، معاشرت، ثقافت اور سماجی روایات ہوتی ہیں جنھیں احاطہ تحریر میں لاتے وقت ادیب بے تکلفانہ انداز اپناتا ہے اور وہ اس معاشرت کی عکاسی اس معاشرے کی زبان کے الفاظ کو استعمال کر کے کرتا ہے۔ اسی صورت حال میں اس کی تحریر

میں استعمال ہونے والے الفاظ اپنا خاص معاشرتی اور ثقافتی پس منظر رکھتے ہیں جس سے متاثر ہو کر ادیب انہیں تحریر میں یوں استعمال کرتا ہے کہ اس کی تحریر میں بے ساختگی اور بے تکلفی پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی تحریر کو پڑھتے وقت قاری خود کو حقیقی معنوں میں اس سماج میں کھڑا محسوس کرتا ہے۔

اردو ادب میں پنجابی معاشرت کی عکاسی کی ایک توانا روایت موجود ہے۔ بہت سے ادیبوں نے اپنی تحریروں میں نہ صرف معاشرت کی عکاسی کی ہے کہ بلکہ تحریر کو لطافت کا جامہ پہنانے کے لیے اردو تحریر میں پنجابی الفاظ کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ پنجابی لفظ تحریر کے حسن کو مزید نکھارتا چلا گیا ہے۔ عطا الحق قاسمی ایسے ہی ادیب ہیں جنہوں نے اپنی تحریروں میں پنجابی سماج اور پنجابی معاشرے کی خوب عکاسی کی ہے۔

عطا الحق قاسمی کی تحریروں میں پنجابی معاشرت کی عکاسی اس انداز میں ملتی ہے کہ وہ پنجابی معاشرت کی دیگر معاشرتی رجحانات کے ساتھ موازنہ بھی کرتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دنیا بھر کے اسفار کیے تھے اور دنیا بھر کے سماج کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ یوں جب وہ کسی موضوع کو احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو مختلف معاشروں کے سماجی رویوں اور سماجی رجحانات کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کی نفسیات کو بھی بخوبی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک جہاں گرد شخص ہیں۔ ان کے نزدیک مختلف سماجی رویوں میں پروان چڑھنے والے انسان مختلف اقدار کے حامل ہونے کے باوجود کسی نہ کسی انداز میں ایک دوسرے سے میل جول لازمی رکھتے ہیں اور یہی میل جول ایک معاشرت کو جزوی طور پر دوسری معاشرت میں رواج پانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی معاشرت بھی رنگارنگ کی حامل ہے۔ اس رنگارنگی عکاسی ان کی تحریروں میں خوب ملتی ہیں۔

عطا الحق قاسمی کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انھوں نے خود کو کسی ایک موضوع یا ایک نوع کے موضوعات کا پابند نہیں بنایا بلکہ ان کی تخلیقی کائنات کی موضوعاتی وسعت خاصی وسیع ہے۔ یہ وسعت آنے کے موضوعات کو ہمہ گیریت اور عالمگیریت عطا کرتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ ان کے مطالعہ اور مشاہدہ کا وسیع ہونا ہے۔ وہ چیزوں کو صرف دیکھتے نہیں بلکہ ان کے بارے میں خود غور و فکر کرتے ہیں اور معاشرتی ناہمواریوں کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکی تحریریں شگفتگی اور شائستگی کے عنصر لیے ہوتی ہیں۔

زبان کوئی جامد شے نہیں ہوتی۔ دنیا کی تمام زبانیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے الفاظ کو متروک کرتی جا رہی ہیں اور بہت سے نئے الفاظ زبانوں میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو کا دامن اس لحاظ

سے خاصا وسیع ہے کہ اردو میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سی زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے گئے اور یہ شمولیت اس انداز میں ہوئی کہ وہ الفاظ اردو کے قواعد میں ڈھل کر اردو ہی کے بن کر رہ گئے۔ پنجابی اور اردو کے لسانی اشتراک خاصے وسیع ہیں۔ پنجابی کے الفاظ اردو میں یوں شامل ہوتے ہیں کہ وہ اپنا سماجی اور ثقافتی پس منظر بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس تناظر میں عطاالحق قاسمی کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی تحریروں میں شامل ہونے والے پنجابی الفاظ تحریر میں ٹھونسے ہوئے معلوم نہیں ہوتے بلکہ وہ جہاں بھی پنجابی الفاظ استعمال کرتے ہیں وہاں اس الفاظ کا ایک خاص سماجی تناظر سامنے آتا ہے اوران کی تحریر حقیقی معنوں میں پنجابی معاشرت کی تصویر سامنے لانے لگتی ہے۔

پنجاب کے خطے کی سماجی صورت حال ہر دم تغیر پذیر ہے یہاں کی تعلیمی حالت دیگر علاقوں کی نسبت خاصی بہتر ہے۔ تعلیمی بہتری کی وجہ سے روزگار اور معاشی حوالے سے بھی یہاں کے لوگ برصغیر کے دیگر علاقوں کی نسبت خاصے مضبوط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی سطح پر مثبت اقدار فروغ پاتی ہیں۔ اس کے علاوہ پنجاب کی مٹی نے بہت سی تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ تہذیبی ارتقا اس خطے کے باشندوں کی زندگیوں میں نمایاں ہے۔ اس خطے کی معاشرت اور تہذیب میں مثبت اقدار کے فروغ پانے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کے طرز زندگی اورانداز معاشرت میں حسن جھلکتا ہے۔ یہاں کے لوگ ایک دوسرے کو اجنبی نہیں سمجھتے۔ تقسیم ہند کے وقت ہندوستان میں کثیر تعداد میں مہاجرین اس خطے میں آکر آباد ہوئے۔ ان کے آنے سے سماجی سطح پر خاص تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں لیکن پنجابی معاشرت کا بنیادی ڈھانچہ ارتقا کی طرف ہی گامزن رہا۔ ملک میں اٹھنے والی تمام بڑی تحریکوں نے پنجاب ہی سے جنم لیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجابی سماج کے باشندے اپنے مسائل اوراپنے حقوق کے بارے میں خاصی آگاہی رکھتے ہیں۔ یہ آگاہی ان کے شعور کو جلا بخشتی ہے اور وہ اپنے حقوق کی خاطر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

رسوم ورواج کے حوالے سے پنجابی سماج کو دیکھا جائے تو یہاں خوشی و غم کے عالمگیر تصورات پائے جاتے ہیں۔ خوشی و غمی کی رسومات پنجابی سماج اور پنجابی معاشرت میں بسنے والے باشندوں کی یک جہتی اور یگانگت کی عکاسی کرتی ہیں۔

لسانی حوالے سے دیکھا جائے تو پنجاب کی زبان یعنی پنجابی زبان کے اردو پر گہرے اثرات موجود ہیں۔ مختلف ادیبوں کی تحریروں میں اردو میں پنجابی زبان کے الفاظ کی شمولیت تحریر کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ اس تناظر میں جب ہم پنجابی معاشرت کی عکاسی کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو عطاالحق قاسمی کی تحریروں

میں پنجابی زبان کے الفاظ کا معاشرتی تناظر خاصا وسیع نظر آتا ہے۔ ان کی تحریریں پنجابی معاشرت کی بخوبی عکاسی کرتی ہیں۔

کسی بھی علاقے کی معاشرت میں اس علاقے کی اشیائے خورد نوش کا بنیادی کردار ہوتا ہے۔ اشیائے خورد ونوش جہاں ایک طرف معاشرے میں کھائے اور پیے جانے والے لوازمات کا سماجی منظر نامہ پیش کرتی ہیں وہیں دوسری طرف ان اشیاء اور ان کے استعمال سے باشندگان معاشرہ کی تہذیب او رانداز زندگی بھی نمایاں ہوتے ہیں، اس حوالے سے پنجاب کو دیکھا جائے تو پنجاب کے لوازمات خورد ونوش میں ''لسّی'' کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ لسّی ایسا مشروب ہے جو گرمیوں میں پنجاب کے علاقے میں بکثرت پیا جاتا ہے۔ گھروں میں لسّی تیار کرنے سے لے کر بازاروں میں کاروباری سطح پر اس کی تیاری کی جاتی ہے اور لسّی تیار کرنے والے لوگ اس فن کے ماہر ہوتے ہیں۔ عطا الحق قاسمی نے بڑے لطیف انداز میں اپنے ایک مضمون میں اس عمل کی عکاسی کی ہے۔

> "میں نے پہلی بار سخت گرمیوں کے موسم میں لاہور کے ایک مشہور علاقے بھاٹی گیٹ میں اس بیئر کا گلاس پیا۔ یہ بیئر سفید رنگ کی ہوتی ہے اور اسے گاہک کے سامنے کشید کیا جاتا ہے۔۔۔ اس کا ایک گلاس پینے سے جسم ڈھیلا پڑنا شروع ہو جاتا ہے اور ایک عجیب طرح کی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے لاہوری صبح شام یہ بیئر پیتے ہیں۔ چنانچہ صبح سے شام تک اونگھتے رہتے ہیں۔ اس شہر کو مقامی زبان میں لسی کہا جاتا ہے۔"(۱)

پنجاب میں معاشرت میں لوگوں کو ان کی نسبت سے چکرانا ایک عام رواج ہے اور لاہور تو ویسے بھی تہذیب و ثقافت اور سماجی اقدار کا مرکز ہے۔ عطا الحق قاسمی نے لاہور والوں کے لیے "لاہوریئے" کا جو لفظ استعمال کیا ہے یہ ہمارے پنجابی سماج میں اپنا ایک خاص منظر نامہ رکھتا ہے۔ لاہوری سے مراد تو لاہور کے رہنے والے ہیں لیکن عام طور پر یہ ان لاہور کے باسیوں کے لیے بولا جاتا ہے جن کے طرز عمل سے باقی علاقوں کی نسبت لاہور کے سماجی منظر نامے کی عکاسی بخوبی ہو رہی ہو۔

پنجابی معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے عطا الحق قاسمی نے یہاں کے تعلیمی ماحول کو بھی اپنے مخصوص طنزیہ اور ظریفانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ انھیں اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ کالج اور سکول کی سطح

پر توجہ اگانہ تعلیم ہے لیکنیونی ورسٹی کی سطح پر مخلوط تعلیم کا رواج ہے اور یہ مخلوط تعلیم کیا گل کھلا رہی ہے۔اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> "مجھے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے علیحدہ علیحدہ کالج ہیں جب کہ یونیورسٹی میں مخلوط تعلیم رائج ہے۔ مخلوط تعلیمی اداروں میں لڑکے لڑکیاں کلاس روم میں استادوں کے لکھے ہوئے نوٹس ایک دوسرے سے طلب کرتے ہیں اور پھر نوٹس کے تبادلے کی صورت میں وہ اکثر کسی گوشہ تنہائی میں پوری محویت کے ساتھ ان پر تبادلہ خیال کرتے نظر آتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہاں کے اہل دانش یونیورسٹیوں میں علمی فضا کے فقدان کا رونا روتے ہیں تاہم ایک اہل دانش نے میرے متذکرہ خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا:"آپ بھولے بادشاہ ہیں" خدا جانے یہ "بھولا بادشاہ" کیا ہوتا ہے۔"(۲)

"بھولا بادشاہ" پنجابی کی ایک مشہور ترکیب ہے۔عام طور پر یہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو معاشرے میں پائے جانے والے واضح رویوں اور اقدار سے بھی ناواقف رہتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ جو چیزیں آنکھوں کے سامنے نظر آرہی ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔عطاالحق قاسمی نے یہاں اس لفظ کا استعمال بڑا بر محل کیا ہے۔وہ معاشرے کی مادر پدر آزادی جو یونی ورسٹی کی سطح پر طلباو طالبات کو مہیا کی جارہی ہے اس پر سخت نالاں ہیں اور طنزیہ انداز میں یہ کہتے ہیں کہ مردو خواتین کا آپس میں یوں نوٹس کے تبادلے سے جو علمی فضا پروان چڑھ رہی ہے اس پر یہ گلہ نہیں کیا جاسکتا کہ تعلیمی میدان میں پیش رفت نہیں ہو رہی۔ ساتھ ہی وہ معاشرے کے دیگر باشندوں کی زبانی خود کو "بھولا بادشاہ" کہلوا کر اس امر کی طرف بھی اشارہ کیے جارہے ہیں کہ اس مخلوط تعلیم کی آڑ میں سماجی اقدار اور اخلاقی روایات کا جو جنازہ اٹھ رہا ہے اسے ہمارا تعلیم یافتہ سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جب کہ معاشرے کا عام انسان اس پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔یہ ایک معاشرتی حقیقت ہے جسے اس اقتباس میں قاسمی صاحب نے بڑے لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ آج بھی ہمارے معاشرے میں بہت سی لڑکیاں محض اس وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے سے محروم رہ جاتی ہیں کہ ان کے والدین انھیں مخلوط تعلیم میں بھیجنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ مخلوط تعلیم نے جہاں مردو خواتین کو ایک دوسرے کی طرح سمجھنے اور ذہنی ہم آہنگی کی راہ ہموار کی ہے وہاں معاشرے میں خود سری اور اخلاقی اقدار کو زوال پذیر بھی کیا ہے۔معاشرے کا اشرافیہ طبقہ نہ سہی عام لوگ آج بھی مخلوط تعلیم کی آڑ میں ہونے والی

خرافات کو سمجھتے ہیں۔ شہری سطح پر مخلوط تعلیم اور دیہاتی سطح پر فطری عشقی رجحانات نے بھی معاشرے کے حسن کو گہنا دیا ہے۔ دیہاتی سطح پر یہ خرافات کس انداز سے معاشرے میں رائج ہیں اس کی ایک جھلک دیکھیے:

"اندرون شہر کے عشاق اپنی محبوبہ سے عموماً اپنے یا اس کے گھر کی سیڑھیوں میں ملاقات کرتے ہیں یا مٹینگ پوائنٹ طے کرنے کے لیے اپنے مکان کی چھتوں پر کھڑے ہو کر کسی ڈھیلے میں رقعہ لپیٹ کر ایک دوسرے کی طرف پھینکتے ہیں جس کے نتیجے میں اکثر رقعہ گلی میں جا گرتا ہے اور ڈھیلا کسی بزرگ کو جا لگتا ہے۔ سیانوں سے سنا ہے کہ اس سے اکثر و بیشتر خاصی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔"[۳]

پچھلے چند عشروں سے معاشرے میں ان خرافات نے کافی زور پکڑ لیا ہے اور اب بات رقعوں سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ جدید دور میں رقعے اور خط کا تصور ہی ختم ہوتا جا رہا ہے قاسمی نے جس امر کی عکاسی کی ہے یہ اس دور کی کہانی ہے جب جدید آلات مواصلات کا چلن عام نہیں ہوا تھا۔ معاشرے میں نفیس اور لطیف جذبات کے اظہار کا یہ انداز خوب رائج رہا اور اس کی وجہ سے مختلف گھرانوں میں پیچیدگیاں ہی نہیں دشمنیاں بھی پروان چڑھی ہیں۔ ہم معاشرے میں دیکھتے ہیں کہ بہت سی دشمنیاں جو بیسیوں افراد کی زندگیوں کے چراغ گل کر گئی ہیں ان کی محض یہی غلط طریقے تھے جو مرد و زن اپنے جذبات کے اظہار کے لیے اپناتے رہے۔

عطاالحق قاسمی نے اس بیان میں پنجابی کا لفظ "سیانوں" اس انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ لفظ تحریر میں پنجابی ہونے کے باوجود کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کر رہا۔ "سیانا" کا لفظ جن معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پنجابی اردو ڈکشنری میں وہ ہیں۔ "سیانا (سیاناں): (۱) عقل مند، دانش مند، دانا، بدھواں، سمجھدار، گیانی، (۲) جوان، (۳) ہوشیار، چوکس...... بزرگ، عمر رسید"

ان معانی کو دیکھا جائے تو عطاالحق قاسمی نے یہاں "سیانوں" کا لفظ بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ عام طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم سے روکنے والے عقل مند کیسے ہو سکتے ہیں لیکن "سیانا" کے معنوں پہ غور کیا جائے تو دانش مند، تیز، بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ وہ ہیں جن کے قول میں ان کا تجربہ اور مشاہدہ بولتا نظر آتا ہے اور یہ طبقہ پنجابی معاشرے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

عطاالحق قاسمی نے صرف اپنی نثری تحریروں میں ہی نہیں بلکہ اپنے بعض ڈراموں میں بھی اس لفظ "سیانا" کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ ایک ڈراما "ہر فن مولا" میں ایک مکالمے میں اس لفظ کا استعمال یوں کیا گیا ہے۔

"ناشاد: مجھے عزت، شہرت اور دولت سے عشق ہے اور سیانے کہتے ہیں کہ معشوق کے گھر کی طرف جانے والی پگڈنڈی پر چلتے رہنا چاہیے ورنہ اس پر گھاس پھونس اگ آتی ہے۔"(۴)

یہاں سیانے کا پنجابی لفظ ایسے لوگوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو تجربہ کار اور عمر رسیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قاسمی صاحب کا ایک اور اعجاز یہ بھی ہے کہ انہوں نے جس طرح کے لوگوں کا ذکر تحریر میں کیا ہے ان کے حوالے سے بیان بھی ایسے استعمال کرتے ہیں جو انہیلوگوں کے شایانِ شان ہوتے ہیں۔ یہاں سیانے کا لفظ استعمال کرنے کے بعد جو بیان سامنے لایا گیا ہے وہ حقیقی معنوں میں ان "سیانوں" سے خاصا میل کھاتا ہے۔

پنجابی معاشرت کی عکاسی کے حوالے سے ان کے ڈرامے ''ہر فن مولا'' میں بہت سے ایسے مناظر اور کردار ملتے ہیں جن سے پنجابی زبان کے استعمال سے پنجابی معاشرت کی عکاسی ہوتی ہے۔ چائے ہمارے معاشرے کا ایک اہم جزو بن کر رہ گئی ہے۔ اب تو آؤ بھگت اور چائے ایک دوسرے کے حوالے سے لازم وملزوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ پنجابی معاشرت میں دیہاتی سطح پر اب بھی لسی کا رواج ہے لیکن شہروں میں خاص طور پر اور دیہاتوں میں بعض اوقات چائے ہی سے آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ چائے کے یوں کثرت استعمال سے یہ زبان زد عام ہو چکی ہے۔ قاسمی کی تحریروں میں بھی چائے کا تذکرہ مختلف انداز میں ہوا ہے۔ ایک جگہ اس کا ذکر یوں پنجابی زبان کے الفاظ کے ذریعے کیے گیا:

"مولا: صاحب جی! آپ کی چائے کے ساتھ "لگدی پھبدی" ہے یا چینی سے، پہلے آپ ڈھیر ساری چینی چائے میں ڈلواتے ہیں اور پھر چائے پیے بغیر اسے واپس بھجوا دیتے ہیں۔"(۵)

یہاں ''لگدی پھبدی'' ایسا پنجابی لفظ استعمال ہوا ہے جس نے پورے منظر نامے کو واضح کر دیا ہے۔ پنجابی اور اردو میں اس لفظ کی جگہ اور بھی بہت سے الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں لیکن قاسمی نے جس انداز سے اس لفظ کو یہاں استعمال کیا ہے اس سے ان کی تحریر میں ایک نیا آہنگ پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ مکالمے میں بھی خاصی جان پیدا ہو گئی ہے۔ پنجابی معاشرت کی عکاسی کے حوالے سے ذیل کا بیان دیکھیے:

"مجھے ان تین دنوں میں تین لفظ بہت سننے کو ملے، دوندا، چوگا اور کھیرا دوندا،
دو دانت والے اور چوگا چار دانت والے بکرے کو کہتے ہیں اور انہی کی قربانی
جائز ہے۔ کھیرا ایک طرح سے نابالغ جانور کو کہا جاتا ہے"[۶]

دوندا، چوگا اور کھیرا یہ الفاظ ہمیں دیہاتی سطح کے پنجابی معاشرے میں عام سننے کو ملتے ہیں اور عید قربان کے موقع پر تو ان کا چلن بہت عام ہو جاتا ہے کہ ہر جگہ ان الفاظ کی گونج سنائی دیتی ہے۔ پنجاب کے بیشتر لوگ دیہاتی پیشوں سے منسلک ہیں جن میں اہم پیشہ کھیتی باڑی کرنا اور مویشی پالنا ہے۔ یہ لوگ بھیڑ بکریاں پالتے ہیں اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے انہیں فروخت کر کے رقم حاصل کرتے ہیں۔

بکرے اور بکریوں وغیرہ کی خرید و فروخت کا عروج عید قربان کے موقع پر ہوتا ہے۔ سنت ابراہیمی پر عمل کرتے ہوئے لوگ قربانی کرتے ہیں جس کے لیے جانور خریدے جاتے ہیں۔ جانوروں کی عمر کا حساب دیہاتی لوگ ان کے دانتوں سے لگاتے ہیں اور اسی حساب سے انھوں نے جانوروں کی اقسام کے نام رکھے ہوتے ہیں جن کی معاشرتی عکاسی ہمیں قاسمی صاحب کی تحریر میں ملتی ہے۔

بکرے اور بکریوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کی مختلف اقسام جنہیں پنجابی میں دوندا، چوگا اور کھیرا وغیرہ کہا جاتا ہے پنجابی معاشرت کے حوالے سے وہ بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ انہی الفاظ سے آگے کئی طرح کے جملے بھی اہل زبان کے ہاں ملتے ہیں۔ قاسمی صاحب بھی ان سے پنجابی معاشرت کی عکاسی کے حوالے سے خوب کام لیتے ہیں۔ ایک جگہ انہی الفاظ کو بڑی خوبصورتی سے یوں استعمال کرتے ہیں۔

"بٹ صاحب ان کی برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوتے اور مجھے دیکھتے ہی سری پایوں کی
ساری لذت اپنے چہرے پر جمع کر کے کہتے "قاسمی صاحب آج ہی دوندی سریاں
منگوائی ہیں بس کل آپ نے کھانا ہمارے ساتھ کھانا ہے، تلوں والے گرم گرم نان
ہوں گے، ہلکے براؤن رنگ کے، ساتھ سری پائے، مکھ اور مغز (ایک ہاتھ کی ہتھیلی بنا
کر دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے۔) اس طرح مکھ نکالیں گے، اوپر ہرا دھنیا اور
مصالحہ، بعد میں کشمیری چائے۔"[۷]

یہاں دیکھا جائے تو صرف دوندی سریاں ہی نہیں بلکہ پورا منظر نامہ پنجابی ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ پنجابی کھانوں کی لذت کا احساس انہی کو ہوتا ہے جنہوں نے خالص پنجابی کھانے کھائے ہوں۔ اس اقتباس میں

قاسمی نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ پنجابی ماحول اور خاص طور پر پنجابی کھانوں کی عکاسی کی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر ناموں کے دوران میں بھی ان کی اپنے پنجابی ماحول اور پنجاب سے انس کم نہیں ہونے پاتا۔

پنجابی ماحول سے عطاالحق قاسمی کے انس کم نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ ان کا حلقہ احباب ہے جو زیادہ تر پنجاب سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ حلقہ احباب ان کی تحریروں میں بھی بار بار آیا ہے۔ اور بعض اوقات تو وہ اپنے ان احباب کا تذکرہ کرتے وقت اپنی خوبصورت پنجابی ہی سے کام لیتے ہیں۔ اپنے دو دوستوں کے درمیان گہری دوستی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "لندن میں اعجاز احمد اعجاز کی "گوڑھی" دوستی اگر کسی سے ہے تو وہ ابرار حسین ترمذی سے ہے۔ ابرار ترمذی بہت خوب صورت مصور ہے۔ فوٹو گرافی کا بھی شوقین ہے اور فوٹو گرافی میں فرد سے زیادہ بیک گراؤنڈ کو ترجیح دیتا ہے۔ چنانچہ اس کی تصویروں میں فرد اپنی پہچان کے ضمن میں اسی عمل سے گزرتا ہے جس عمل سے صوفی اپنی پہچان کے عمل سے گزرتے ہیں۔"(۸)

پنجابی معاشرت میں جگتوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا مذاق اڑانے کے لیے خوب جگتیں کستے ہیں۔ ایک دوسرے کو محظوظ کرتے ہیں۔ جگتیں کس طرح ہماری گھریلو زندگی میں رائج ہو چکی ہیں۔ قاسمی صاحب کی زبانی ایک واقعہ سنیے:

> "ایک دوست اپنے بال بچوں سمیت عیادت کے لیے گھر میں داخل ہوئے میں اس وقت ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت تھی کہ متاثرہ ٹانگ پر فی الحال بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ چنانچہ میں اس طرح اچھلتا اچھلتا اپنے دوست کی جانب بڑھا۔ دوست کی بیوی نے میری بیگم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "بھابھی میں نے سنا تھا کہ بھائی جان بیمار ہیں، مگر یہ تو لڈیاں ڈال رہے ہیں۔"(۹)

"لڈیاں" پنجابی لفظ لڈی کی جمع ہے جو اپنا ایک خاص معاشرتی تناظر رکھتا ہے اس کے بغیر پنجابی معاشرت میں خوشی اور خاص طور پر دیہاتی معاشرے میں شادی کی خوشی کا تصور بھی لیا جاتا ہے۔ یہ فتح اور کامرانی کا ناچ ہے۔ قدیم یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کھیل کو د یعنی اسپورٹس کے لیے جاتے تھے۔ یونان سے سکندر اعظم اور اس کی فوج کی برصغیر میں آمد کے بعد لڈی کا لفظ یہاں متعارف ہوا اور ہوتے ہوتے پنجاب کے ایک لوک ناچ سے مخصوص ہو کر رہ گیا۔ یہ یونانی لفظ لڈی پنجاب میں اتنا رچ بس گیا ہے کہ اب

ایک مدت سے یہ پنجابی کا ایک معروف رقص بن گیا ہے جو عموماً مردانہ کھیلوں کے مقابلوں کے بعد جیتنے والے فریق خوشی میں آکر لڈی رقص ڈالتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر یہ رقص خواتین گھروں میں جب کہ مرد بارات کے آگے ڈالتے ہیں۔ ڈھول کی تاپ پر دلہا کے آگے دلہا کے رشتہ دار لڈی ڈال کر خوشی کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر فقیر حسین ساگا لکھتے ہیں:

> "لڈی اولاً جنگ میں جیت کے بعد خوشی منانے کا اظہار تھا۔ فاتح فوج و سپہ سالار کا استقبال لڈی ڈال کر کیا جاتا تھا۔ پھر اکھاڑوں میں دنگل کے ہار جیت کے فیصلہ کے بعد جیتے ہوئے پہلوان کے جلوس کے آگے آگے اس کے مداحین نے لڈی ناچنے کا رواج قائم کیا۔ اسی طرح کبڈی، رسہ کشی، گھوڑ دوڑ اور اسی قسم کے دوسرے مقابلوں کے بعد جیتنے والے کھلاڑی اور ان کے ساتھ خوشی کا اظہار لڈی ناچ کر کے کرنے لگے۔ پھر دیہات میں مقدمہ بازی کے بعد جیتنے والی پارٹی جب اپنے گھر لوٹتی تو ان کے حامی رشتہ دار لڈی ناچ کی خوشی مناتے۔ ابتداء میں تو یہ ناچ صرف مردانہ ہی تھا لیکن پھر اسے بتدریج عورتوں نے بھی اپنا لیا اور وہ شادی بیاہ کے موقع پر لڈی ناچنے لگیں۔ عورتیں عموماً چار دیواری کے اندر اور آدمی باہر مردانے میں یا کھلی جگہ پر لڈی ناچتے ہیں۔"(۱۰)

دوسری لوک ناچوں کی طرح لڈی بھی دائرہ میں ہی کی جاتی ہے لیکن اگر بارات کے آگے لڈی ناچنا مقصود ہو تو ظاہر ہے کہ پھر رقاص قطاروں کی شکل میں ناچتے ناچتے آگے منزل کی طرف بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ لڈی کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے لغت کی طرف رجوع کیا جائے تو اس کے معنی یوں ہیں:

> "لڈی (مونث) رولا، نچنا، ٹپنا، مانگے مارنا (پانا) لڑی، رقص، دھمال، لڑکے یا لڑکیوں کا ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یا محفل بنا کر گت کے اوپر ناچنا اور بولیاں گانا۔"(۱۱)

یوں دیکھا جائے تو یہاں قاسمی نے لڈیاں پانا جن معنوں میں استعمال کیا ہے وہ اچھلنا کودنا، ناچنا کے ہیں اور معذور شخص کے چلنے کا انداز بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اچھلنا کودنا کے حوالے سے ڈاکٹر فقیر حسین ساگا لکھتے ہیں:

> "لڈی کی خاص پہچان یہ ہے کہ دونوں پاؤں پر باری باری اچھلا جاتا ہے جسے انگریزی زبان میں ہوپ (Hop) کرنا کہا جاتا ہے۔ اس اچھلنے کے عمل کے ساتھ ساتھ

دونوں ہاتھوں کو سر کے اوپر بلند کر کے کبھی دائیں طرف اور کبھی بائیں طرف چٹکیاں بجائی جاتی ہیں اور کبھی دونوں ہاتھوں کو کمر کے پیچھے لے جا کر جسم کو تھوڑا سا آگے کی طرف خم کرتے ہوئے تالیاں یا چٹکیاں بجاتے ہیں اور پھر سینہ کے سامنے تالی بجاتے ہیں۔"(۱۲)

ڈاکٹر ساگا نے لڈی ڈالنے کا مکمل طریقہ بھی بتا دیا ہے۔ اب جدید دور میں چٹکیوں کے بجائے دو عدد چھڑیاں یا لکڑی کے دو ڈنڈے (ڈانڈیاں) پکڑ کر بھی کی جاتی ہے۔ بعض شوقین قسم کے رقاص ڈنڈوں کے سروں پر چند گھنگھرو بھی لگوا لیتے ہیں جس سے ڈنڈوں کے کھڑاک کے ساتھ گھنگھروؤں کی جھنکار بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اس لفظ کے استعمال سے قاسمی صاحب نے پنجابی معاشرے اور ثقافت کا بھرپور انداز میں اظہار کیا ہے اور اسے بڑے ہی لطیف انداز کو بیان کیا ہے جس میں جگتوں سے محظوظ کیا جاتا ہے۔ کسی بھی معاشرت میں اس کے باشندوں کے لباس کا خاص عمل دخل ہوتا ہے۔ پنجابی معاشرت کے لباس کی جھلک کے لیے:

"دھوتی کا صحیح استعمال اگر میں نے کسی کو کرتے دیکھا ہے تو وہ اپنا جورا پہلوان ہے۔ اس نے منشا یاد کے علامتی افسانے تو نہیں پڑھے لیکن وہ دھوتی کے علامتی استعمال سے بخوبی واقف ہے، جورا ایک دشمن دار آدمی ہے۔ وہ جب گھر سے سائیکل تھامے نکلتا ہے تو تنگ گلی کی وجہ سے وہ اس پر سوار نہیں ہوتا بلکہ سواری کے لیے کھلی گلی کا انتظار کرتا ہے، لیکن اگر وہ سامنے سے اپنے دشمن کو آتا دیکھ لے تو پہلے کھنگورا مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے اور پھر ایک پاؤں پیڈل پر رکھ کر دوسری ٹانگ کو فضا میں پوری طرح پھیلا کر گدی پر سوار ہو جاتا ہے۔ دھوتی اور بنیان میں ملبوس جورا پہلوان اگر سائیکل کے بغیر ہو تو دشمن کو سامنے پا کر دھوتی کے پلو سے ہوا لینے لگتا ہے اور سردیوں میں بھی کہتا جاتا ہے "بڑی گرمی ہے، بڑی گرمی ہے"(۱۲)

دھوتی پنجاب کا مخصوص لباس ہے۔ دھوتی کے ساتھ کھلا کُرتا لباس کی تکمیل کرتا ہے۔ دھوتی کی بھی کئی اقسام ہیں اور یہ ساری کی ساری پنجاب کے ساتھ وابستہ ہیں۔ عموماً ان دھوتیوں کو تین طرح سے منقسم کیا ہے۔ لوکل دھوتی، پنجابی دھوتی اور اردو مہاجر دھوتی۔ بھارتی وزیر اعظم واجپائی صاحب بھی دھوتی استعمال کرتے تھے اور وہ اسی دھوتی کے ساتھ پاکستان بھی آئے تھے۔ دھوتی کے باندھنے کے حوالے سے سلیم حسن مرزا تھوڑا مزاحیہ انداز میں لکھتے ہیں:

"لوکل دھوتی پنجاب میں باندھی جاتی ہے۔ یہ ٹخنوں تک ہوتی ہے اس کے بھی لڑ اور ڈب ہوتے ہیں لڑ بالشت بھر کے ہوتے ہیں، اس لیے کسی کام نہیں آسکتے، ڈب البتہ کار آمد ہوتے ہیں مگر ان میں مونگ پھلیوں، بھنے ہوئے چنوں، ریوڑیوں اور بیروں کے علاوہ کچھ بھی رکھا جاسکتا ہے۔"(۱۴)

عطاالحق قاسمی نے جہاں معاشرت کے دیگر زاویوں کو مدنظر رکھا ہے وہاں اس مخصوص پہناوے کے ثقافتی و سماجی اثرات کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ پنجاب میں دھوتی، تہبند یا مجھلا باندھ کر گھروں میں رہنا اور پھر دیہات میں ڈیروں وغیرہ پر تو جایا جاسکتا ہے اور آرام کیا جاسکتا ہے مگر دفتروں میں جانے کے لیے شلواریں اور پتلونیں پہننا پڑتی ہیں۔ یہ خالص پنجابی ثقافت کی علامت ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اس مخصوص لباس کو خاص اہمیت دی ہے۔ ان کا ایک مکمل مضمون "دھوتی دھوتی ہے" کے عنوان سے اس لباس پر ہے۔ جس میں انھوں نے دھوتی کے پس منظر میں پنجابی معاشرت کی خوب عکاسی کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اس لباس کی پنجاب کی معاشرت میں کتنی اہمیت ہے۔ انھوں نے جورا پہلوان کے کردار کے ذریعے دھوتی کو نمایاں کیا ہے۔ اردو میں پنجابی ملبوسات کی عکاسی مختلف انداز میں ملتی ہے۔ قاسمی کے ہاں بھی مختلف پنجابی ملبوسات خاص طور پر دھوتی کا بیان خاصے لطف کے انداز میں ہوا ہے۔ دھوتی وہ لباس ہے جو بغیر سلائی کے تہبند کی صورت میں باندھا جاتا ہے۔ یہ پنجاب کا مخصوص لباس ہے جس پر مختلف انداز کی رنگ دار لکیریں بنی ہوتی ہیں بعض دھوتیوں میں تلّے کی تاریں بھی بُنی ہوتی ہیں۔ ہر دھوتی کے حوالے سے یہ بات بھی اہم ہے کہ یہ گرمیوں کا پہناوا ہے۔ پنجاب میں لوگ اسے نہ صرف تہبند کے طور پر باندھتے ہیں بلکہ گرمی میں جب پسینے سے شرابور ہو جائیں تو اس کے پہلو سے ہی ہوا بھی لینے لگتے ہیں اور پلو سے ہی پسینہ بھی صاف کرتے ہیں۔ عطا الحق قاسمی نے اسی معاشرتی انداز کو لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔

مثبت سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ منفی سرگرمیاں بھی معاشرتی ماحول میں موجود ہیں۔ شراب نوشی اور نشے کے عام استعمال کو قاسمییوں بیان کرتے ہیں۔

"میں نے دیکھا استاد کا گلاس خالی تھا اور ایش ٹرے میں پڑا ہوا سگریٹ بھی بجھ چکا تھا۔ میں گلاس اور سگریٹ دونوں "بھر" کر استاد کو پیش کیے۔ استاد نے بھرے ہوئے سگریٹ کا سُوٹا لگایا اور اور گلاس "ڈیک" لگا کر خالی کر دیا۔"(۱۵)

"سگریٹ بھرنا" ایک ایسی معاشرتی برائی ہے جس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ سگریٹ نوشی ویسے ہی قبیح عمل ہے اور جب اسے چرس یا کسی اور نشہ آور چیز کو تمبا کو میں ملا کر بھرا جاتا ہے اور پھر سگریٹ نوشی کی جاتی ہے تو نشے کیبہ عادت چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ خاندانوں کی بربادی اس قبیح عمل سے ہو رہی ہے۔ قاسمی صاحب نے شراب نوشی اور نشہ کے استعمال کو "میں نے گلاس اور سگریٹ دونوں بھر کر استاد کو پیش کیے" کے ایک جملے میں یوں بیان کیا ہے کہ پنجابی لفظ "بھر" نے پورا سماجی منظر نامہ سامنے پیش کر دیا ہے۔ اور پھر قاسمی صاحب نے "کش" کے بجائے پنجابی لفظ "سُوٹا" استعمال کیا ہے جو اپنے اندر ایک ثقافتی اور تہذیبی اقدار لیے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ اسی جملے میں گلاس کا "ڈیک" لگا کر خالی کرنا بھی خوب لطیف انداز ہے۔ "ڈیک" مشروب پینے کے اس انداز کو کہا جاتا ہے کہ جس میں پینے والا گلاس کو منہ لگاتے ہی ایک ہی سانس میں سارا مشروب پی جاتا ہے۔ شراب نوشی کا یہ انداز جو قاسمی نے بیان کیا ہے معاشرتی عکاسی کی بہترین مثال ہے۔

شادی بیاہ کی رسومات میں خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ اس خوشی سے بعض مفت خورے جس انداز میں فائدہ اٹھاتے ہیں وہ بھی پنجابی معاشرے کا ایک اہم عنصر ہے۔

> "یہاں باراتیوں کے علاوہ بھی دوسرے لوگ زرق برق کپڑے پہنے آتے ہیں اور کھانا کھا کر چلے جاتے ہیں۔ لڑکے والے سمجھتے ہیں یہ لڑکی والوں کے مہمان تھے اور لڑکی والے انہیں باراتی سمجھ کر ان کی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ داتا دربار کے بعد یہ دوسری جگہ ہے جس کے لنگر سے روزانہ بیسیوں مسکین اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے ہیں۔"(۱۶)

اس بیان میں ایک ایسی معاشرتی عادت کا بیان کیا گیا ہے جس میں مفت خورے لوگ جان بوجھ کر دوسروں کو دھوکا دیتے ہوئے شادی کے موقع پر مفت کا کھانا کھانے چل دیتے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا وہ غلط رواج ہے جس میں چند روپوں کے کھانے کی خاطر لوگ دوسروں کو دھوکا دینے سے بھی باز نہیں آتے۔ یہ صورت حال عام طور پر شادی ہالوں میں ہونے والی دعوتوں میں زیادہ مطالعہ میں آتی ہے۔ معاشرے کا یہ مفت خور طبقہ انتہائی گھٹیا حرکات کا مرتکب ہو کر معاشرتی اقدار کو پامال کر رہا ہوتا ہے اور پھر کھانے کے بعد اس پر فخر بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

معاشرے کی منفی اقدار کو دیکھا جائے تو سفارش، رشوت اور اقربا پروری ایسے ناسور ہیں جو قابل اور اہل لوگوں کا استحصال کر رہے ہیں۔ معاشرے میں سفارش کے حوالے سے بہت سے ادیبوں نے لکھا ہے قاسمی کا اعجاز یہ ہے کہ انھوں نے سفارش کرنے والے اور جس کو سفارش کی جا رہیہے اس کے باہمی تعلق کو بھی خوب واضح کیا ہے۔ دونوں میں اس بات پر اتفاق ہوتا ہے کہ ہر سفارش کو درخور اعتنا نہیں سمجھنا۔

> "جناب! صاحب نے آپ کا رقعہ پھاڑ کر ٹوکری میں پھینک دیا اور بولے تم جس شخص کا رقعہ لے کر آئے ہو، وہ نہایت واہیات آدمی ہے چنانچہ تمہارا کام اگر ہونا بھی تھا تو اب نہیں ہو گا، اس نے جناب کے بارے میں اور بھی بہت سی فضول باتیں کیں او رپھر چپراسی سے کہا اسے باہر نکال دو۔ جناب مجھے اپنے کام نہ ہونے کا کوئی افسوس نہیں لیکن جناب کی جو "بیزتی" ہوئی ہے اور صاحب کے رویے سے جو اندازہ ہوا ہے کہ شہر میں آپ کی "ٹکے" کی عزت نہیں، اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔"(۱۷)

رقعہ پھاڑ کر ٹوکری میں پھینکنے کے پس منظر میں وہ امر شامل ہے جس میں دونوں احباب نے پہلے ہی ایک دوسرے سے طے کر رکھا ہوتا ہے کہ آنے والے کا کام نہ ہو الٹا اس کو ایسی سنائی جائیں کہ وہ سفارش کرنیوالے کے حوالے سے بدگمان بھی نہ ہو مندرجہ بالا اقتباس میں ایسی ہی صورت حال بیان کی گئی ہے۔ اس اہم معاشرتی رویے کو قاسمی صاحب نے پنجابی الفاظ "بیزتی" اور "ٹکے" کے استعمال سے جس طرح بیان کیا ہے اس سے پنجابی معاشرت کے اس عنصر کی پنجابی انداز میں ہی عکاسی موجود ہے "بیزتی" یہاں بے عزتی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ دوسرا لفظ "ٹکے" کا استعمال ہے۔ ٹکے سے مراد بہت معمولی، حقیر سی۔ بنگلہ دیش کے ہاں روپیہ کے مقابلے میں 'ٹکا' استعمال ہوتا ہے یعنی ان کی کرنسی کا نام "ٹکا" ہے اس حوالے سے یہ پنجابی لفظ بولا جاتا ہے۔ کیوں کہ ٹکے کی قدر بہت کم ہوتی تھی پھر یہ محاورہ بولا جاتا ہے کہ آپ کی تو "ٹکے" جتنی عزت نہیں ہے۔ یہ محاورے کا استعمال قاسمی صاحب نے بھی کیا ہے۔ یوں پنجابی لوگوں کی زبان کے الفاظ کے استعمال نے تحریر کی تاثیر میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ سفارش کے حوالے سے ایک اور دلچسپ واقعہ ملاحظہ ہو:

> "ایک گاؤں سے میرے ایک جاننے والے کی وساطت سے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور کہا "ایک چھوٹا سا کام ہے، اس کے لیے آپ کے پاس آتے ہوئے شرم آتی تھی لیکن چودھری صاحب نے کہا کہ وہ صرف آپ ہی کو جانتے ہیں" میں نے کہا

"کوئی بات نہیں آپ کام بتائیں"بولے "یہ جو جناب آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے، اس نے مخالفوں کے تین چار بندے لا دیئے ہیں (قتل کر دیئے ہیں) اب پولیس اسے گرفتار کرنے کے لیے گھر پر چھاپے مار رہی ہے، گھر میں پردہ دار بیبیاں ہیں، ہم عزت دار لوگ ہیں، ذرا آئی جی صاحب کو فون کر کے ان پولیس والوں کی پتلون تو اتروائیں۔"(۱۸)

پنجابی معاشرت میں "ہٹ دھرمی" اور سینہ زوری کے بھی اپنے ہی تصورات ہیں۔ ایک طرف تین چار لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے اور دوسری طرف اس بارے میں سفارشیں کروائی جاتی ہیں کہ قاتل کو پولیس ہاتھ بھی نہ لگائے۔ اور آڑ یہ بنائی جاتی ہے کہ گھر میں پردہ دار بیبیاں ہیں اور ہم عزت دار لوگ ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو منفی عناصر کے نزدیک عزت داری اور شرافت کے اپنے ہی معیار ہیں۔ یہ لوگ خود کو تمام قوانین سے بالاتر سمجھتے ہیں اور پولیس کی تو ان کے نزدیک اہمیت صرف ایک فون کال جتنی ہے کہ جو مرضی کرتے پھرو اور جب گرفتاری کی نوبت آئے تو اثر ورسوخ استعمال کر کے پولیس کو اپنے ساتھ ملا لو۔ ہمارے معاشرے میں ایسے واقعات روز دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جن میں پولیس مجرموں کی پشت پناہی کرتی نظر آتی ہے۔ قاسمی صاحب نے اس امر کی بخوبی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے قتل کے عمل کے لیے "بندے لا دیئے" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ بندہ لا دینا پنجابی میں بندہ قتل کر دینے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہاں قتل کی بجائے "لا" کا استعمال کر کے پنجابی معاشرت کی خوب عکاسی کی گئی ہے۔

منفی عناصر کے ساتھ ساتھ پنجابی معاشرے میں مثبت اور خیر خواہ عناصر کی بھی کمی نہیں ہے۔ اس امر کے لیے ذیل کا بیان دیکھیے۔

"شادی کے دو تین روز بعد مائی خیر اں اپنے کام پر واپس آئی تو میری اہلیہ نے اس سے پوچھا "تم نے اپنی اتنی محنت کی کمائی فضول شوشا پر کیوں ضائع کی؟" مائی نے جواب دیا۔ "شامیانوں اور قناتوں کا کرایہ شیخ صاحب نے وصول نہیں کیا، میں بیس سال سے ان کے گھر میں کام کر رہی ہوں، کارڈ قیوم صاحب نے مفت چھاپ دیئے تھے، ان کا اپنا پریس ہے، البتہ بیروں اور کپڑے لتے کا خرچہ ہمارا اپنا تھا۔"(۱۹)

پنجابی معاشرت میں رواداری، خلوص اور ہمدردی کے جذبات بخوبی ملتے ہیں۔ خاص طور پر وہ غریب طبقہ جو دوسروں کے گھروں میں کام کر کے اپنی روزی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں ان کے حوالے سے لوگوں

کے دلوں میں نرم گوشہ پایا جاتا ہے۔ لوگ ایسے لوگوں کی خوشیوں کو دوبالا کرنے کے لیے اپنی استطاعت بھر مدد کرتے ہیں۔ وہ لوگ جن کے گھروں میں یہ لوگ کام کرتے ہیں ان سے یہ اچھے کی توقع بھی رکھتے ہیں۔ سوئے اتفاق اگر ان کو کوئی ایسا کام پڑ جائے جو ان کے "صاحب" کے اختیار میں ہو تو بہت سے صاحب لوگ ان کی خوب مدد کرتے ہیں اس بیان میں بھی معاشرت کے اس اہم پہلو کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو معاشرے میں مثبت اقدار کے فروغ میں معاون ثابت ہوا ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس میں "شوشا" اور ایک اور لفظ "کپڑے لتے" استعمال ہوا ہے۔ دونوں پنجابی تہذیب و ثقافت کے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ غریب طبقہ ہمیشہ "شو شا" میں مارا جاتا ہے۔ اس کو اردو میں دکھاوا کہتے ہیں۔ امیروں کی تقلید میں یہ غریب طبقہ بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر جھوٹی "شوشا" میں اجڑ جاتا ہے۔ سروں پر قرض چڑھ جاتے ہیں۔ اور پھر ساری عمر قرض اتارتے گزر جاتی ہے۔ دوسرا لفظ "کپڑے لتے" استعمال ہوا ہے۔ یہ بھی پنجابی میں خوب استعمال ہونے والا لفظ ہے جو بھرپور انداز میں پنجابی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کر رہا ہے۔ گھروں میں کام کرنے والے اس غریب طبقے کی اپنی خواہشات پنجابی معاشرے کا اہم جزو ہیں۔

> "خود میرے اور رجو کے ابا کی بھی خواہش تھی کہ ہم اپنی رجو اور جورے کی جتنی ریجھیں پوری کر سکتے ہیں، پوری کریں، ہم صبح سے رات تک انہی کے لیے تو محنت کرتے ہیں، ورنہ ہم بڈھے بڈھی نے تو دو وقت کی روٹی ہی کھانی ہے، وہ کہیں بھی جا کر پڑ رہیں مل جائے گی۔" (۲۰)

اس اقتباس کو دیکھا جائے تو معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کی خواہشات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے اپنی خواہشات سے زیادہ اپنے بچوں کی خوشیاں اور خواہشات عزیز ہوتی ہیں۔ مشرقی معاشرے میں یہ ایک بڑا عنصر ہے کہ والدین اپنے بچوں کے لیے اپنی خواہشات کو قربان کر کے رکھ دیتے ہیں وہ اپنے بچوں کو دنیا کی تمام آسائشیں مہیا کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی زندگی تک کو داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

عطا الحق قاسمی نے معاشرے کے اس اہم ترین زاویے کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ والدین خود اپنی خواہشات کو محض دو وقت کی روٹی تک محدود رکھتے ہیں اور اپنے بچوں کی تمام خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں۔ عطا الحق قاسمی نے اس صورت حال کو بیان کرنے کے لیے جو انداز تحریر اپنایا ہے اس میں انھوں نے پنجابی الفاظ کو اس طرح سمویا ہے کہ اس غریب پسے ہوئے طبقے کی لسانی صورت حال بھی سامنے آجاتی

ہے۔ انھوں نے خواہشات کی بجائے پنجابی لفظ "ریجھیں" استعمال کیا ہے۔ جس کردار کے منہ سے یہ الفاظ ادا کروائے جارہے ہیں وہ بھی ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو معاشرے کے اشرافیہ کے گھروں میں کام کاج کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہی ہے۔ اس کے بیٹے اور بیٹی کی شادی پر لوگ اس کی مختلف انداز میں مدد کرتے ہیں۔ جب خاتونِ خانہ اس سے یہ کہتی ہے کہ وہ اس "شوشا" کاموں کے بجائے سادگی سے شادی بیاہ کی رسم کو پورا کرلیتے تو اس وقت مائی کے اندر کی ممتا جاگ اٹھتی ہے وہ اپنے بچوں کی تمام خواہشات کا ذکر کرتی ہے کہ دوسرے بچوں کی طرح ان کے بچوں کی بھی خواہشات ہیں جن کو پورا کرنے میں وہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ہم بڑھا بڑھی نے تو دو وقت کی روٹی کھانی ہے" ان کی اپنی خواہشات کا گلہ گھونٹ کر اپنے بچوں کی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ معاشرے میں ان غریبوں کی نسبت دولت مند لوگ زیادہ فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔ عطا الحق قاسمی کے بقول:

> "ہم تو اب تک یہی سمجھتے تھے کہ دولت انسان کو ہنساتی ہے مگر اب پتہ چلا کہ دولت انسان کو رلاتی بھی بہت ہے۔ اگرچہ ہم نے دولت مندوں کو ہمیشہ روتے دیکھا ہے کہ کاروبار بہت مندا جارہا ہے مگر یہ تو محاورے والا رونا تھا، یہ بھید تو ہم پر اب کھلا کہ پیسہ انسان کو باقاعدہ آنسوؤں سے رلاتا ہے۔"[۲۱]

کاروبار کا "مندا" ہونا سے مراد کاروبار کا خسارے میں جانا ہے۔ پنجابی معاشرے میں کاروباری طبقے سے جب بھی کسی امر میں مدد مانگو تو سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اسی بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ کاروبار خسارے میں جارہا ہے۔ یہ ایسا مقولہ بن چکا ہے جس سے معاشرے میں پھیلی خود غرضی نمایاں ہوتی ہے۔ لاکھوں کروڑوں میں کھیلنے والے ذہنی اور فکری حوالے سے کس پستی کا شکار ہیں اس کی عکاسی اسی ایک لفظ "مندا" سے ہوتی ہے۔ کاروباری طبقے کی بات کی جائے تو فی زمانہ حال معاشرے میں کاروبار کی نت نئی صورتیں سامنے آرہی ہیں ان کاروباروں میں ایک اہم بزنس فائیو سٹار ہوٹل ہیں۔ یہ ہوٹل ان سرمایہ داروں کی ملکیت ہیں جن کے ہاں پیسے کی فراوانی ہوتی ہے اور اسی فراوانی سے وہ مزید پیسے بنانے کا کام لیتے ہیں۔ یہ سرمایہ دار معاشرے کے لوگوں کو کس طرح اپنے جال میں پھنساتے ہیں۔ عطا الحق قاسمی نے اس کی بخوبی عکاسی کی ہے۔

> "ہر فائیو سٹار ہوٹل میں ایک نہ ایک "گھنڈی" ایسی رکھ دی جاتی ہے کہ ہر دفعہ جھجکتے جھجکتے ہوٹل کے ملازم کو بلانا پڑتا ہے اور اسے اعتماد میں لے کر پوچھنا پڑتا ہے کہ بھائی بتی کس طرح جلائی جاتی ہے اور فلش کس طرح چلایا جاتا ہے۔ اس کے

جواب میں وہ موذی آپ کو اس طرح سے دیکھتا ہے جیسے کہہ رہا ہو کہ "پتہ نئیں
کتھوں آجاندے نیں"(۲۲)

عطا الحق قاسمی کی معاشرے پر گہری نظر ہے۔ وہ اس امر کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ زندگی گزارنے کی تمام آسائشیں مہیا کرنے کے باوجود ان آسائشوں کے استعمال میں یہ فائیو سٹار ہوٹل کے مالکان اور منتظمین کوئی نہ کوئی ایسی "گھنڈی" رکھ دیتے ہیں کہ لوگ پیسا خرچ کرنے کے باوجود ان کے محتاج بن کر رہ جاتے ہیں۔ "گھنڈی" پنجابی کا ایسا لفظ ہے جو کسی ایسے عقدے کے طور پر استعمال ہوتا ہے جسے انسان حل کرنیکی صلاحیت نہ رکھتا ہو۔ یا انسان کے پاس صلاحیت ہو بھی تو اس کا حل اس کی نظروں سے جان بوجھ کر اسے محتاج بنانے کے لیے چھپایا ہو۔ قاسمی صاحب نے "گھنڈی" کا لفظ استعمال کرکے معاشرے کے اس منفی رویے کو نمایاں کیا۔ سفید پوشی بہت سے عیوب کا بھرم رکھ لیتی ہے لیکن معاشرے میں سفید پوش بھی کئی قسم کے ہیں مثلاً

"سفید پوش وہ ہے جو ماسی برکتے کے تندور سے کھانا کھا کر نکلے اور ہوٹل ہلٹن کے باہر کھڑے ہو کر خلال کرتا پایا جائے مگر کچھ سفید پوش ایسے بھی ہیں جن کا "مفتا" اگر کسی فائیو سٹار ہوٹل میں لگ جائے تو وہاں سے کھانا کھا کر نکلتے ہیں اور عادتاً ماسی برکتے کے تندور کے سامنے کھڑے ہو کر خلال کرنے لگتے ہیں۔"(۲۳)

یہ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ سفید پوشی کی آڑ میں ہم اپنی اصلیت چھپانے میں لگے رہتے ہیں۔ مندرجہ بالا بیان کو دیکھا جائے تو اس میں استعمال ہونے والا منظر نامہ پنجابی معاشرت کی بہترین عکاسی کرتا نظر آتا ہے۔ پنجابی معاشرے میں تنور اور ماسی کا تعلق خاصا گہرا ہے۔ تنور پر روٹیاں پکانے والی خواہ کسی بھی عمر کی ہو سب کے لیے وہ ماسی ہی ہوتی ہے۔ سب اسے ماسی کے لقب سے ہی یاد کرتے ہیں پنجابی معاشرے کا یہ ایک اہم کردار ہے جسے عطا الحق قاسمی نے پنجابی سماجی منظر نامے میں ہی بیان کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سفید پوشوں کے دو طرح کے طبقے بیان کیے ہیں ایک وہ ہیں جو اپنی اصلیت چھپا کر دوسروں سے خود کو برتر کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کھانا تو ماسی برکتے کے تندور سے کھاتے ہیں لیکن خلال کرنے کے لیے کسی فائیو سٹار ہوٹل کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں اور یوں ظاہر کرتے ہیں گویا کہ ابھی ابھی اسی بڑے ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلے ہیں۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو ہمارے آج کے معاشرے میں بھی یہ صورت حال نظر آتی ہے۔ آج بھی اکثر لوگ مختلف اہم مقامات، اچھے ہوٹلوں یا بڑے پارکوں تک اگر کسی طرح رسائی حاصل کرلیں تو وہ اس موقع کو

غنیمت جانتے ہوئے اس کی خوب تشہیر کرتے ہیں۔ تصویریں اور سیلفیاں بنا کر سوشل میڈیا کی زینت بناتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر سٹیٹس لگاتے ہیں تا کہ لوگوں میں برتر مقام حاصل کرنے کی خواہشات کی تسکین ہو سکے۔ یہ دراصل ہمارے معاشرے کے باشندگان کا نفسیاتی مسئلہ ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت سے مطمئن نظر نہیں آتے اور دوسروں جیسا نہ بن سکنے پر ان جیسا بنا ہوا دکھانا چاہتے ہیں۔ معاشرے کے اس رویے کی عکاسی قاسمی صاحب نے خوب کی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے معاشرے کی مختلف رسومات اور خوشیوں کے مواقعوں کو بھی ہماری معاشرت کے پس منظر میں ظریفانہ انداز میں بڑی خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون میں سالگرہ کی تقریب کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سالگرہ کے موقع پر کیک کاٹا جاتا ہے جس کی ایک ایک "پھاڑی" حاضرین میں تقسیم کر دی جاتی ہے، اس میں یقیناً کوئی مصلحت ہو گی۔"[۲۴]

سالگرہ کی تقریب وہ تقریب ہوتی ہے جو عمر کا سال مکمل ہونے پر گھر والے کرتے ہیں۔ مشرق اور خاص طور پر پنجابی معاشرے میں بھی اس کا رواج عام ہو تا جا رہا ہے۔ اس میں جو کیک کاٹا جاتا ہے اس کی مختلف کاشیں کر کے تقریب کے شرکاء میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ عطا الحق قاسمی نے کیک کی کاش کے لیے لفظ "پھاڑی" استعمال کیا ہے۔ پھاڑی کسی پھل یا سبزی کے کاش کی شکل میں کاٹے ہوئے ٹکڑے کو کہا جاتا ہے۔ یوں عطاء الحق قاسمی نے کیک کے ٹکڑے کو کسی پھل کی کاش سے تشبیہ دی ہے۔ اس کے لیے "پھاڑی" کا لفظ برتا ہے۔ قاسمی صاحب پھاڑی کو پنجابی معاشرت کے تناظر میں استعمال کرتے ہیں اور آگے چل کر اس کی توجیہہ بیان کرتے ہیں کہ اس سے تقریب کے شرکاء کے منہ بند رکھے جا سکتے ہیں۔

قاسمی صاحب کا مشاہدہ خاصا وسیع ہے۔ وہ پنجابی معاشرت کا بڑی عمیق نظری سے جائزہ لیتے ہیں یہاں تک کہ سرمہ ڈالنے جیسے چھوٹے سے عمل کو پاکستانیوں کی مہم جوئی سے تعبیر کرتے ہیں۔

"میں نے پاکستانیوں سے زیادہ مہم جو قوم کوئی اور نہیں دیکھی وہ اتنے Risky کام کرتے ہیں کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ مثلاً یہاں پر گھر میں تانبے کی ایک چھوٹی بوتل ہوتی ہے جس میں لوہے کی ایک پتلی سی سلائی ہوتی ہے۔ بوتل کو سرمہ دانی اور سلائی کو سرمچو کہا جاتا ہے۔۔۔ گھر کے تمام افراد ایک ہی سرمچو باری باری اپنی آنکھوں میں پھیرتے ہیں انہیں یقین ہے کہ اس سے بینائی بہتر ہوتی ہے تاہم اس عمل سے بینائی ختم ہونے کا بھی خدشہ لاحق رہتا ہے۔"[۲۵]

"سرمچو" اور "سرمہ دانی" مشرقی معاشرے کے ہر گھر کی زینت ہیں۔ مغرب میں ان چیزوں کا تصور محال ہے وہاں ری میڈ کاجل اور اس نوع کی دیگر بہت سی چیزیں آرائشِ حسن کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی پچھلی چند دہائیوں سے مشرقی معاشرے میں ان کا رواج عام ہو گیا ہے۔ اور لوگ اس رسم میں بھی مبتلا ہوتے جا رہے ہیں۔ پنجابی معاشرے کی ایک اور اہم صورت حال جس کی عکاسی عطاالحق قاسمی کی تحریروں میں ملتی ہے وہ دکانداری نظام ہے اس نظام میں کسی دور میں چونی، اٹھنی کی کرنسی کا خاص عمل دخل ہوتا تھا یہ کرنسی کس طرح لوگوں کے لیے وبال جان بنی ہوتی تھی اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> "اب صورت حال یہ ہے کہ دکاندار اور گاہک دونوں حساب کتاب اس طرح کرتے ہیں کہ درمیان میں یہ چونیاں اٹھنیاں نہ آنے پائیں۔ اور اگر آہی جائیں تو تعلقات میں بگاڑ کا باعث نہ بنیں۔ جن کے پاس نہ نہ کرتے ہوئے بھییہ چونیاں اٹھنیاں آجاتی ہیں وہ پریشان رہتے ہیں کہ ان کا کیا کریں۔ اگر دس بارہ ہوں تو بندہ کہیں چلا دیتا ہے، اگرچہ وہاں یہ فقرہ سننا پڑتا ہے کہ باؤجی داتا دربار وں آئے ہو؟"(۲۶)

اس اقتباس کو دیکھا جائے تو پنجابی معاشرت کے دو رخ سامنے آتے ہیں ایک تو اس چونی، اٹھنی کی کرنسی کے استعمال سے دکانداروں سمیت دیگر طبقے کے لوگ بھی نالاں نظر آتے تھے۔ لوگ کرنسی سے جان چھڑانے کے چکر میں ہوتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح اس چھوٹی کرنسی کی بجائے کاغذی نوٹوں کی کرنسی سے کام چل جائے کیوں کہ اسے سنبھالنا اور گننا وقت کے ضیاع کا باعث بنتا تھا۔ لوگ اس کرنسی کو گداگروں اور فقیروں کو دے کر دعائیں لیتے تھے۔ چونی کی کرنسی روپے کے ایک چوتھائی جب کہ اٹھنی کی کرنسی نصف روپے کے برابر ہوتی تھی۔ اتنی چھوٹی کرنسی فقیروں کو دینے سے بھی وہ ایک خاص نگاہ سے دینے والے کو دیکھتے تھے۔ داتا دربار لاہور کی مشہور جگہ ہے جو حضرت داتا علی ہجویری کا مزار ہے اس مزار پر روزانہ ہزاروں کی تعداد میں عقیدت مند حاضری دیتے ہیں اور صدقہ خیرات کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں سائلین کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے یہ سائلین وہاں آنے والوں سے اکٹھی کر کے اپنی گزر بسر کرتے ہیں۔ جب چونی اٹھنی کی کرنسی ہوتی تھی تو لوگ چونکہ فقیروں کو ہی دیتے تھے اس لیے جب کوئی دکاندار بھی زیادہ تعداد میں چونیاں اٹھنیاں کہیں لے کر جاتا اس پر جگت کسی جاتی کہ داتا دربار سے مانگ کر لایا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی لفظیات کے معاشرتی تناظر کا جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ وہ ایسی لفظیات استعمال کرتے ہیں جو معاشرے میں رائج ہوتی ہیں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ہر نئے دن کے طلوع ہونے پر ہم خود کو دنیا کے مصروف ترین شخص سمجھتے ہیں اور ہر ملنے والے کے سامنے اپنی ان مصروفیات کا ذکر اس تفصیل سے کرتے ہیں کہ وہ دن اس تفصیل کے بیان میں ہی گزر جاتا ہے اور ہم

اج دادن وی ایویں ای لنگیا

کوئی وی کم نہ ہویا

گنگناتے ہوئے سو جاتے ہیں، چنانچہ ثابت ہو کہ "ویلے" آدمی سے زیادہ مصروف شخص اور کوئی نہیں ہوتا۔"(۲۷)

"ویلا" پنجابی میں فارغ شخص کو کہا جاتا ہے، پنجابی معاشرت کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں ہمیں قاسمی کی تحریر میں اس پنجابی لفظ کے استعمال کا بھی خوب سماجی منظر نامہ نظر آتا ہے۔ ہمارے ایک روز کے مشاہدہ کی بات ہے کہ اگر ہم کسی سے پوچھیں کہ آج کل کیا کر رہے ہو تو جواب ملتا ہے کہ فارغ ہوں لیکن اگر دوسرے دن اسی فارغ شخص کو کوئی کام کہا جائے تو جواب دیتا ہے کہ میرے پاس ٹائم نہیں۔ یہ ٹائم یا وقت کا نہ ہونا دراصل ان شخصی مصروفیات کی وجہ سے ہے جو فارغ انسان فارغ وقت میں کر رہا ہوتا ہے۔ وہ اپنی اس فرصت کی مصروفیات کو نفسیاتی طور پر ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ مصروف عمل رہتا ہے یا خود کو تصور کرتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کو پنجابی معاشرت کی لسانی صورت حال کا بھی خوب ادراک ہے۔ اسکی عکاسی ذیل کے اقتباس میں ملاحظہ ہو:

"میرا ایک دوست ہے جو ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا ہے چنانچہ میں اس کے بارے میں سب کچھ جاننے کا دعویٰ کر سکتا ہوں ویسے بھی وہ بہت "بڑبولا" قسم کا شخص ہے۔" (۲۸)

"بڑبولا" کا لفظ پنجابی میں زیادہ بولنے والے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے شخص کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے جو ہر وقت بڑے بڑے بول بولتا رہتا ہے۔ قاسمی نے پنجابی کا یہ منظر یہاں پر بہت برمحل استعمال کیا ہے اگر اس کی جگہ اس کا کوئی اردو متبادل استعمال کیا جاتا ہے تو شاید تحریر میں وہ تاثیر پیدا نہ ہو پاتی جو اب سامنے آ رہی ہے۔ یہاں لفظ بڑبولا ایسے شخص کو ظاہر کر رہا ہے جو ہر وقت اپنے ہیذ کر اور اپنی ہی خوبیاں گنوانے میں رطب اللسان رہتا ہے۔ پنجابی معاشرے میں مختلف طبقات زندگی بسر کر رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ سماج طبقاتی تفریق سے آزاد نہیں ہو پا رہا۔ مقامی طبقاتی تفریق کے ساتھ ساتھ۔۔۔

عام مشاہدے کی بات ہے کہ غیر ملکیوں خاص طور پر انگریزوں میں لوگوں کی خاص دلچسپی ہے۔ یہ دلچسپی ان کے لیے بعض اوقات طبقاتی کشمکش کو جنم دینے کا باعث بنتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں اس طبقاتی کشمکش کی بھی خوب عکاسی ملتی ہے۔

"میں نے سفر کے دوران محسوس کیا کہ جہاز کے مسافر میزبان عملے سے زیادہ خوش نہیں کیونکہ میرے پاس بیٹھا ہوا مسافر مسلسل گر مبل کر رہا تھا کہ مسافروں کی مناسب دیکھ بھال نہیں ہوتی تاہم مجھے یہ شخص قنوطی کیوں کہ میزبان عملے کا رویہ میرے ساتھ نہایت خوشگوار تھا اور اس وقت تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ شخص قنوطی ہے جب اس نے میری بات کے جواب میں کہا کہ تمہارے ساتھ ان کا سلوک اس لیے اچھا ہے کہ تم گوری چمڑی والو ہو اگر تم بھی "دیسی" ہوتے تو تمہیں ان کی میزبانی کا صحیح اندازہ ہوتا۔" (۲۹)

مسافر کا یہ بولنا کہ گوری چمڑی والے ہو اگر تم بھی "دیسی" ہوتے تو تمہیں میزبانی کا صحیح اندازہ ہوتا دراصل باشندگان معاشرہ میں پروان چڑھنے والی طبقاتی کشمکش اور طبقاتی تفریق کا نتیجہ ہے۔ معاشرے کا ہر فرد چاہتا ہے کہ اسے سب سے زیادہ اہمیت دی جائے اور وہ دوسروں کی نظروں میں زیادہ معتبر ٹھہرے۔ اس کے لیے وہ لاکھوں جتن بھی کرتے ہیں لیکن یہ سب کچھ اس وقت غارت چلا جاتا ہے جب کوئی غیر ملکی سامنے آتا ہے اور لوگ اس میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

"گوری چمڑی" اور "دیسی" پنجابی کے ایسے الفاظ ہیں جو ہمارے معاشرے میں عام مستعمل ہیں یہاں انگریزوں کو گورے کہا جاتا رہا ہے اور اب بھی پرانی وضع کے لوگ انہیں گورے ولایتی کے ناموں سے پکارتے ہیں جب اپنے دیس کے باشندوں کے ساتھ ساتھ دیس میں بننے والی ہر چیز کو دیسی کہا جاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی پنجابی معاشرت کی عکاسی کرتے ہوئے ان دونوں الفاظ کو بڑا برمحل استعمال کیا ہے جو پنجابی معاشرت میں طبقاتی تفریق کو سامنے لاتے ہیں۔

معاشرے کی منفی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو قول و فعل کا تضاد اور پھر غلط کام پر ڈٹے رہنے کا رحجان عام پایا جاتا ہے کوئی اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں۔ قاسمی صاحب نے پنجابی لفظیات کا استعمال کرتے ہوئے معاشرے کے اس وقت کو یوں بیان کیا ہے۔

"میں نے کہا ٹھیک ہے بس ایک احتیاط کرنا کہ میری کمر کو جھٹکا نہ لگے مجھے کمر کی دیرینہ تکلیف ہے "بولا" آپ فکر نہ کریں" اور دو قدم چلنے کے بعد ہی اس نے پوری بے دردی سے رکشتہ ایک "ٹوئے" پر سے گزارا جس سے میرا انجر پنجر ہل کر رہ گیا۔"(۳۰)

یہ ان کے ایک رکشے کی سفر کی روداد ہے جس میں انھوں نے منہ مانگے دام دینے کے باوجود خاصی تکلیف اٹھائی اور دھکے کھائے "ٹویا" پنجابی میں گڑھے کو کہا جاتا ہے اور سڑک پر موجود گڑھے کو انگریزی لفظ جمپ سے بھی پکارا جاتا ہے۔ قاسمی صاحب یہاں لفظ "ٹوئے" استعمال کر کے اسی جمپ کو سامنے لائے ہیں اور اس میں رکشہ اس طرح گزارنا کہ کمر کی تکلیف والا مریض چلا اٹھے۔ یقیناً تکلیف دہ عمل ہے۔ یہاں انھوں نے انجر پنجر کے ہل جانے کا مطلب ہی تکلیف ہے جو قول و فعل کے تضاد والے اس شخص کے ذریعے ان کو پہنچی۔ سیاست معاشرے کا اہم ستون ہوتا ہے کہ لیکن ہمارے معاشرے سیاست دان جو طریقہ اختیار کرتے ہیں قاسمی کی تحریروں میں اس کی بخوبی عکاسی ملتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ہم اہل مغرب لوٹے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے کیونکہیہ ہمارے ہاں نہیں ہوتا جب کہ پاکستان میں یہ برتن انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اس کے بغیر کوئی ٹائلٹ مکمل نہیں سمجھا جاتا، ایک لاہوریا مجھے بتا رہا تھا کہ لوٹوں کے بغیر کوئی پارلیمنٹ بھی مکمل نہیں ہوتی۔"(۳۱)

"لوٹا" ایک برتن کے علاوہ سماجی سطح پر ایسے سیاست دان کو کہا جاتا ہے جو ذاتی مفادات کی خاطر پارٹیاں بدلتا رہتا ہے اور اس کی مختلف تاویلیں پیش کرتا ہے۔ معنوی حوالے سے دیکھا جائے تو اس پارٹیاں بدلنے والے سیاست دان اور "لوٹا بمعنی برتن" میں یہ مشترک عنصر پایا جاتا ہے کہ دونوں کسی ایک کے نہیں ہوتے نہ ہی اپنی جگہ پر جم کر رہتے ہیں بلکہ جو ہاتھ میں لے اسی کے ہو جاتے ہیں۔

پاکستان میں سیاست کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس میں کثیر تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو کسی نظریے کے حامل نہیں۔ ان کا مطمع نظر محض اپنی ذات ہے اور وہ اپنی ذات کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہوتے ہین۔ ذاتی مفادات کی خاطر وہ اپنے ضمیر تک کا سودا کر دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ لوگوں نے ان کو ووٹ کس نظریے کے تحت دیئے تھے اور ان کے اس عمل سے معاشرے پر کیا اثر پڑے گا۔ ان کی نظر میں سب سے پہلے اپنا مفاد ہوتا ہے۔ قاسمی نے بڑے لطیف انداز میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سیاست

دانوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ ذاتی مفادات کے لیے پس پردہ عناصر سے ساز باز کر کے بھی اقتدار پر براجمان ہوتے ہیں۔ اس امر کی عکاسی ملاحظہ ہو:

> "یہاں رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی دکانیں شام تک بند رہتی ہیں ...... وہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا اور ایک بند دکان کے باہر آویزاں گتے پر لکھی عبارت پڑھنے لگا...... "رمضان کے احترام میں ہوٹل بند ہے، کھانا کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے تشریف لائیں"۔۔۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں پچھلے دروازے کا استعمال بہت عام ہے۔ لوگ سیاست اور اقتدار میں بھی پچھلے دروازے سے داخل ہوتے ہیں۔"[۳۲]

مشرقی معاشرے میں رمضان المبارک کے احترام کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کچھ مفاد پرست عناصر "مسافروں کے لیے" اور دیگر اس طرح کے انداز اپنا کر اپنے ہوٹلوں کا کاروبار چمکاتے رہتے ہیں اور سامنے ہوٹل کو احترام رمضان کے نام پر بند کر کے پچھلی جانب کے دروازے سے آنے کا کہتے ہیں۔ ضمیر فروش سیاست دان ذاتی مفادات کی خاطر اپنے ضمیر کا سودا کر کے اپنی پارٹی اور اپنے ووٹروں کے ساتھ دھوکا کرتے ہوئے اقتدار کی خاطر دوسروں کے ساتھ مل جاتے ہیں اس کے علاوہ چور دروازے سے اقتدار تک پہنچنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے۔ یہاں پچھلا دروازہ خاصے وسیع معنوں میں استعمال ہوا۔ سیاست دانوں اور معاشرے کے دیگر اہم لوگوں کے دوغلے پن نے معاشرے کو جس پستی میں دھکیل دیا اس سے ہر شخص کا سکون چھن گیا ہے۔ اس کی ایک جھلک قاسمی کی نثر سے ملاحظہ ہو:

> "ایک وقت تھا سیاست دانوں کے بیانات، شاعروں کا کلام، دانشوروں کی حکمت بھری باتیں، مشائخ کے روحانی مکاشفے، بہت لطف دیتے تھے لیکن جب سے سیاست دانوں کو بے اصولی کی سولی پر ٹنگے دیکھا ہے، جس سے شاعروں کا ظاہر ان کے باطن سے جدا پایا ہے، جس سے دانشوروں کی زبانیں ان کے پیٹ سے لگی دیکھی ہیں اور جب سے مشائخ کو پلاٹوں کی باتیں کرتے سنا ہے، سیاسی بیانوں، غزلوں، نظموں، دانشورانہ گفتگوؤں اور روحانی مکاشفوں کا مزہ جاتا رہا ہے۔"[۳۳]

یہ وہ معاشرتی رویے ہیں جنہیں قاسمی صاحب نے پنجابی لفظیات کا استعمال کرتے ہوئے پنجابی معاشرت کے منظر نامے میں بیان کیا ہے۔

☆ایک ثقافت کے دوسری ثقافت پر اثرات مرتب ہونے کی وجوہات

کسی بھی معاشرے کے افراد کا طرز زندگییا راہ عمل جس میں اقدار، عقائد، رسم ورواج اور معمولات اس قوم کی ثقافت کی تشکیل کرتے ہیں۔ ہر قوم کا اپنا ایک تہذیبی و ثقافتی تشخص ہوتا ہے اگرچہ اس تشخص کے بعض پہلو دوسری تہذیبوں سے بھی ملتے جلتے ہیں لیکن بعض انفرادی خصوصیتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ جو ایک قوم کی تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے الگ اور ممتاز کرتی ہیں اور ہر قومی تہذیب اپنی ان ہی انفرادی خصوصیات سے پہچانی جاتی ہے۔

ثقافت کسی معاشرے کے طرز فکر واحساس کا جوہر ہوتی ہے کسی قوم کو جسمانی طور پر غلام بنانا تو آسان ہوتا ہے مگر ذہنوں کو مسخر کرلیا جائے تو حاکم اور محکوم کا رشتہ ہوتے ہوئے بھی محکوم اس احساس سے عاری ہو جاتا ہے۔ اور یہ وہ صورت حال ہوتی ہے جو ایک ثقافت پر دوسری ثقافت کے اثرانداز ہونے کا سبب بنتی ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے قبل جو ثقافت رائج تھی اس میں پنجابی ثقافت کو عمل دخل خاصا زیادہ تھا۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب کی پنجابی ثقافت اپنے خاص خدوخال اور اپنی خاص پہچان کے باعث اپنا خاص ماضی اور تہذیبی ورثہ رکھتی تھی۔ انگریزوں کی آمد سے ہندوستان کے مختلف خطوں کی طرح جب پنجاب بھی انگریزوں کے زیر نگوں ہو گیا تو اس خطے کی ثقافت پر بھی انگریزی ثقافت کے اثرات پڑنے شروع ہو گئے جس کی وجہ سے یہاں ثقافت انگریزی ثقافتی رنگوں میں رنگتی چلی گئی۔ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد مسلمان انگریز سامراج سے سیاسی طور پر آزاد ہو گئے مگر ذہنی غلامی کے اثرات ہنوز مسلمانوں کے فکر و عمل، اجتہاد، تحقیق اور قیادت کو مفلوج کئے ہوئے ہیں۔ ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ صرف دو صورتوں میں ہی غلبہ حاصل کر سکتی ہے یا تو سیاسی غلبہ یا ذہنی غلبہ، ذہنی غلبہ اس صورت میں حاصل کر سکتی ہے، اگر ایک قوم دوسری قوم کے افکار و نظریات پر ایمان لے آئے اور دوسری قوم کے تخیلات، معتقدات، اپنے اذہان پر نقش کرے اور اپنے فکر و نظریات کو بھلا بیٹھے اور سیاسی غلبہ اس صورت میں کہ کوئی قوم مادی قوتوں میں ترقی کر جائے اور دوسری قومیں اس کے سامنے اپنی سیاسی آزادی برقرار نہ رکھ پائیں۔

جب مشرقی تہذیب مغربی تصورات کے زیر اثر آئی تو نہ صرف معاشی و اقتصادی، معاشرتی و سیاسی اور زندگی کے جملہ شعبہ جات میں جہاں زوال کا شکار ہوئی وہاں آج علمی و فکری اعتبار سے بھی زوال کا شکار ہو چکی ہے۔ لوگوں کو ذہنی و فکری جمود کا شکار کرنے کا مقصد اسلام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنا اور اسلام کے خلاف اہل مغرب کی دیگر سازشوں کا مقصد مغربی تہذیب کو اسلامی تہذیب پر غالب کرنا اور اسلامی

تہذیب کو ختم کرنا ہے اور اس کے لیے وہ خصوصاً تعلیم اور ذرائع ابلاغ کا سہارا لے رہے ہیں۔ اس تبدیلی نے زندگی کے دیگر شعبوں کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ثقافت میں بھی خاص انداز سے تبدیلی پیدا کی جس کی وجہ سے ہندوستان اور خاص طور پر پنجاب کی ثقافت پر انگریزی ثقافت کی یلغار ہوتی چلی گئی۔

ایک ثقافت کے دوسری ثقافت پر اثر انداز ہونے میں جن عوامل کا عمل دخل زیادہ ہوتا ہے ان میں سب سے اہم معاشی مفادات ہیں۔ دنیا کے کسی خطے کے لوگ جب کسی دوسرے خطے پر حملہ آور ہوتے ہیں تو ان کے پیش نظر زیادہ تر یہی معاشی مفادات ہوتے ہیں۔ معاشی مفادات کے حصول کے لیے جب کوئی قوم کسی دوسری قوم پر غلبہ حاصل کرتی ہے تو وہ مغلوب قوم کو ذہنی اور جسمانی دونوں حوالوں سے غلام بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کوشش میں وہ ایسی پالیسیاں نافذ کرتی ہے جو مفتوح قوم کی تہذیب، ثقافت اور رسم ورواج کو بدلنے کا سبب بنتی ہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد بھی خالص معاشی مفادات کے حصول کے تحت تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب ہندوستان کو اپنا مسکن بنایا تو ان کے ہاں یہاں کی دولت اور خام مال کو اپنی جدی ریاست کے استحکام کے لیے استعمال کرنا مقصد ٹھہرا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب کمپنی کو یہاں کی دولت میں رغبت ہوئی تو انگریزی سامراجیت کا ڈول ڈالا گیا جس کے نتیجے میں ہندوستان انگریزوں کے تسلط میں چلا گیا۔ انگریز سامراج نے یہاں کی دولت ہتھیانے کے لیے کارِ حکمرانی میں بھی دخل اندازی شروع کر دی۔ مقامی لوگوں کو اپنا مطیع بنانے کے لیے ان کی ذہنی اور فکری سطح پر تبدیلی پیدا کی گئی جس کے نتیجے میں ہندوستان کے مقامی باشندے بھی انگریزی ثقافت کو ہندوستانی ثقافت پر ترجیح دینے لگے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انگریزی ثقافت کی یلغار بڑھتی چلی گئی۔ انگریزی مصنوعات کی ہندوستان میں آمد سے جہاں انگریز کو معاشی سطح پر فائدہ حاصل ہوا وہاں ثقافتی حوالے سے بھی وہ فائدے میں رہے۔ انگریزی مصنوعات کی آمد نے ہندوستانیوں کے طرزِ زندگی کو بدلنے کے ساتھ ساتھ ان کی ثقافتی اور سماجی اقدار میں بھی تبدیلی پیدا کی جس کے نتیجے میں ہندوستان میں انگریزی ثقافت کے رنگ گہرے ہوتے چلے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک ثقافت پر دوسری ثقافت کے اثرات میں معاشی مفادات خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان معاشی مفادات کے حصول کے لیے سماجی اور ثقافتی اقدار میں تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غالب قوم کی ثقافت، مغلوب قوم کی ثقافتی اور سماجی اقدار پر حاوی ہوتی چلی جاتی ہے۔

پنجاب کی معاشرت کی طرح پنجاب کی ثقافت بھی رنگارنگی کی حامل ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہاں مختلف قوموں اور مختلف قبائل کا آباد ہونا ہے۔ پنجاب میں جو قومیں آباد ہیں ان میں بعض ایسی قومیں بھی ہیں جنھوں

نے برصغیر پر طویل عرصہ حکومت کی ہے ان میں مغل، راجپوت، رانا اور دیگر بہت سی قومیں شامل ہیں۔ ایک طویل عرصہ تک حکمرانی کرنے کی وجہ سے ان قوموں کی عادات، رسوم و رواج میں شائستگی اور رکھ رکھاؤ ملتا ہے۔ یہ رکھ رکھاؤ ان اقوام کو جہاں ایک خاص مقام عطا کرتا ہے وہاں ثقافتی حوالے سے بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ثقافت کی تشکیل میں یہ شائستگی اور رکھ رکھاؤ شامل ہونے سے پنجاب کی ثقافت ٹھوس بنیادوں پر کھڑی نظر آتی ہے۔

سماجی حوالے سے دیکھا جائے تو ان اقوام میں وہ پہلے جیسی تمکنت تو باقی نہیں رہی لیکن گھریلو سطح پر ان کے اطوار اور تہذیبی و ثقافتی عناصر میں خاص ثقافت ملتی ہے جو پنجابی ثقافت کو نمایاں کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جس قدر پنجاب میں بسنے والی اقوام میں تنوع پایا جاتا ہے اسی قدر اس کی ثقافت میں بھی متنوع انداز سامنے آتے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ تنوع فرداً فرداً نہیں بلکہ ایک لڑی میں پروئے ہوئے اس ہار کی مانند ہے جس میں مختلف اقسام کے پھول اپنی جداگانہ حیثیت کیبجائے مجموعی طور پر ہار کی خوب صورتی کو چار چاند لگا رہے ہوتے ہیں۔ پنجاب کی ثقافت کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔

پنجابی ثقافت کا تجزیہ کیا جائے تو قدیم ہندوستانی ثقافت کی بہت سی چیزیں پنجاب کی ثقافت میں ملتی ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر ہونے والی رسومات میں مایوں، مہندی، سہرا باندھنا، بارات اور خاص طور پر دولہے کی گاڑی کی سجاوٹ کے ساتھ ساتھ دیہات میں آج بھی نہ صرف گھڑولی بھری جاتی ہے بلکہ دولہے کو گھوڑی پر بٹھانے کی رسم عام ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بدلی ثقافتی اقدار کے اثرات بھی پنجاب اور خاص طور پر دیہاتی پنجاب میں بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسی طرح فوتیدگی کے موقع پر لوگوں کا ایک دوسرے کے دکھ، درد کو اپنا سمجھنا بھی سماجی سطح پر ثقافت کا بہترین اظہار ہے جس کا رشتہ ہمارے عظیم ماضی کی ثقافتی اقدار سے جاملتا ہے۔

جنوبی پنجاب کے علاقوں کی ثقافت کا اپنا ایک خاص حسن ہے۔ مختلف اولیاء کرام کے مزارات اور خانقاہوں پر عقیدت مندوں کی حاضری اور عقیدت کے اظہار کے طریقے ثقافتی تناظرات کو شاندار رعنائی عطا کرتے ہیں۔ اس ثقافتی تناظر میں جب ہم عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی ثقافت کی عکاسی کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کسی بھی ثقافت کے مختلف رنگ خوشی کی رسومات کے موقع پر کھل کر سامنے آتے ہیں۔ شادی بیاہ کی رسومات کے موقع پر پنجابی ثقافت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر

آتی ہے۔ اس مسرت انگیز موقع پر لوگوں کا طرز عمل کس طرح معاشرتی رویوں اور ثقافت کو نمایاں کرتا ہے۔ قاسمی صاحب کے ہاں اس کی عکاسی یوں ملتی ہے:

"بارات کی آمد کے بعد بارہ بجے سے لے کر ایک بجے تک دولہے کے دوستوں نے بھنگڑا ڈالنا ہوتا ہے اور بڑھکیں لگانی ہوتی ہیں۔ میں نے جب پہلی بار یہ منظر دیکھا تو میں سمجھا کہ لڑکے والے نکاح کرنے نہیں آئے، لڑکی کو اٹھانے آئے ہیں تاہم بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ محض خوشی کا اظہار ہوتا ہے۔" (۳۴)

اس اقتباس میں پنجابی ثقافت کی عکاسی بخوبی ملتی ہے اس کے ساتھ ساتھ قاسمی صاحب کا اعجاز یہ بھی ہے کہ انھوں نے پنجابی ثقافت کی عکاسی کرتے وقت پنجابی لفظیات ہی استعمال کی ہے۔ یہ پنجابی لفظیات اپنے اندر معنوی سطح پر خاص گہرائی اور گیرائی رکھتی ہیں۔ یہ ایسی لفظیات ہیں جو خود ہی ثقافتی عناصر کا درجہ بھی رکھتی ہیں مثلاً یہاں "بھنگڑا" اور "بڑھکیں" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بھنگڑا پنجابی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔ کوئی بھی پنجابی معاشرہ شادی بیاہ کی رسومات بھنگڑے کے بغیر ادا نہیں کرتا بلکہ شادی بیاہ کے علاوہ دیگر خوشی کے مواقع پر بھیبار دوست مل کر بھنگڑا ڈالتے ہیں اور بڑھکیں مارتے ہیں جو خوشی کے اظہار کا ہی ایک ذریعہ ہے۔

بھنگڑا صوبہ پنجاب کا ایک مقبول ترین لوک ناچ ہے۔ پنجاب کا کوئی اور ناچ اتنا مقبولیت کی بلندیوں کو نہیں چھو سکا جتنا کہ بھنگڑا، بھنگڑا قطعی وحتمی طور پر ایک مردانہ ناچ ہے تاہم ہماری پنجابی فلموں میں ہیروئن کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ بھنگڑا ناچتے بلکہ مردوں کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے جو کہ اصلاً درست نہیں ہے۔ کیونکہ بھنگڑا ایک مردانہ ناچ ہے۔ اس خالصتاً مرادنہ ناچ کی حرکات قوت طلب جوشیلی اور جلد تھکا دینے والی ہوتی ہے لہٰذا بھنگڑا ناچنے والوں کو بہت سکت اور ہمت یعنی سٹمینا(Stamina) چاہیے۔ بھنگڑا خاص طور پر فصلوں کے پکنے اور ان کی کٹائی کے موقع پر ڈالا جاتا ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر فقیر حسین ساگا لکھتے ہیں:

"کسان کے لیے اس سے زیادہ خوشی کا موقع کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی فصل اس کی آنکھوں کے سامنے پک کر سنہری ہو رہی ہو۔ دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں او رکھلیانوں میں گندم کی لہراتی ہوئی پیلی پیلی بالیاں دانوں سے بھر رہی ہوں۔ دھرتی جیسے سونا اگل رہی ہو اس وقت کسان خوشی سے پھولے نہیں سماتے۔ بھنگڑا کے لیے مناسب ترین وقت بیساکھی کا موقع ہے جو کہ ایک موسمی تہوار ہے اور بیساکھ کے مہینہ کی پہلی تاریخ کو منایا جاتا ہے۔۔ بیساکھی کے علاوہ دوسرے میلے ٹھیلوں او رعرسوں پر بھی اکثر بھنگڑا بڑے اہتمام سے ناچا جاتا ہے۔"(۳۵)

بھنگڑا پنجاب کا مقبول ترین ناچ ہے۔ بیساکھی میلے کے علاوہ عرس وغیرہ کے موقعوں پر بھی ناچا جاتا ہے۔لاہور کے مشہور میلہ چراغاں کے موقع پر بھی دور دراز کے مقامات سے بھی بھنگڑا ناچ پارٹیاں شالیمار باغ میں جمع ہو جاتی ہیں۔ حضرت مادھو لال حسینؒ کا عرس ہو یا حضرت داتا گنج بخشؒ کا، چادریں چڑھانے والے جلوسوں کے آگے آگے نوجوانوں کی ٹولیاں والہانہ انداز میں بھنگڑا ناچتی آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ کسی بھی بزرگ ہستی کا عرس ہو یا کسی صوفی شاعر کی برسی بھنگڑا ناچ ناگزیر ہے۔ مختلف کھیلوں کے مقابلہ جات کے موقع پر جیتنے والی ٹیمیں بھنگڑا ناچ کا اہتمام کر کے اپنے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ ڈاکٹر فقیر حسین ساگا مزید لکھتے ہیں:

"بھنگڑا ایک خوشی اور شادمانی کا ناچ ہے۔ ویسے بھنگڑا کے لیے کسی خاص وقت، موقع یا مقام کی قید نہیں۔ چاندنی رات میں کسی کھلے کھیت میں بیٹھے جوان ڈھول کی آواز پر جیسے بے قابو سے ہو کر بھنگڑا ناچنے لگ جاتے ہیں۔ غرض یہ کہ فصلیں بوئی جارہی ہوں یا کاٹی، سگائی ہو یا بیاہ، کبڈی کا میدان ہو یا کشتی کا اکھاڑہ، عرس ہو یا میلہ، کہیں بھی بھنگڑا کا سماں بندھ سکتا ہے اور اب تو بھنگڑا اندروں شہر بھی پہنچ گیا ہے کوئی سماجی تقریب ہو یا کوئی سیاسی جلسہ وہاں بھی بھنگڑا قطع نظر بیساکھی سے اپنی روایتی تعلق کے دھوم دھام سے ہوتا ہے۔"(۳۶)

بھنگڑا کے لیے کسی خاص لباس کی ضرورت نہیں ہوتی تاہم کھلے بازووں والا کُرتا زیب تن کیا جاتا ہے اور نیچے کوئی رنگینیا پھول دار دھوتی، تہبند یا لاچا پہنا جاتا ہے۔ سر پر پگڑی بھی رکھی جا سکتی ہے بعض رقاص کُرتے کے اوپر رنگین واسکٹ بھی پہننا پسند کرتے ہیں واسکٹ کے لیے اس پر گوٹا، کناری یا رنگدار فیتہ لگوا

لیتے ہیں۔ بھنگڑا کی کامیابی کا زیادہ تر انحصار ڈھول بجانے والے کی چابک دستی، ہنر مندی اور تجربہ کاری پر ہی ہوتا ہے۔اس حوالے سے فقیر حسین ساگا لکھتے ہیں:

"اچھا ڈھول والا دوران رقص اپنی نگاہ رقاصوں پر جمائے رکھتا ہے تاکہ وہ ان کی حرکات میں اچانک تبدیلی کے ساتھ اپنے ڈھول کا ٹھیکہ بھی فوراً بدل سکے اور ناچنے والوں کے ساتھ ساتھ کبھید ھیمی لے میں، کبھی برابر کی لَے میں اور کبھی دھرت یعنی تیز لَے میں متوازن چل سکے۔"(۳۷)

عطاء الحق قاسمی نے کمال ہنر مندی سے پنجاب کے اس لوک ناچ کو اپنی تحریر میں پیش کر کے پنجاب کی ثقافت کی بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے۔ پنجابی لفظیات کے ساتھ ساتھ وہ یہاں کی اقدار اور ثقافت کو بھی پیش کر رہے ہیں۔

پنجابی ثقافت میں توہمات، تعویز گنڈے اور اس طرح کے دیگر بہت سے عناصر بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ثقافت کی تشکیلی عناصر میں ان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہی وجہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں پنجابی ثقافت کی عکاسی میں یہ عناصر بھی خوب ملتے ہیں:

"ہم نے جنوں کے بارے میں جتنی شکایتیں سنی ہیں، ان کے مطابق تو یہ بہت عجیب و غریب قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ مثلاً کبھی کسی لڑکی پر عاشق ہو جاتے ہیں اور اس میں حلول کر جاتے ہیں جس پر عامل کو بلایا جاتا ہے جو مار مار کر لڑکی کا بھرکس نکال دیتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ یہ "چھینٹی" دراصل جن کو لگائی جاتی رہی ہے۔"(۳۸)

"چھینٹی" پنجابی کا لفظ ہے جس کے معنی مارنا کے ہیں۔ ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے ہین کہ جن نکالنے کی آڑ میں لڑکیوں کو کس طرح عامل مار مار کر ادھ موا کر دیتے ہیں۔ یہ دراصل ان توہمات کا شاخسانہ ہے جن کی بنا پر لوگ ان جعلی عاملوں سے رجوع کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی پنجابی ثقافت کی عکاسی کرتے وقت بعض اوقات مختلف علاقوں کی معاشرت او رثقافت کے ساتھ تقابل کی صورت بھی پیدا کر دیتے ہیں لیکن یہ تقابل طنزیہ انداز میں ہوتا ہے جس میں لفظی ہیر پھیر بھی خاص معنی رکھتا ہے۔ ذیل میں دیکھیے کہ کس طرح وہ پنجابی ثقافت کے مختلف عناصر کو یورپین عناصر سے طنزیہ انداز میں تعلق جوڑتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

"گفتگو کے علاوہ ہمارے ہاں چند مزاح نگار بھی ہیں جو اپنی نثر یا نظم کے ذریعے لوگوں کو گدگدی کرتے ہیں۔ پطرس بخاری، ابن انشا، شفیق الرحمٰن، کرنل محمد خان، سید محمد جعفری، دلاور فگار اور سید ضمیر جعفری تو وفات پا چکے۔ نثر کی بزرگ نسل میں صرف مشتاق احمد یوسفی ہیں جنہیں دنیا کے بڑے مزاح نگاروں کے مقابل رکھا جاسکتا ہے۔ انہیں اگر کوئی مات دے سکتا ہے تو وہ اردو اور انگریزی اخباروں کے چند اداریہ نگار ہیں جن کی تحریریں بظاہر سنجیدگی کے زمرے میں آتی ہیں لیکن در حقیقت وہ "مخولیا" تحریریں ہیں۔"(۳۹)

مخولیا پنجابی کا لفظ ہے جو اردو کے لفظ "ظریفانہ" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب نے یہاں ظریفانہ کی بجائے جو مخولیا کا لفظ استعمال کیا ہے یہ بھی خاصا بر محل ہے۔ ایک تو اس لفظ کے ذریعے وہ اداریہ نگاروں پر بڑے لطیف انداز میں طنز بھی کر گئے ہیں تو دوسری طرف اس لفظ کے معنی ظریفانہ کی بجائے زیادہ وسیع ہیں۔ ظریفانہ میں ظرافت پر مبنی تحریریں شامل ہوتی ہیں لیکن پنجابی لفظ مخولیا ہر اس عمل کے لیے بولا جاتا ہے جو ہنسی مذاق پیدا کرے، خواہ وہ ظرافت ہو، مزاح ہو یا پھکڑ پن کا مظاہرہ ہو۔ یوں اس مخولیا لفظ کے استعمال سے قاسمی صاحب نے ان اداریہ نگاروں کی تحریروں کے معیار بھی قاری کے سامنے پیش کر دیے ہیں کہ ان کی تحریریں صحافت اور ادب میں کس معیار کی حامل ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قاسمی کی تحریروں میں پنجابی لفظیات کا استعمال پنجابی معاشرت کے ساتھ ساتھ پنجابی ثقافت اور اس ثقافت سے جڑے مختلف عناصر کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ پنجابی معاشرت کی عکاسی کے حوالے سے ان کے ڈرامے "ہر فن مولا" میں بہت سے ایسے مناظر اور کردار ملتے ہیں جن سے پنجابی زبان کے استعمال سے پنجابی معاشرت کی عکاسی ہوتی ہے۔ چائے ہمارے معاشرے کا ایک اہم جزو بن کر رہ گئی ہے۔ اب تو آؤ بھگت اور چائے ایک دوسرے کے حوالے سے لازم و ملزوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ پنجابی معاشرت میں دیہاتی سطح پر اب بھی لسی کا رواج ہے لیکن شہروں میں خاص طور پر اور دیہاتوں میں بعض اوقات چائے ہی سے آؤ بھگت کی جاتی ہے۔ چائے کے یوں کثرت استعمال سے یہ زبان زد عام ہو چکی ہے۔ پنجابی لفظیات اپنے اندر معنوی سطح پر خاص گہرائی اور گیرائی رکھتی ہیں۔ یہ ایسی لفظیات ہیں جو خود ہی ثقافتی عناصر کا درجہ بھی رکھتی ہیں مثلاً یہاں "بھنگڑا" اور "بڑھکیں" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ بھنگڑا پنجابی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔ کوئی بھی پنجابی معاشرہ شادی بیاہ کی رسومات بھنگڑے کے بغیر ادا نہیں کرتا بلکہ شادی بیاہ کے علاوہ

دیگر خوشی کے مواقع پر بھی یار دوست مل کر بھنگڑا ڈالتے ہیں اور بڑھکیں مارتے ہیں جو خوشی کے اظہار کا ہی ایک ذریعہ ہے۔ پنجابی ثقافت کا تجزیہ کیا جائے تو قدیم ہندوستانی ثقافت کی بہت سی چیزیں پنجاب کی ثقافت میں ملتی ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر ہونے والی رسومات میں مایوں، مہندی، سہرا باندھنا، بارات اور خاص طور پر دولہے کی گاڑی کی سجاوٹ کے ساتھ ساتھ دیہات میں آج بھی نہ صرف گھڑولی بھری جاتی ہے بلکہ دولہے کو گھوڑی پر بٹھانے کی رسم عام ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بدلی ثقافتی اقدار کے اثرات بھی پنجاب اور خاص طور پر دیہاتی پنجاب میں بخوبی دیکھے جاسکتے ہیں۔

☆پنجابی فنون لطیفہ کی عکاسی:

فنون لطیفہ کسی بھی معاشرے کا لازمی جزو ہوتے ہیں۔ معاشرے میں رہنے والا ہر شخص کسی نہ کسی فن سے وابستہ ہوتا ہے لیکن بعض فنون ایسے ہوتے ہیں جو معاشرے کے باشندگان کے لیے روزی کمانے کے وسیلے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے اور دیگر لوگوں کے لیے خوشی و مسرت کا باعث بھی بنتے ہیں۔ ایسے فنون سے وابستہ لوگ معاشرے کے غریبیا متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کی خوشیوں کو دوبالا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے چہروں پر مسکراہٹیں بکھیرتے اور اپنی روزی کا سامان کرتے ہیں۔

ادیب چوں کہ معاشرے کا ایک حساس فرد ہوتا ہے اس لیے یہ امر ضروری ہے کہ معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں اور معاشرتی اخلاقیات سے وہ خاصا متاثر ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لوگوں کی عادات و اطوار اور ان کے فنون سے بھی وہ خاص واقفیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے ادیب کی تحریروں میں اس کی معاشرتی زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اور اس کی تحریروں معاشرتی اخلاقیات، فنون اور اقدار کا حسین مرقع بن کر سامنے آتی ہیں۔ اس تناظر میں جب ہم عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی تحریروں میں بھی معاشرتی اخلاقیات و اقدار کے ساتھ ساتھ معاشرے کے مختلف فنون کا تذکرہ بھی بڑے خوب صورت انداز میں ملتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے نہ صرف پنجابی معاشرے کو دیکھا تھا بلکہ دنیا کے مختلف ممالک کے اسفار اور بعض ممالک میں سفارت کاری کے فرائض انجام دیتے ہوئے انہوں نے ان ممالک کی معاشرت اور وہاں کے مختلف فنون خاص طور پر فنون لطیفہ کو بڑے قریب سے دیکھا اور معاشرے میں ان کے مقام کو بخوبی جانا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں پنجابی معاشرے کے فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ دنیا کے دیگر بیشتر ممالک کے فنون لطیفہ کی جھلک بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی معاشرے سے جڑی کسی بھی چیز کا ذکر کرتے ہوئے اسے اس معاشرے کے سماجی اور سیاسی تناظر میں رکھ کر دیکھنے کے عادی ہیں۔ معاشرے کی مختلف چیزیں ایک دوسرے سے گہرا ربط رکھتی ہیں، اسی ربط کے نتیجے میں ایک سماج تشکیل پاتا ہے۔ گویا سماج کی تشکیل میں معاشرتی اقدار، رسوم ورواج، اخلاقیات، فنون اور دیگر عناصر ایک ایک اکائی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہ تمام اکائیاں مل کر معاشرے کی تشکیل کرتی ہیں اگر ان میں سے ایک بھی معدوم ہو جائے تو معاشرے کی تشکیل مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تمام اکائیوں کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے اور ایک اکائی کو سمجھنے کے لیے اسے پورے معاشرتی منظر نامے میں رکھ کر دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انہوں نے پنجابی معاشرت میں رواج پانے والے فنون لطیفہ کو بھی خاص انداز میں دیکھا اور پنجابی لفظیات کا بہترین استعمال کرتے ہوئے ان کی عکاسی کی ہے۔ ان کی تحریروں میں پنجابی فنون لطیفہ کو کس انداز میں بیان کیا گیا ہے اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> "رمضان کے مہینے میں مَیں نے ایک عجیب وغریب چیز کا مشاہدہ کیا۔ یہاں کچھ لوگ آدھی رات کو گردنوں میں ڈھول لٹکائے اور ہاتھوں میں چمٹا پکڑے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آجاتے ہیں اور خوب اودھم مچاتے ہیں۔ جن کے پاس ڈھول نہیں ہوتا وہ کوئی ٹین وغیرہ کھڑکاتے ہیں۔ میں نے ابھی ڈھول (ڈرم) اور چمٹے کا ذکر کیا تھا تو کوئی مضائقہ نہیں۔ اگر یہ بتاتا چلوں کہ چمٹا یہاں کا ایک مقبول ترین آلہ موسیقی ہے۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ آپ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ یہ ساز پاکستان کے قریباً ہر گھر میں پایا جاتا ہے اور خاصا کثیر الاستعمال بھی ہے۔"(۴۰)

ڈھول اور چمٹے کو پنجابی معاشرت اور فنون لطیفہ میں بنیادی مقام حاصل ہے۔ یہ خوشیوں کے مواقع پر خوشی کے اظہار کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ چمٹا تو پنجابی موسیقی کا ایک لازمی جزو ہے۔ یہ ایک دھاتی آلہ موسیقی ہے جو دونوں ہاتھوں سے بجایا جاتا ہے۔ عالم لوہار، عارف لوہار اور دیگر بہت سے لوک فنکاروں نے اس فن کے ذریعے دنیا بھر میں پاکستان کی نمائندگی کی اور پنجابی معاشرت اور فنون کو متعارف کروایا۔ اکثر گانے والا خود ہی چمٹا بھی بجا رہا ہوتا ہے۔ یہ ایسا فن ہے جس کو سیکھنے کے لیے بہت محنت اور پھر چمٹا بجانے کے لیے بہت مہارت کیضرورت ہوتی ہے۔ شادی بیاہ کے مواقع یا وہ فصل کی کٹائی یا کسی لوک میلے کے موقع پر بعض ایسی محفلیں بھی جمتی ہیں جن میں چمٹا اور ڈھول دونوں بیک وقت بجائے جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر چمٹا بجانے

والے کی خاص مہارت دیکھنے میں آتی ہے کہ وہ ڈھول کی تھاپ پر چمٹا بجاتا چلا جاتا ہے اور ڈھولچی کی ہر بدلتی تھاپ کے ساتھ ساتھ چمٹے کی تھاپ بھی بدلتی چلی جاتی ہے۔ سننے والوں کو یہ منظر اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔

ڈھول پنجاب کا مخصوص فن ہے۔ مختلف علاقوں میں مختلف انداز میں اس کو بجانے والے فن کار موجود ہیں جو علاقے اور موقع کی مناسبت سے اس کو مختلف انداز میں بجاتے اور اپنی روزی کا سامان کرنے کے ساتھ ساتھ معاشرے کو لوگوں کی خوشیوں کو بھی دوبالا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ فن خاص طور پر فصلوں کی کٹائی کے موقع پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ تو ان فنون کے وہ استعمال تھے جو معاشرے میں باقاعدہ رائج ہیں۔ لیکن قاسمی صاحب کے قلم نے ان آلات موسیقی کے جن استعمالات کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب کی سماج پر گہری نظر ہے۔ قاسمی صاحب نے رمضان کے مہینے میں ان کے استعمال کا جو ذکر کیا ہے وہ بھی ہمارے معاشرے کا ایک رواج بنتا جا رہا ہے۔ اصل میں یہ قدیم معاشرے کا رواج تھا کہ سحری کے وقت جوگی اور اس طرح کے دیگر لوگ گلیوں میں چمٹا بجاتے اس کے ساتھ مختلف تصوف پر مبنی اشعار گایا کرتے اور لوگوں کو سحری کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ جب مساجد میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سحری و افطاری کے اوقات کا اعلان کیا جانے لگا تو یہ فن ناپید ہوتا چلا گیا۔ لیکن اب بھی بعض علاقوں میں اس طرح سحری کے وقت چمٹا بجانے والے لوگ مل جاتے ہیں جو چمٹا بجا کر گاتے چلے جاتے ہیں اور لوگوں سے روٹی اور پیسہ وغیرہ اکٹھا کر کے اپنے پیٹ کا سامان کرتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے یہاں اس فن کے اس رخ کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام لوگوں کے مشاہدے میں تو ہے لیکن لوگوں کے لیے زیادہ جاذب نظر نہیں لیکن قاسمی کی تحریر نے اس فن کو زیادہ جاذب نظر بنا کر پیش کرنے کے ساتھ اس کے متبادل کو بھی پنجابی لفظیات کے ذریعے واضح انداز میں پیش کیا ہے کہ جن لوگوں کے پاس ڈھول اور چمٹا نہیں ہوتا وہ "ٹین" کو "کھڑکاتے" ہیں۔ یہ اس سماج میں رواج پانے والے گداگری کے پیشے کی عکاسی کر رہا ہے کہ سحری کے وقت لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانے کے لیے یہ لوگ ٹین بجاتے ہیں۔ قاسمی صاحب نے یہاں "بجاتے" کے اردو لفظ کی بجائے پنجابی لفظ "کھڑکاتے" استعمال کر کے اس عمل کو پنجابی معاشرتے میں ڈھال دیا ہے اور ان کی تحریر اس فن کی اچھی طرح عکاسی کرنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی فنون لطیفہ کی پنجابی لفظیات میں عکاسی ان کی تحریر کو معنوی سطح پر زیادہ بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ ان کے مافی الضمیر کے ابلاغ کا بھی بہترین ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے چمٹے کو ذکر کرتے ہوئے جو یہ کہا ہے کہ پاکستان کے ہر گھر میں یہ موجود ہے اور کثیر الاستعمال ہے اس میں بھی ایک سچائی موجود ہے۔ اسی بجانے والے چمٹے کی شکل کے ہی چمٹے ہر گھر میں موجود ہیں۔ جو روٹیاں پکانے، کوئلوں کو اٹھا کر انگیٹھی میں رکھنے اور دیگر بہت سے کاموں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ چمٹے بجانے والے آلہ موسیقی کے چمٹے سے سائز میں بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ قاسمی صاحب کا ان چمٹوں کا بیان کرنا اس بات کا ثبوت کا ہے کہ وہ معاشرے اور اس کے متعلقات کو نہ صرف کثیر زاویوں سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ مختلف چیزوں کے آپس کے روابط کو بھی واضح کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔

چمٹے اور ڈھول کے ساتھ ساتھ پنجابی فنون لطیفہ میں طبلے کو بھی خاص مقام حاصل ہے۔ طبلہ بھی بنیادی طور پر آلات موسیقی میں داخل ہے۔ موسیقی کی مختلف محفلوں میں طبلے کا عام استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی آواز اپنے سامعین کو مسحور کر لیتی ہے۔ طلبہ بجانا بھی ایک خاص فن ہے جو خاصی محنت سے آتا ہے۔ طبلہ بجانے والے کی مہارت اس کی انگلیوں کے پوروں سے چھن چھن کر نکلتی ہے اور سامعین کے کانوں میں ایک طرح کا رس گھول دیتی ہے۔ پنجابی معاشرے میں طبلہ کا رواج اس قدر عام ہے کہ بڑے بوڑھے جب فارغ بیٹھے ہوں تو کسی بھی برتن کو طبلے کے طور پر استعمال میں لا کر گانا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''پکا راگ'' کے نام سے موسیقی کی ایک قسم میں طبلے کا استعمال لازمی جزو کے طور پر ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک ''پکا راگ'' کی محفل کا تذکرہ کرتے ہوئے موسیقاروں کے گانے کے انداز اور آوازوں کے سُر کی عکاسی کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں۔

> "یہاں میں نے سینکڑوں لوگوں سے بھرے ہوئے ایک ہال میں دیکھا کہ سٹیج پر دو شخص چوکڑی مار کر بیٹھے تھے اور وہ لوگوں کو طبلے کی تھاپ پر آہ وزاری کر کے دکھاتے تھے۔ ان بیچاروں کے چہرے کرب سے کھنچے ہوئے تھے اور وہ حلق سے ایسی آوازیں نکال رہے تھے جیسی آوازیں بکرے کو ذبح کرتے وقت اس کے حلق سے نکلتی ہیں۔ میرے لیے زیادہ افسوسناک امر یہ تھا کہ ان اذیت پسند ناظرین کے لیے یہ آہ وبکا مثل موسیقی کے تھی اور وہ اسے "پکا راگ" کا نام دیتے تھے۔"[۴۱]

عطاء الحق قاسمی مختلف چیزوں میں مشابہت تلاش کرنے اور اسے اپنے مخصوص انداز میں بیان کر کے مزاح کشید کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ مندرجہ بالا بیان کو دیکھا جائے تو یہاں پکا راگ کی

موسیقیاور طبلے کا جس انداز میں ذکر ہوا ہے وہ تحریر کا موزوں انداز ہے۔ پکا راگ کی موسیقی میں موسیقار کو خاصی جان مارنی پڑتی ہے، اور اپنے لے اور سُر کو قائم رکھنے کے لیے چہرے کے عضلات تک کو کھنچاؤ کی حالت میں لے جانا پڑتا ہے تب جا کر ان کا فن نکھرتا اور سامعین و ناظرین کو مسحور کرتا ہے۔ قاسمی صاحب نے اس صورت حال کو خاصے ظریفانہ انداز میں بیان کیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پنجابی کے اس مخصوص فن کے موسیقاروں کے بیٹھنے کے انداز کو "آلتی پالتی مار کر بیٹھنے" کے الفاظ سے بیان کرنے کی بجائے پنجابی لفظ ”چوکڑی“ مار کر بیٹھنے سے بیان کرنے سے تحریر میں خاصی جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔

شاعری ایک ایسا فن ہے جس کے ساتھ معاشرے کے کئی طبقوں کے لوگ وابستہ ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو شعرا ہیں جو شاعری کے ذریعے اپنے خیالات، جذبات اور احساسات کو صفحہ قرطاس کی زینت بناتے ہیں تو دوسری طرف مشاعروں کا اہتمام کرنے والے لوگ اور سامعین ہوتے ہیں جو ان شعرا کا کلام بڑے شوق سے سنتے اور داد دیتے ہیں۔ درباروں کے زمانے میں شعرا اور مشاعروں کا رواج عام تھا۔ شعرا بادشاہوں کے درباروں سے باقاعدہ منسلک ہوتے تھے، وہ بادشاہوں کی شان میں قصیدے لکھتے اور بڑے فن کارانہ میں انداز میں سنا اور گا کر داد کے ساتھ ساتھ قیمتی مال و زر بھی حاصل کرتے، اس کے علاوہ معاشرے میں مشاعروں کا رواج بھی عام تھا۔ ایک جگہ پر مختلف شعرا اور سامعین جمع ہو جاتے اور شعر و سخن کی محفل برپا ہو جاتی تھی۔ ان مشاعروں میں کلام پڑھنے والے شعرا کا ادبی و شعری ذوق تو کمال کا ہوتا ہی تھا اس کے ساتھ ساتھ مشاعرہ سننے کے لیے آنے والے سامعین بھی خاصے ذوق کے مالک ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ درباروں کے نظام کو زوال آنا شروع ہوا تو شعرا بھی درباروں سے نکلتے چلے گئے لیکن معاشرے میں مشاعروں کا رواج نہ صرف برقرار رہا بلکہ ارتقائی منازل طے کرتا رہا، یہ وجہ ہے کہ آج بھی دنیا کے بیشتر معاشروں میں شاعری کا رواج عام ہونے کے ساتھ ساتھ شعرا کی زبانی ان کا کلام سننے کے لیے مشاعروں کا اہتمام بھی خاص سلیقے سے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شعرا اپنے آپ کو عوام میں خاصا مقبول کرنے کے لیے اپنے ناموں کے ساتھ ساتھ مختلف طرح کے القاب اور نسبتیں بھی لگا لیتے ہیں تاکہ عوام پر رعب ڈالا جا سکے۔ ان نسبتوں کی حقیقت کیا ہوتی ہے عطاء الحق قاسمی یوں بیان کرتے ہیں:

"میں نے یہاں ایک انڈوپاک مشاعرے میں بھی شرکت کی جس میں پاکستان کے علاوہ بھارت کے بہت سے شعرا نے بھی اپنا کلام سنایا جس سے مجھے احساس ہوا کہ دونوں ملکوں میں ثقافتی تعاون روزافزوں ہے تاہم مشاعرے کے بعد جب میں نے اپنے دوست کے سامنے (جو مجھے یہاں لایا تھا) متذکرہ خیال کا اظہار کیا تو وہ بہت ہنسا اور اس نے کہا یہ جو تم مختلف شاعروں کے ناموں کے آخر میں امروہی، مرادآبادی، جالندھری، لکھنوی، دہلوی اور امرتسری وغیرہ کے الفاظ سن رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ یہ شعرا اس مشاعرے میں شرکت کے لیے انڈیا سے آئے ہیں تو معاملہ یوں نہیں ہے، دراصل ان شعرا نے جالندھری اور لکھنوی وغیرہ کے الفاظ یونہی شو،شا کے لیے اپنے ساتھ ٹانکے ہوئے ہیں، ورنہ یہ سب پاکستانی ہیں اور ۱۹۴۷ء میں بھارت سے مستقل ہجرت کر کے یہیں آباد ہو چکے ہیں۔"(۴۲)

عطاء الحق قاسمی خود اچھا شعری ذوق رکھنے والے انسان ہیں اور مشاعروں میں شرکت بھی کرتے ہیں،یہی وجہ ہے کہ وہ معاشرے کے اس اہم فن یعنی شاعری کے رمز شناس بھی ہیں۔ ان کی بیشتر تحریریں چوں کہ طنزیہ انداز کی حامل ہوتی ہیں اس لیے اس بیان میں بھی انہوں نے بظاہر ان شعرا سے مرعوبیت کا اظہار کیا ہے لیکن اصل میں وہ ان شعرا کی حقیقت سے واقف ہیں اور طنزیہ انداز میں معاشرے کے لوگوں اور خاص طور پر ادبی لوگوں کے اس منفی رجحان کو بیان کر رہے ہیں جس کے ذریعے وہ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے طرح طرح کے خود ساختہ القاب اور نسبتیں اپنے ناموں کے ساتھ لگاتے ہیں۔ قاسمی صاحب نے ان کے اس طرز عمل کو پنجابی لفظ "شو،شا" سے بیان کیا ہے جس کے معنی ظاہری بناوٹ اور چکا چوند کے ہوتے ہیں۔ ان شعرا کے ناموں کے ساتھ لگے یہ القاب اور نسبتیں بھی ظاہری بناوٹ اور سنگھار کا کام ہی دیتی ہیں جب کہ حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

یوں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی تحریریں پنجابی فنون لطیفہ کی بہترین عکاس قرار پاتی ہیں۔ انہوں نے اپنے قلم سے جہاں پنجابی معاشرت اور پنجابی ثقافت کی بھرپور عکاسی کی ہے وہیں پنجابی فنون لطیفہ کو بھی بہترین انداز میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس عکاسی کے دوران انہوں نے جو پنجابی لفظیات استعمال کی ہیں ان سے نہ صرف ان کی تحریروں کی تاثیر میں خاص اضافہ ہوا ہے بلکہ ابلاغ میں بھی کوئی رکاٹ پیدا نہیں ہوتی بلکہ وہ جس انداز میں پنجابی سماج، ثقافت اور فنون لطیفہ کی عکاسی کرتے آرہے ہوتے ہیں قاری کے

ذہن میں ایک خاص پنجابی منظر نامہ تشکیل پا چکا ہوتا ہے اس منظر نامہ میں جب کوئی پنجابی لفظ قاری کی آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو وہ اس کو کھینچ کر اس پنجابی ماحول میں لے جاتا ہے جس کی عکاسی قاسمی صاحب کر رہے ہوتے ہیں یوں مصنف اور قاری ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں اور قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مصنف اس کے مشاہدات اور احساسات کو تحریر کرتا جا رہا ہے۔ یہی قاسمی کا اصل فن ہے جس کے ذریعے ان کی تحریریں اعلیٰ ادبی مقام کی حامل قرار پاتی ہیں۔

ب: عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی لفظیات کا فنی تناظر

نثری تحریر کے لیے بھی شاعری کی طرح فکری حوالے سے پختگی کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے بھی جاندار ہونا ضروری ہے۔ فنی حوالے سے تحریر میں جان پیدا کرنے کے لیے جہاں مقررہ پیمانوں کی خاص اہمیت ہے اور ان کے بغیر کسی تحریر کا معیار نہیں جانچا جا سکتا وہاں مصنف کے ذاتی رجحانات اور ذاتی کاوش بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ہر ادیب کا اپنا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو اس کی تحریروں میں فنی اور فکری دونوں حوالوں سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ فنی حوالے سے ہر صنف کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جیسا کہ انشائیہ کے فنی تقاضے ناول سے مختلف ہوں گے، شاعری کا فن افسانے کے فن سے مختلف ہے اسی طرح ہر ادیب کے ہاں بھی مختلف انداز سامنے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی صنف میں لکھنے والے مختلف لکھاریوں کی تحریروں میں ایک دوسرے سے الگ انداز ملتا ہے یہ ادیب کا ذاتی فن ہوتا ہے جو اس کی تحریر کو دیگر ادیبوں کی تحریروں سے ممتاز کرتا ہے۔

فنی تناظر میں بات کی جائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ادیب کا ماحول اور معاشرہ بھی اس کی تحریر کے فن پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ معاشرہ فکری سطح پر تو ادیب کو موضوعات مہیا کرتا ہی ہے فنی حوالے سے بھی اس کی تحریر پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ادیب جس معاشرے میں رہ کر تخلیقِ ادب کا فریضہ انجام دے رہا ہوتا ہے اس معاشرے کی لسانی صورت حال اس کے فن کو بالیدگی عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی تحریر پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ کوئی ادیب اپنے عہد (یا وہ عہد جس کی عکاسی وہ ادب میں کر رہا ہے) کی لسانی صورت حال سے روگردانی نہیں کر سکتا، ادیب عہد کی لسانی صورت حال سے جس قدر آگاہ ہو گا، لوگوں کے بول چال کے انداز اور ان کے رویوں کی زبان کے ذریعے اظہار کی صورت سے جس قدر واقفیت رکھتا ہو گا اسی قدر اس کا فن زیادہ پختہ ہوتا چلا جائے گا۔ اگر ایک ادیب اپنے فن میں لسانی صورت حال کو نظر انداز کر جاتا ہے تو فکری حوالے سے اس کی تحریر خواہ کسی بھی درجہ کی ہو ادب میں اپنا مقام بنانے میں ناکام رہے گی۔

پنجاب کی لسانی صورت حال کے حوالے سے بات کی جائے تو یہاں مختلف علاقوں کی لسانی صورت حال خاصی مختلف ہے۔ ایک ہی کام کے لیے مختلف علاقوں میں مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ پنجابی میں اس لسانی تنوع کے باعث ان علاقوں میں بولی جانے والی اردو میں بھی کسی نہ کسی حد تک تنوع پایا جاتا ہے۔ لسانی تنوع کا یہ انداز ادیب کو مد نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے تا کہ وہ صحیح معنوں میں معاشرت کی عکاسی کر سکے۔ اس لسانی تنوع کی وجہ پنجابی معاشرت کا تنوع ہے۔ اس منظر نامے میں جب ہم عطاء الحق قاسمی کی نثر کا فنی حوالے سے جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قاسمی کی نثر میں استعمال ہونے والے پنجابی کے الفاظ اپنا ایک خاص سماجی تناظر رکھنے کے باعث پنجاب کی لسانی صورت حال سے بھی بہت اچھی طرح میل کھاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی نثر کا اسلوب پنجاب کی لسانی صورت حال سے جداگانہ نظر نہیں آتا۔ ذیل میں مختلف زاویوں سے عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی لفظیات کے فنی تناظر پر بحث کی جاتی ہے۔

مصنف کا اسلوب

اسلوب تحریر کے انداز کو کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے Style کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد وہ انداز ہوتا ہے جو کوئی لکھاری اپنے تخیلات، مشاہدات اور جذبات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اسلوب کسی بھی لکھاری کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور اس کی تحریر کا اسلوب ہی اصل میں بطور مصنف اس کی پہچان کرواتا ہے۔ بہت سے اعلیٰ پائے کے ادیب ایسے ملتے ہیں جن کے اسلوب بیان کی چاشنی نے ان کی تحریروں میں جان ڈال دی اور ان کو ایک نیا آہنگ عطا کر دیا۔

اسلوب بیان کے لیے ضروری ہے کہ مصنف کا اسلوب اس کے اس عہد کی عکاسی کرے جس عہد کا وہ ادب تخلیق کر رہا ہے۔ اس عہد کی لسانی صورت حال، اس عہد کی سماجی اور ثقافتی صورت حال اور اس عہد کے رویوں کی عکاسی اس کے اسلوب سے ہونی چاہیے تبھی اس کا اسلوب جاندار بن پائے گا اور اس کی تحریر میں جان ڈال دے گا۔ عہد کے ساتھ ساتھ مصنف کا اسلوب بیان اس طبقے سے بھی مطابقت رکھتا ہو جس طبقے کے لوگوں کو وہ اپنی تحریر میں استعمال کر رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے لکھاری مختلف انداز اپناتا ہے۔ وہ مختلف تکنیکیں استعمال کرتا ہے جو اس کے اسلوب کو جاندار بنا کر اس کے تصورات اور خیالات کو احسن طریقے سے قارئین کے سامنے پیش کر سکیں۔

اصناف ادب کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہر صنف کے اسلوب کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جن کو پورا کرنا ادیب یا شاعر کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ کسی بھی صنف کے بنیادی فنی خصائص کو نظر انداز نہیں کیا

جا سکتا۔ یہاں صورت حال کچھ اس طرح سے سامنے آتی ہے کہ ادیب کو اسلوب کے حوالے سے افقی اور عمودی دونوں تناظرات میں سفر کرنا پڑتا ہے۔ افقی تناظر میں سفر کرتے ہوئے وہ بہت سی اصناف میں سے کسی ایکیا ایک سے زیادہ اصناف کا انتخاب کرتا ہے اور اس کا اسلوب اپناتے ہوئے اپنے خیالات اور تاثرات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا ہے۔ اس عمل کے دوران اسے اس صنف کے باقی ادیبوں سے خود کو ممتاز کرنے کے لیے عمودی سفر کرتے ہوئے اپنا ایک الگ اسلوب اختیار کرنا پڑتا ہے تب جا کر اس کی تحریر اس کی پہچان بن کر ابھرتی ہے اور اس مقام پر پہنچنے کے بعد اس کا اسلوب بیان لاکھوں ادیبوں کی تحریروں میں اس کی پہچان بن کر سامنے آتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی ایک کہنہ مشق مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریریں لطافت اور نزاکت کے عناصر لیے ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کا اسلوب بیان خاصا لطیف ہے۔ وہ معاشرے کی ناہمواریوں کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور اس بارے میں اپنے مشاہدات کو بڑے لطیف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں موجود پنجابی زبان کے الفاظ کے حوالے سے بات کی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے پنجابی زبان کے الفاظ کو نہ صرف خاص معاشرتی اور ثقافتی تناظر میں بیان کیا ہے بلکہ فنی حوالے سے ان الفاظ کے استعمال میں خاص مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی تحریروں میں موجود پنجابی الفاظ نہ تو تحریر کو بوجھل بناتے ہیں اور نہ ہی تحریر کی روانی میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں۔

مزاح نگاری میں ایک اہم حربہ صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کا ہوتا ہے۔ تخلیق کار کسی ایسی صورت حال کو بیان کر رہا ہوتا ہے جو عام شاہد کے لیے غیر معمولی نہیں ہوتی لیکن تخلیق کار کا اسلوب بیان اس معمولی صورت حال کو بھی غیر معمولی بنا کر پیش کر دیتا ہے اور اس کا انداز ایسا لطیف ہوتا ہے کہ قاری ایک لمحے کے لیے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے خاصی گہری سوچ میں اتر جاتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کو صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے میں خاص مہارت حاصل ہے اور اس امر کے لیے وہ پنجابی الفاظ کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں۔

"میر اسیر کا تجربہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔بس یوں سمجھیں کہ رنگروٹ بھرتی ہوا ہوں چنانچہ جب کوئی صاحب پارک میں اچانک نظر پڑتے ہیں اور اس عالم میں کہ ان کی ٹانگیں اوپر اور سر نیچے ہے اور وہ لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہیں تو میں دبک سا جاتا ہوں.......... گزشتہ روز میں نے ایک بزرگ کو رسی ٹاپتے دیکھا بلکہ غور سے دیکھا تو ان کے چہرے پر حیا کی سرخی بھی تھی، میں "غض بصر" سے کام لیا اور انکے قریب سے نظریں چرا کر اس طرح گزرتا گیا جیسے نامحرموں کو گزرنا چاہیے۔" (۴۳)

قاسمی نے یہاں صورتِ واقعہ سے جو مزاح پیدا کیا ہے وہ قاری کو ایک لمحے کے لیے اپنے سحر میں لے لیتا ہے اس کے ساتھ ساتھ رسی ٹاپنے کے الفاظ استعمال کر کے انہوں نے اسلوب میں خاصی چاشنی اور روانی پیدا کی ہے۔

صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مزاح پیدا کرنے کا ایک اور اہم حربہ الفاظ کے ہیر پھیر کا بھی ہے۔ قاسمی صاحب کا اعجاز یہ ہے کہ پنجابی زبان کے الفاظ کو استعمال کرتے ہوئے وہ لفظوں کے ہیر پھیر سے اس انداز میں مزاح پیدا کرتے ہیں کہ ان الفاظ کا ایک نیا مفہوم سامنے آنے لگتا ہے اور یہ وہ مفہوم ہوتا ہے جو پہلے مفہوم سے ذرا بھی میل نہیں کھاتا یوں الفاظ کے تھوڑے سے ہیر پھیر سے وہ معنوی سطح پر بہت بڑا کام لے لیتے ہیں۔ ذیل کے اقتباس میں دیکھیے کہ کس طرح الفاظ کی صرف ترتیب بدلنے سے انہوں نے جملے میں خاصا مزاح پیدا کر لیا ہے۔

"معاملہ یہیں تک محدود ہو تو بھی خیر ہے، صبح صبح ایک دو نہیں، بیسیوں توندیں بیک وقت دیکھنا پڑتی ہیں جنہیں ڈاکٹروں نے سیر پر لگا رکھا ہے اور خود ڈاکٹر ان سے مشورہ فیس بٹورنے پر لگے ہوئے ہیں، صبح کو سیر کو نکلیں تو لگتا ہے ہسپتال کا راؤنڈ لگا رہے ہیں، نہار منہ شوگر کے مریض، اور بڑی بڑی "گوگڑوں" والے تاجروں سے مڈبھیڑ ہوتی ہے، گنجے ان کے علاوہ ہیں جن کا خیال ہے کہ سیر سے سر پر بال اگ سکتے ہیں! ان سب کے خیال میں وہ "سیر سور" کر رہے ہوتے ہیں حالانکہ ان میں سے کچھ کے بارے میں تو "سیر سور" والی ترکیب کو الٹا کر دیا جائے تو مطالب زیادہ بہتر طور پر واضح ہوتے ہیں۔" (۴۴)

اس اقتباس میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اس طرح انہوں نے محض ایک ترکیب کے دو الفاظ کی ترکیب کو الٹا کرنے سے مزاح پیدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں جو منظر نامہ بیان کیا گیا ہے وہ بذات خود خاصی لطیف

صورت حال کی عکاسی کر رہا ہے۔ اس سے عطاء الحق قاسمی کے اسلوب بیان کی شگفتگی نمایاں ہوتی ہے کہ وہ کس طرح ایک منظر سے لطیف اور شگفتہ انداز میں الفاظ کے استعمال سے مزاح پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔

لفظوں کے موزوں استعمال سے مزاح پیدا کرنے میں قاسمی کو جو ملکہ حاصل ہے اس میں وہ سماجی اور ثقافتی تناظر خاص کردار ادا کرتے ہیں جو اس معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان سماجی اور ثقافتی تناظرات نے ان کے اسلوب بیان میں خاصا نکھار پیدا کیا ہے۔ وہ ہر عمر کے لوگوں کی عادات وخصائل سے بخوبی آگاہی رکھتے ہیں اور ان کے بارے میں بیان کرتے وقت اسلوب بیان ایسا اختیار کرتے ہیں کہ اس عمر اور طبقے کے لوگوں کی بخوبی عکاسی ہونے لگتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ پنجابی لفظیات کا استعمال کر کے تحریر کی معنویت میں مزید تاثیر پیدا کر لیتے ہیں۔ ایک سیر کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "بزرگوں کے سیر کرنے کا اپنا انداز ہے وہ سیر میں بھی عاقبت کو یاد رکھتے ہیں چنانچہ چند قدم چلنے کے بعد وہ کسی درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ ان میں سے ایک کھڑا ہو کر نعت پڑھنے لگتا ہے اور دوسرے جھومنے لگتے ہیں، بعض "ثقافتی" قسم کے بزرگ ہیر گانے لگتے ہیں، میں نے بعض "کن کٹے" بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی اور دوسرے کی عمر کا خیال کیے بغیر ایک دوسرے کو "لانگڑیاں" بھی دیتے ہیں اور پھر اگلے دو چار روز گراؤنڈ میں نظر نہیں آتے، غالباً "گراؤنڈ" ہو جاتے ہیں۔"[۴۵]

اس اقتباس کا فنی حوالے سے جائزہ لیا جائے تو اس میں عطاء الحق قاسمی نے کئی حوالوں سے پنجابی الفاظ کو بڑی مہارت سے استعمال کر کے تحریر کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ "کن کٹے" اور "لانگڑیاں" ایسے الفاظ ہیں جن کے استعمال سے ان کے اسلوب میں جو تاثیر پیدا ہوئی ہے وہ شاید ان کے اردو متبادلات کے استعمال سے نہ ہو پاتی۔ عطاء الحق قاسمی کو الفاظ کے درست چناؤ اور ان کے درست استعمال پر گرفت ہے۔ وہ تحریر میں ایسے غیر ضروری الفاظ استعمال نہیں کرتے جن سے تحریر میں بوجھل پن محسوس ہو اور روانی میں رکاوٹ بنے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف الفاظ کے مختلف زبانوں میں استعمال کے بارے میں خاصی آگاہی رکھتے ہیں۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں گراؤنڈ کا لفظ خاص معنویت رکھتا ہے۔ پہلے معنوں میں گراؤنڈ اس میدان کے لیے استعمال کیا گیا ہے جس میں صبح کے وقت لوگ سیر کے لیے جاتے ہیں اور اس پیراگراف کے آخر میں گراؤنڈ کا لفظ روپوش ہو جانے اور چھپ جانے یا زیر زمین چلے جانے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

گراؤنڈ انگریزی کا لفظ ہے اور انگریزی میں بھی ان دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن عطاء الحق قاسمی نے یہاں گراؤنڈ کا لفظ جس طرح استعمال کیا ہے اس سے اسلوب میں ایک نیا رنگ پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ اس لفظ کی ذو معنویت بھی نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے۔

لفظوں سے مزاح پیدا کرنے اور اسلوب میں لطافت پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ عطاء الحق قاسمی بعض اوقات تحریر میں شاعرانہ انداز بھی اختیار کرتے ہیں۔ وہ نثر لکھتے وقت اس میں شعروں یا مصروں کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ ان کی نثر شاعری کا لطف دینے لگتی ہے۔ شعروں اور مصرعوں کے برمحل استعمال میں ان کو خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ کسی بھی شعر یا مصرعے کو اس انداز میں استعمال نہیں کرتے کہ ان کی نثر میں وہ ٹھونسا ہوا محسوس ہو بلکہ ان کی نثر میں شعر اور مصرعے اس طرح ضم ہو جاتے ہیں کہ وہ نثر ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ذیل میں دیکھیے کہ کس طرح وہ شعروں کے استعمال سے اپنی نثر کو مزین کرتے ہیں۔

"نقوی صاحب نے پیار سے اس کی کمر کو سہلایا اور پھر مجھے مخاطب کر
کے کہنے لگے "عطا بھائی آپ کیوں پرے کھڑے ہیں، ذرا قریب آئیں"
حالانکہ مشہور شعر ہے:
حسینوں سے فقط صاحب سلامت دور کی اچھی
نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی
مگر غالباً نقوی صاحب نے یہ شعر نہیں سنا ہوا تھا!"(۴۶)

اسی طرح بعض اوقات وہ مکمل شعر کی بجائے شعر کے ایک مصرعے سے بھی بخوبی کام لے لیتے ہیں۔ ایک مصرعے کا استعمال کر کے نثر کو لطیف بنانے کی روایت کئی نثر نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔ بہت سے نثر نگار مصرعے کو اس انداز میں استعمال کرتے ہیں کہ نثر میں لطافت آنے کی بجائے قاری یہ سوچنے لگتا ہے کہ تخلیق کار کہنا کیا چاہتا ہے اور اس کا مافی الضمیر کیا ہے۔ ابلاغ کے یہ مسائل نثر کو بے جان بنا دیتے ہیں۔ نثر میں مصرعے کا استعمال کرتے وقت بہت سی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ جس مصرعے کا استعمال کیا جا رہا ہو وہ عام فہم اور مقبولِ عام مصرعہ ہو۔ غیر مقبول مصرعے استعمال کرنے سے نثر میں بوجھل پن پیدا ہو جاتا ہے جو قاری کی طبیعت پر خاصا گراں گزرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو مصرعہ استعمال کیا جا رہا ہو وہ نثری تحریر سے کسی نہ کسی حوالے سے مطابقت بھی رکھتا ہو تاکہ قاری اس سے حظ اٹھا سکے کیونکہ نثری تحریر خاص طور پر مزاح میں حظ کی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی نثر میں مصرعوں کا استعمال

خاصا بر محل ملتا ہے جس سے ان کے اسلوب میں شگفتگی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی تحریر میں بھی خاصی روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک جگہ مصرعہ کا استعمال یوں خوب صورتی سے کرتے ہیں۔

"شیرنی نے اپنی آنکھیں میرا مطلب ہے اپنے ڈیلے اوپر کیے جن میں
شکایت ہی شکایت تھی مگر پھر وہ اٹھ کر پنجرے کے قریب آ گئی
اور نقوی صاحب سے گلے ملنے کی کوشش کی تاکہ

؎ جب گلے سے مل گئے سارا گلہ جاتا رہا

کے مصداق تجدید محبت کا اعلان کیا جا سکے لیکن ظالم سماج یعنی سلاخوں
کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا۔"(۴۷)

شعروں اور مصرعوں کا استعمال کرتے ہوئے بعض اوقات وہ شاعر کا حوالہ بھی دیتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک اچھا ادیب جب کسی کا قول یا بات کسی موقعہ کے لیے استعمال کرتا ہے تو وہ ان دونوں موقعوں اور حالات میں کوئی نہ کوئی مشترک وصف تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے مشاہدات کو کسی دوسرے شاعر یا ادیب کی نظر سے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ یہ وصف اس لکھاری میں پیدا ہو سکتا ہے جس کا مطالعہ وسیع ہو اور وہ اپنے مطالعہ اور مشاہدہ کے درمیان تعلق قائم کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ عطاء الحق قاسمی اپنے ایک مضمون میں شعر کا استعمال یوں کرتے ہیں:

"ڈاکٹر نے مجھے سیڑھیاں چڑھنے اور اترنے کے ضمن میں بہت احتیاط کا مشورہ دیا، ان کا کہنا تھا کہ اس عمل کے دوران زیادہ پھرتیاں دکھانا نقصان دہ ہے چنانچہ آپ سیڑھیاں اس احتیاط سے چڑھیں اور اتریں جس احتیاط کی تلقین میر تقی میرؔ نے کی ہے......

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا (۴۸)

یوں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کا اسلوب خاصا لطیف اور شگفتہ ہے۔ ان کی نثر رواں ہے۔ شعروں اور مصرعوں کے بر محل استعمال سے انھوں نے اپنی نثر کو مزید نکھارا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی نثر کے اسلوب کی جو اہم خوبی قارئین کو متاثر کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ لفظی کفایت شعاری کے اصول پر سختی سے کاربند نظر آتے ہیں۔ لفظوں کے چناؤ اور پھر ان کے بہترین اور بر محل استعمال پر انھیں خاص ملکہ حاصل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین اور کالموں کی نثر بوجھل محسوس نہیں ہوتی۔ ان کا اسلوب ان کی نثر کو خاصا جاندار بناتا ہے۔ وہ چھوٹے جملوں اور مختصر الفاظ میں بہت بڑے مطالب بیان کرنے پر خاصی قدرت رکھتے ہیں۔ اسلوب میں پنجابی زبان کے الفاظ کو وہ اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ لفظ ٹھونسے ہوئے محسوس نہیں ہوتے بلکہ پورا ایک سماجی اور ثقافتی منظر نامہ بیان کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ یوں ان کے اسلوب میں پنجابی زبان کے الفاظ کا استعمال ان کے اسلوب میں دلکشی اور رعنائی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ پنجابی معاشرت کی بھی بخوبی عکاسی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر ان کا اسلوب ان کے مافی الضمیر کا ترجمان بننے کے ساتھ ساتھ قاری کو حظ پہنچانے کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

بیانیہ انداز

بیانیہ کسی بھی تحریر کو جاندار بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ تخلیق کار کے مشاہدات، احساسات اور تجربات اس کے ذہن میں ایک وسیع کائنات کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ اس وسیع کائنات کو اپنے قارئین تک پہنچانے کے لیے تخلیق کار کے پاس متنوع انداز ہوتے ہیں۔ اس کی تحریر سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ وہ کس انداز میں اپنا مافی الضمیر قارئین تک پہنچا رہا ہے۔ ایک طرف وہ اپنے اسلوب کو رواں رکھنے کے لیے موزوں الفاظ کا سہارا لیتا ہے تو دوسری طرف ان الفاظ کے استعمال میں مختلف اور متنوع انداز اختیار کرکے اپنے بیانیہ کی تکمیل کرتا ہے۔

لطیف نثری تحریروں میں ادیب کو اپنا بیانیہ خاصی محنت سے تشکیل دینا پڑتا ہے۔ الفاظ کے چناؤ اور پھر ان الفاظ کے استعمال میں خاص مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخلیق کار اپنے بیانیے کی تشکیل کے لیے مختلف تکنیکوں کا سہارا بھی لیتا ہے۔ اس کے علاوہ بات کرنے کے مختلف انداز بھی اپنائے جاتے ہیں یہ سب چیزیں مل کر کسی مصنف کا بیانیہ تشکیل دیتی ہیں۔ عطاء الحق کے قاسمی کی تحریروں کے مطالعہ سے ان کے بیانیہ کا سراغ لگایا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کے بیانیہ میں بات کرنے کے متنوع انداز پائے جاتے ہیں۔ وہ موقع محل اور موزونیت کو مد نظر رکھتے ہوئے بات کرنے کا انداز اپناتے ہیں۔ ان کا بیانیہ ان کے مافی الضمیر کی اچھی ترجمانی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ قاری ان کی تحریروں کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی تخلیق میں بعض اوقات مکالماتی انداز اختیار کرتے ہیں۔ مکالماتی انداز جہاں تحریر کو دلچسپ بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے وہیں یہ بات بھی ایک حقیقت ہے کہ مکالماتی انداز کے تقاضے پورے کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں مکالمہ کسی بھی تحریر کی جان ہوتا ہے اور یہ اس وقت ہی تحریر کے لیے

مفید ثابت ہو سکتا ہے جب اس میں حصہ لینے والے کرداروں کو تخلیق کار بات کرتے ہوئے سنبھالے رکھنے پر قدرت رکھتا ہو۔ مکالمے میں مناسب الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ متکلم کے لہجے اور انداز تکلم کی بھی خاص اہمیت ہوتی ہے۔ اگر متکلم اپنے عہد کی زبان سے ذرا سی بھی روگردانی اختیار کرے تو مکالمہ تحریر کا حسن بننے کی بجائے اس کا عیب بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تخلیق کار کو اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اس کے کردار درست سمت میں آگے بڑھ رہے ہوں اور مکالمے میں ارتقائی عمل جاری رہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والا مکالماتی انداز ان اصولوں کی کافی حد تک پاسداری کرتا ہے۔ اپنے ایک مضمون "رحم دل لوگ" میں وہ بیانیہ کا یہ انداز اپناتے ہیں۔

"یار رمضان کی وجہ سے برا حال ہے کچھ انتظام ہوا؟"

"کوشش کر رہا ہوں کہ کسی سے رابطہ ہو جائے"

یار سختی بہت ہے ورنہ حال میرا بھی وہی ہے جو تمہارا ہے"

"اگر تمہارا حال برا ہوتا تو اب تک تم نے مل بیٹھنے کا کوئی انتظام کر لیا ہوتا۔"

"تو تم کیا سمجھتے ہو میں جان بوجھ کر انتظام نہیں کر رہا" (۴۹)

اس مکالمے کو دیکھا جائے تو قاسمی کے ہاں لوگوں کے ذہنی رجحانات کا بھی خوب علم ہوتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے پر ایک تو اعتماد کرنے سے احتراز کرتے ہیں اور اگر کسی پر اعتماد کر کے اپنی مجبوری بیان کر بھی دیں تو پھر بھی ان کو یہ شک گھیرے رکھتا ہے کہ شاید دوسرے لوگ جان بوجھ کر اس کی مجبوری سے لذت حاصل کرنے میں لگے ہیں اور کسی کو اس کا احساس نہیں۔ قاسمی مکالموں کے لیے الفاظ کا ایسا چناؤ کرتے ہیں کہ وہ الفاظ بولنے والے کی ذہنی کیفیت کو بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک اور جگہ مکالماتی انداز کا حسن ملاحظہ ہو:

"جوزف نے پوچھا" صاحب آپ باہر سے آئے ہو؟"

"ہاں بھئی کل ہی لوٹا ہوں"

"میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ روم جانے کا ارادہ ہے"

"تو پھر کیسا لگا روم؟"

"بھئی جوزف کیا کہنے اس شہر کے، میں نے دنیا گھومی ہے لیکن سچی بات
یہ ہے کہ اس شہر کا کوئی

جواب نہیں"(۵۰)

قاسمی کے کردار مکالماتی عمل میں ایک دوسرے سے یوں کلام کرتے ہیں جو اس صورت حال سے میل کھاتا ہو۔ لوگوں کی آپس میں باہمی رفاقت اور رقابت ان کے کرداروں کے مکالمات سے نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے، اس کے علاوہ ان کے کرداروں کی مکالماتی زبان اپنے عہد اور لسانی مزاج سے خاص ہم آہنگی کا ثبوت دیتی ہے یہ وجہ ہے کہ ان کے مکالمے تحریر کی تاثیر میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

مکالمے کا اصل حسن یہ ہوتا ہے کہ اس کے کردار اپنی سماجی سطح اور ثقافتی صورت حال کے مطابق گفتگو کریں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک کردار سماج میں کسان کا کام کرتا ہے اور مکالمہ کے دوران میں اس کا لہجہ اور الفاظ بیوروکریٹ جیسا ہو، کسی کردار کو اپنے طبقے کی زبان سے اوپر والے طبقے کی زبان میں بات کرتے دکھانا تخلیق کار کی مہارت نہیں بلکہ کمزوری ہے جو اس کی تخلیق پر مکمل گرفت نہ ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو قاسمی کے کردار اپنے سماجی مرتبے کو سامنے رکھتے ہوئے گفتگو کرتے ہیں۔ ایسا ہی ایک خوبصورت مکالمہ ان کے ایک مضمون "صبح کرنا شام کا............" میں بیان ہوا ہے۔ اس مکالمے میں جو کردار حصہ لے رہے ہیں ان میں ایک ریٹائرڈ بزرگ ہیں جو محض وقت گزاری کے لیے کسی دوکان کے سامنے مونڈھے پر بیٹھے اور باتیں کرتے رہتے ہیں جب کہ دوسرا کردار ایک راہ گیر جو ان سے کسی منزل کا راستہ پوچھتا ہے۔ ان کے مابین ہونے والی گفتگو کو قاسمی نے یوں بیان کیا ہے:

"آپ کہاں سے آرہے ہیں؟"

"جی گوجرانوالہ سے آرہا ہوں"

"وہاں کس محلے میں رہتے ہیں؟"

"سیٹلائٹ ٹاؤن میں رہتا ہوں"

"شیخ اکرم صاحب کو تو آپ جانتے ہوں گے؟"

"نہیں جی"

"کمال ہے! کتنے عرصے سے آپ وہاں رہ رہے ہیں؟"

"تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے۔"

"تبھی ...... لاہور تک ٹرین میں آئے ہیں یا بس میں"

"جی بس میں آیا ہوں"

"پرائیویٹ بس میں آئے ہیں یا جی ٹی ایس میں؟"

"پرائیویٹ بس میں آیا ہوں۔"

..................شادی وادی تو ہو گئی ہو گی۔........."(۵۱)

اس مکالمے کے کردار اپنی سماجی اقدار کے حوالے سے بات کرتے ہیں۔ ایک طرف مجبور راہ گیر ہے جس کے لہجے سے کرب اور جلدی جانے کا تاثر ظاہر ہو رہا ہے تو دوسری طرف ریٹائرڈ شخص ہے جس کا کام محض وقت گزاری ہے۔ یہی مکالمے کا حسن ہے کہ اس کے کرداروں کے منھ سے ادا ہونے والے الفاظ ان کی سماجی حیثیت کو بھی سامنے لائیں۔ یہ خوبی عطاء الحق قاسمی کے بیانیے کو خاصا مضبوط بناتی ہیں اور قاری ان کی تحریر سے لطف لینے لگتا ہے۔

مؤثر بیانیے میں تخلیق کار مختلف الفاظ کی ذو معنویت کو بھی بڑی مہارت سے کام میں لاتا ہے۔ وہ الفاظ کی ذو معنویت سے اپنی تحریر کو چار چاند لگا دیتا ہے اور وہی تحریر اس کے بیانیہ کی اہم کڑی بن جاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی لفظوں کی ذو معنویت سے خوب کام لیتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"پاکستان میں پیروں فقیروں کی بہت پذیرائی ہوتی ہے۔ میں ایک پیر صاحب کے ڈیرے پر گیا۔ پیر صاحب بہت بڑے جاگیر دار ہیں۔ ڈیرے پر ان کے مریدوں کا جمگھٹا تھا جو والہانہ طور پر ان کا ہاتھ چوم رہا تھا۔ پیر صاحب اس دوران مجھ سے آکسن لہجے کی خوب صورت انگریزی میں گفتگو کرتے رہے اور اپنا بایاں ہاتھ انہوں نے بے نیازی سے مریدوں کے بوسے کے لیے ان کی طرف پھیلائے رکھا۔ جب مرید اس اظہارِ عقیدت سے فارغ ہوئے تو پیر صاحب نے ٹشو پیپر سے ہاتھ کے اس حصے کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کر صاف کیا جہاں ان کے مرید طبع آزمائی کرتے رہے تھے واضح رہے کہ یہ پیر صاحب اپنے مریدوں سے باہر کے حلقے میں بھی ہاتھ کی صفائی کے لیے مشہور ہیں۔" (۵۲)

"ہاتھ کی صفائی" کی ذو معنویت سے عطاء الحق قاسمی نے یہاں بہت کام لیا ہے۔ ہاتھ کی صفائی انتہائی چالاکی، ہشیاری اور دوسروں کو نظروں کے سامنے دھوکا دینے کے مترادف سمجھی جاتی ہے۔ یہاں انھوں نے اس کو ہاتھ صاف کرنے اور پھر آگے چل کر دوسروں کو اپنے دام میں اتارنے کے معنوں میں استعمال کر کے

اس سے خوب کام لیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قاسمی صاحب کو اپنے بیانیے پر عبور حاصل ہے۔ وہ مختلف الفاظ اور تراکیب کو مختلف معنوں میں استعمال کرنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔

پنجابی لفظیات کا استعمال:

عطاء الحق قاسمی کی نثر کے فنی تناظر کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کے ہاں اردو تحریر میں پنجابی لفظیات کا استعمال بھی ملتا ہے۔ شاعری اور نثر دونوں میں بہت سے تخلیق کاروں نے اردو میں پنجابی زبان کی لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ اردو اور پنجابی کے لسانی اشتراکات اس قدر مضبوط ہیں کہ اردو میں مختلف مفاہیم کے لیے پنجابی زبان کی لفظیات استعمال کی جاسکتی ہیں۔ لسانی اشتراک کی بنا پر دیکھا جائے تو پنجابی کے بہت سے عظیم شعرا کے ہاں بھی ایسے بہت سے الفاظ ملتے ہیں جو اردو میں بھی بخوبی استعمال ہو رہے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ میاں محمد بخش پنجابی کے معروف شاعر گزرے ہیں ان کا ذیل کا شعر دیکھیے۔

جس دلے عشق نہ رچیا کتے اس تھیں چنگے
مالک دے گھر راکھی کردے صابر بھکے ننگے (۵۳)

اس شعر کی لفظیات پر غور کیا جائے تو اس میں جس 'عشق' نہ' کتے 'اس' مالک 'گھر' کر' صابر' ننگے یسے الفاظ ہیں جو اردو میں بھی انہی معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں جن معنوں میں انہوں نے پنجابی میں ان کا استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جنھیں معمولی اشکالی تبدیلیوں کے ساتھ پنجابی میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً "رچ بس جانا"، "دل"، "راکھوالی"، کو "رچیا' دلے 'راکھی' میں تبدیل کر دیا گیا لیکن مفہوم وہی رہا جو دل کا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو دلے دل میں' کے لیے ے کا اضافہ۔ لفظ دل لے ہے 'لام مشدد ہے۔ لفظ دلے میں 'دل واضح آواز میں ہے اور یہ اردو والوں کے لیے غیر مانوس نہیں راکھی رکھوالی رکھ رکھنا سے ہے اور رکھنا تحویل کے لیے بھی ہے۔ رچیا، رچ بس جانا، رچنا بسنا وغیرہ کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ اردو والوں کے لیے وہ نامانوس نہیں رہتے۔ اسی طرح کی ایک اور مثال صوفی نیامت علی کی شاعری سے ملاحظہ ہو۔

نفس شیطان نیں بیلی تیرے' دنیا تیری حور
کھوتے گھوڑے اک برابر' پٹھے نیں دستور
صدیاں سولی تے ٹنگے بندے۔بیقصور
ظلم' ستم تے جبر قہر دی ہرپاسے للکار
مالک دے دربار جانا مالک دے دربار (۵۴)

ان اشعار میں دیکھا جائے تو ان میں بھی بہت سے ایسے الفاظ ملتے ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں۔ مثلاً نفس' شیطان' تیرے' دنیا' تیری' حور' گھوڑے' اک' برابر' دستور' صدیاں' سولی' بیقصور' ظلم' ستم' جبر' قہر' ہر' للکار' مالک' دربار' جانا، ''بیلی'' بیلی میں بے سین کی اور یے مقصورہ کی متبادل آوازیں ہیں گویا یہ لفظ اپنی اصل میں سہیلی ہے۔ یہاں ہمارے ہاں سہیلی عورتوں کی باہمی دوستی اور بیلی مردوں کی باہمی دوستی کے لیے مستعمل ہے۔ بندہ کی پنجابی میں جمع بندے ترکیب دیتے ہیں اور اردو میں لفظ بندے غیر مانوس نہیں۔ بندہ' خاوند کھسم کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ اردو میں 'مکتوبی صورت خصم ہے اور اس کے عربی معنی دشمن ہیں۔ دشمنی کے لیے خصومت ہی مستعمل ہے۔ یوں یہ کہا جاسکتا ہے اردو اور پنجابی کے آپس میں گہرے لسانی اشتراکات ہیں جس کی بڑی وجہ وہ تہذیبی اور سماجی ماحول ہے جس میں یہ دونوں زبانیں پروان چڑھی ہیں۔ تہذیبی حوالے سے اردو اور پنجابی دونوں کو ایک جیسا تہذیبی ماحول ملا دونوں زبانوں نے پنجاب کے پانی سے خود کو سیراب کیا اور پنجاب کی تہذیب اور معاشرت میں پروان چڑھیں یہی وجہ ہے کہ دونوں میں لسانی اشتراک کے ساتھ ساتھ تہذیبی اور ثقافتی اشتراک بھی پایا جاتا ہے۔ یوں یہ امر قابل یقین ہے کہ دونوں زبانوں میں ایک دوسری کی لفظیات شامل ہونا کوئی معیوب امر نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی ادیب اس سماجی، تہذیبی اور ثقافتی منظر نامے میں رہ کر لفظیات کے اشتراک سے روگردانی نہیں کر سکتا۔

اس منظر نامے میں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں بھی پنجابی لفظیات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔

انھوں نے ان لفظیات کو اس طرح اردو میں سمویا ہے کہ وہ اردو ہی کا حصہ معلوم ہوتے ہیں اور دوران قرات، قاری پر گراں نہیں گزرتے۔ عطاء الحق قاسمی نے پنجابی زبان کی لفظیات استعمال کرنے کے متنوع طریقے استعمال کیے ہیں۔ کہیں تو وہ ان کا استعمال بالکل اصلی صورت میں کرتے ہیں اور کہیں وہ ان میں اشکالی حوالے سے ردوبدل کر کے تحریر میں اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ وہ لفظ پنجابی کے ہی معلوم ہونے کے باوجود قاری کے لیے ایک نئے حظ کا باعث بنتا ہے اور قاری ان کی تحریر کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی پنجابی زبان کی لفظیات کا استعمال کرتے وقت سماجی صورت حال کو بھی سامنے رکھتے ہیں۔ بسوں اور دیگر ذرائع نقل و حمل میں سفر آج کے انسان کی بنیادی ضرورت بن گئی ہے۔ وہ زمانے گزر گئے جب لوگ پیدل میلوں کے سفر کیا کرتے تھے لیکن اب قلیل مسافرت کے لیے ذاتی یا کرائے کے ذرائع نقل و حمل استعمال کیے جاتے ہیں۔ کرائے کے ذرائع نقل و حمل میں مسافر کو بہت سی صعوبتیں بھی اٹھانا پڑتی ہیں۔

خاص طور پر کم ذرائع اور زیادہ مسافر ہونے کی صورت میں سیٹ حاصل کرنے کا عمل خاصا دشوار ہوتا ہے اور اگر سیٹ مل بھی جائے تو ہر شخص خود کو ہی آرام دینے کی کوشش میں لگا نظر آتا ہے۔ اس دوران بعض اوقات بات تو تکار تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا اس بارے میں مشاہدہ خاصا وسیع ہے وہ نہ صرف ان تمام حالات کو بیان کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں بلکہ ان کا بیانیے میں پنجابی الفاظ اس طرح استعمال ہوتے ہیں کہ کسی مخصوص پنجابی لہجے کی بھی عکاسی ہونے لگتی ہے۔ ایسے ہی ایک سفر کا حال بیان کرتے ہوئے وہ پنجابی لفظیات کا استعمال اپنی کتاب "عطایئے" میں یوں کرتے ہیں:

> "میں نے دائیں جانب سرکنے کی کوشش کی، مگر سیٹ اس قدر تنگ تھی کہ میرے ذرا سے دباؤ سے دوسرا مسافر سیٹ پر سے گرتے گرتے بچا، چنانچہ اس نے برا سامنہ بنا کر کہا "بھائی جی آرام نال بیٹھو۔"(۵۵)

اسی طرح اسی سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے آگے چل کر لکھتے ہیں:

> "اب میرے لیے نیند تو کجا، سکون سے بیٹھنے کے تمام راستے بھی مسدود ہو چکے تھے، چنانچہ میں نے سگریٹ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو برابر والے مسافر نے ایک بار پھر برا سا منہ بنایا اور کہا "بھا جی، اپنی جیب وچ ہتھ پاؤ"۔ (۵۶)

ان اقتباسات کو فنی تناظر میں دیکھا جائے تو ان میں بعض پنجابی الفاظ کسی مخصوص علاقے یا مخصوص قوم کی لفظیات کا منظر پیش کرتی ہیں۔ مثلاً ان دونوں مثالوں میں "بھا جی" ایسا پنجابی لفظ ہے جو پورے پنجاب میں رائج نہیں ہے۔ یہ لفظ ایک مخصوص قوم بولتی ہے۔ اس کے مترادف کے طور پر پنجابی میں ہی لفظ "بھائی جی"، "بھائی جان"، "بھراوا" بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ پنجابی زبان کے الفاظ استعمال کرتے وقت مختلف قوموں کے مزاج اور ان کی لسانیاتی صورت حال کو بھی سامنے رکھتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ وہ زبان کے مختلف لہجوں کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے پنجابی زبان کی لفظیات استعمال کرتے وقت اس ماحول اور خاص طور پر دیہاتی ماحول کو خاص طور پر مدِّ نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے مضامین کے عنوانات بھی پنجابی دیہاتی ماحول کے مختلف جانوروں اور اس ماحول کی دیگر اشیا کے ناموں پر ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں پنجابی لفظیات کے استعمال کو فنی تناظر میں دیکھا جائے تو ان کے یہاں پنجابی زبان کی تراکیب کے ساتھ ساتھ بعض ایسے مختصر پنجابی الفاظ بھی ملتے ہیں کہ اگر ان کی جگہ کوئی اردو

لفظ لگایا جاتا تو شاید وہ لفظ اتنے اختصار کا حامل نہ ہوتا اور دوسری بات یہ کہ پنجابی لفظ جملے کو جو معنی اور خوب صورتی عطا کر رہا ہے اس کا اردو متبادل ایسی خوب صورتی اور روانی جملے میں پیدا نہ کر سکتا۔ اس ضمن میں ایک مثال دیکھیے:

> "ان کا کہنا ہے کہ غیر شادی شدہ شخص کو یہ سہولت ہوتی ہے کہ وہ چارپائی کے دونوں طرف اتر سکتا ہے چنانچہ اس سہولت کے لیے انہوں نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اب جو وہ شادی پر رضامند ہوئے ہیں تو صرف اس بناء پر کہ کہیں پڑھ بیٹھے کہ شادی شدہ مردوں کی عمر لمبی ہوتی ہے حالانکہ ہوتی نہیں انہیں عمر لمبی لگتی ہے بہر حال میرے یہ دوست اب تل گئے ہیں کہ وہ شادی بھی کریں گے اور اپنے رن مرید ہونے کا مکمل کھل کر اعلان بھی کریں گے۔"(۵۷)

اس اقتباس میں قاسمی صاحب نے ایک اہم سماجی رویے کی جانب بڑے لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے۔ شادی شدہ زندگی کی ذمہ داریوں کی وجہ سے ہر کسی کو اپنی زندگی پہلے سے زیادہ مصروف نظر آتی ہے۔ قاسمی صاحب اس کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اپنے دوست کا ذکر کرتے ہوئے پنجابی لفظ "تل" کا استعمال کر کے جملے میں انتہائی خوب صورتی اور گہری تاثیر پیدا کر رہے ہیں۔ "تل" کا اردو متبادل "مصمم ارادہ کر لینا"، "کسی کام کے لیے ڈٹ جانا" اور اس طرح کے دیگر الفاظ ہیں۔ اب اگر تل کی جگہ یہ اردو الفاظ استعمال ہوتے تو شاید اتنے اختصار کے ساتھ اتنا بڑا مفہوم بیان نہ ہو سکتا اور جملے کو فنی حسن متاثر ہوتا لیکن قاسمی صاحب نے "تل" کا لفظ استعمال کر کے جملے کا ابلاغ بھی مؤثر بنا دیا ہے اور اس میں خوب صورتی بھی پیدا کر دی ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ وہ اسی طرح کا ایک ہی پنجابی کا لفظ استعمال کر کے جملے کی تاثیر میں خاصا اضافہ کر دیتے ہیں:

> "میں سوچتا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو لاکھوں دلوں کی دھڑکن بنا دیتا ہے اور اسے باعزت اور خوشحال زندگی گزارنے کے مواقع بھی فراہم کر دیتا ہے تو پھر اسے "کھے" کھانے کی کیا ضرورت پڑتی ہے۔"(۵۸)

"کھے کھانا" پنجابی لفظ ہے جس کے معنی سب کچھ ہوتے ہوئے فضول کی بے عزتی مول لینا ہے۔ یہاں قاسمی صاحب نے یہ پنجابی لفظ ایسے اشخاص کے لیے استعمال کیا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت سے نوازا ہوتا ہے اس کے باوجود وہ حرص زر میں اپنے ضمیر اور ملی حمیت کا سودا کرتے ہیں۔

قاسمی کی تحریروں میں پنجابی لفظیات کا استعمال بڑا بر محل اور موزونیت کے ساتھ ہوا ہے۔ ان کی تحریروں میں پنجابی لفظیات اپنے سماجی اور ثقافتی منظر نامے کی عکاس بننے کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے بھی مؤثر ہیں۔ ان کے ہاں پنجابی لفظیات کا استعمال ان کی تحریر کے ابلاغ کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ معنوی سطح پر بھی ان کی تحریر کو جاندار بناتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں اور مزاحیہ مضامین کے علاوہ جو ڈرامے تحریر کیے ہیں ان ڈراموں میں بھی بہت سے پنجابی الفاظ کا استعمال ملتا ہے۔ ڈراموں میں پنجابی لفظیات کے استعمال کی بڑی وجہ ان ڈراموں کا وہ سماجی اور ثقافتی منظر نامہ ہے جس کی عکاسی ان ڈراموں میں ہوتی ہے۔ قاسمی کے ڈراموں میں پنجاب کی تہذیب، سماج، ثقافت اور اقدار کی عکاسی خوب ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈراموں کے اکثر کردار آپس میں مکالمے کرتے وقت بہت سے پنجابی لفظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کی ایک مثال ان کے ڈرامے ”حویلی“ میں یوں ملتی ہے کہ اس ڈرامے کے ایک کردار عزیز الرحمٰن کی بیوی کہتی ہے:

"اب دیں جواب ابا جی کو! مجھے تو ہر روز ٹرخا کر دفتر چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہی۔ "(۵۹)

اس مکالمے میں لفظ "ٹرخا" پنجابی زبان کا ہے۔ یہاں اس لفظ کو انہوں نے جان چھڑانے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک کردار دوسرے کو روزانہ مختلف حیلوں بہانوں سے بہلا کر اور جان چھڑا لیتا ہے۔ قاسمی نے روز مرہ زبان کے استعمال کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اسی ڈرامے میں ایک اور جگہ پنجابی لفظیات کا استعمال یوں کیا گیا ہے:

"باتیہ ہے اباجان! اس نے یقینا میرے چپڑاسی کو امریکہ بھجوانے کا "لارا" لگایا ہو گا۔ "(۶۰)

یہاں لفظ "لارا لگایا" پنجابی کا لفظ ہے جو عام طور کسی کو دھوکے میں رکھ کر ٹرخانے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ قاسمی صاحب نے یہاں بھی پنجابی بول چال کو سامنے رکھا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے ڈراموں میں پنجابی لفظیات کا استعمال کرتے ہوئے ایک خاص امر جو سامنے رکھا ہے وہ پنجابی ثقافت اور پنجاب کے لوگوں کے مختلف مشاغل کے حوالے سے ہے۔ پنجاب میں پہلوانوں کی کشتی بہت مشہور ہے۔ قاسمی اپنے ڈراموں میں جہاں کشتی کرنے والے پہلوانوں کو سامنے لائے ہیں وہاں انہوں نے ان پہلوانوں کی زبان کو بھی سامنے رکھا ہے۔ مختلف پہلوان کشتی کرتے وقت اور عام بول چال میں بھی جو زبان

استعمال کرتے ہیں اس میں پنجابی لفظیات کی شمولیت لازمی ہوتی ہے۔ قاسمی نے سماجی اور ثقافتی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے ان پنجابی لفظیات کی عکاسییوں کی ہے کہ ڈراما "حویلی" کا ایک کردار بودی پہلوان مکالمہ کرتے ہوئے یوں کہتا ہے:

"یار اسلم پردیسی میں ابھی جاکے ڈاکٹر کو دکھاتا ہوں۔ مطلب ہے کہ ابھی میں نے جیرے پہلوان سے "کوہل" بھی کرنا ہے۔"(۶۱)

اس مکالمے میں پہلوانوں کی زبان میں استعمال ہونے والا پنجابی لفظ "کوہل" کشتی کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ پہلوان کشتی کو کوہل ہی کہتے ہیں اور پنجابی میں کشتی کے ساتھ ساتھ یہ "کوہل" کا لفظ بھی مستعمل ہے۔ اس ڈرامے میں پنجابی لفظیات کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

"ناصر بھائی! آپ روندنہ مارا کریں۔ آپ تین مرتبہ آؤٹ ہو چکے ہیں۔ ہر مرتبہ پھڈ اڈال دیتے ہیں۔"(۶۲)

پنجابی کھیل تماشوں میں استعمال ہونے والی پنجابی لفظیات کی عکاسی ان جملوں میں بخوبی ملتی ہے۔ یہاں "روند مارنا" اور "پھڈ اڈالنا" پنجابی لفظیات ہیں۔

پنجابی لفظیات کے استعمال کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی کا ڈراما "خواجہ اینڈ سنز" بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس ڈرامے میں بھی انھوں نے پنجابی لفظیات کو ان کے سماجی اور ثقافتی تناظر میں بیان کیا ہے۔ اس ڈرامے کے مختلف کردار بھی آپس میں مکالمہ کرتے ہوئے پنجابی لفظیات استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"جایئے بڑے مخولیے ہیں آپ۔ مجھے پتہ ہے آپ کادل نہیں چاہتا کہ میں جاؤں۔"(۶۳)

اس مکالمے میں "مخولیے" پنجابی لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ عام طور ان لوگوں کے بارے میں بولا جاتا ہے جو زیادہ مزاحیہ انداز میں بات کرتے ہیں اور کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ یہ لفظ پنجابی زبان میں ایک دوسرے کا مان رکھنے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ انہی معنوں میں قاسمی صاحب نے یہاں لفظ استعمال کیا ہے۔

ڈراما "خواجہ اینڈ سنز" میں کئی اور کردار بھی آپس میں مکالمے ادا کرتے وقت پنجابی لفظیات کا استعمال کرتے ہیں۔ ایک اور جگہ اس ڈرامے میں پنجابی لفظیات کی عکاسییوں ہوتی ہے:

"تمہاری بہنیں تمہارے گھوڑے کی باگیں پکڑنا چاہتی ہیں اور باگ پھڑائی بھی لینی ہے۔"(۶۴)

"باگ پھڑائی" پنجابی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔شادی بیاہ کے موقع پر پنجاب میں دولہے کو گھوڑے پر بٹھایا جاتا ہے اور اس کی باگ دولھے کی بہنیں پکڑتی ہیں اور بدلے میں پیسے لیتی ہیں جو اس ثقافت میں باگ پھڑائی کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں باگ پھڑائی کا پنجابی لفظ شادی کی خواہش کے اظہار کے معنوں میں بولا گیا ہے۔

"خواجہ اینڈ سنز" میں عطاء الحق قاسمی نے مختلف کرداروں کے سماجی تناظر کو مد نظر رکھتے ہوئے ان سے مکالمے ادا کروائے ہیں۔ انھوں نے پنجابی سماج کی عکاسی کرتے ہوئے پنجابی لفظیات کا استعمال یوں کیا ہے۔

"چلو اتار دو، چلو اتار دو، یہ ٹوپی ویکھ لی ہے میں نے "(۶۵)

یہاں قاسمی نے اردو لفظ "دیکھ" کی جگہ پہ "ویکھ" استعمال کر کے پنجابی سماج کی عکاسی کی ہے۔ پنجابی میں ویکھ کا لفظ ویخ کی صورت میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ اردو لفظ "دیکھ" کے مترادف کے طور پر ہی استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح پنجابی سماج کے حوالے سے ایک اور جگہ پنجابی لفظیاتیوں استعمال کی گئی ہیں:

"میں غلطی سے اس کمرے میں آ گیا ہوں یار، بڑا عجیب آدمی ہے۔ یہ تم نے بڑے ٹُٹے بھجے ملازم رکھے ہوئے ہیں۔"(۶۶)

یہاں "ٹُٹے بھجے" کا لفظ ایسے ملازمین کے لیے استعمال ہو رہا ہے جو کاہل اور سست ہوتے ہیں۔ کام چوری جن کا شیوہ ہوتا ہے۔ ایسے ملازمین کے لیے پنجابی لفظیات کا بہترین استعمال کیا گیا ہے۔

یوں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قاسمی کی تحریروں میں پنجابی لفظیات کا استعمال بڑا بر محل او رموزونیت کے ساتھ ہوا ہے۔

ان کی تحریروں میں پنجابی لفظیات اپنے سماجی اور ثقافتی منظر نامے کی عکاس بننے کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے بھی مؤثر ہیں۔ ان کے ہاں پنجابی لفظیات کا استعمال ان کی تحریر کے ابلاغ کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ معنوی سطح پر بھی ان کی تحریر کو جاندار بناتا ہے۔

محاورات کا استعمال

تخلیق کار کسی بھی تخلیق کو فنی حوالے سے کامیاب بنانے اور اس میں قاری کی دلچسپی بڑھانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتا ہے۔ یہ حربے ایک طرف اس کی تحریر کو فنی حوالے سے کامیاب بناتے ہیں تو دوسری طرف اس کی تحریر کی تاثیر میں بھی اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ محاورات کے استعمال کا حربہ اس حوالے سے کافی حد تک کامیاب حربہ ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محاورے سماج کے عام لوگوں کو بھی ازبر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی روزمرہ گفتگو کا حصہ ہوتے ہیں۔ یوں جب کوئی تحریر پڑھتے ہوئے ان کا واسطہ کسی محاورے سے پڑ جائے تو ان کے لیے وہ تحریر خاصی دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے، اور انہیں اپنے سماج کی عکاسی اس تحریر میں نظر آنے لگتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں جہاں اور بہت سی چیزیں ان کی تحریر کے حسن کو بڑھاتی ہیں وہاں ایک اہم چیز محاورات کا استعمال بھی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے ہاں محاوروں کا استعمال متنوع طریقے سے ملتا ہے۔ کہیں تو وہ محاورے کے مفہوم کو مد نظر رکھتے ہوئے اصل محاورے میں لفظی تبدیلیاں کرتے ہوئے اسے اپنے الفاظ میں تحریر کا حصہ بنا دیتے ہیں جس سے قاری کی نظر محاورے اور ان کی تحریر کے باہمی تعلق پر پہنچ کر اصل مفہوم اخذ کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ یہ ایک انتہائی مشکل کام ہے کہ محاورے کو عبارت کا حصہ اس انداز میں بنا دیا جائے کہ قاری مصنف کی اپنی تحریر اور محاورہ دونوں کا بیک وقت لطف لینے لگتا ہے۔ اور حظ سے سرشار ہو جاتا ہے۔ ایسی تحریر قاری کو اپنے سحر میں جکڑ کر اس پر لفظوں کی کثیر معنویت آشکار کر دیتی ہے۔ اس ضمن میں عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں بہت سی مثالیں ملتی ہیں، ایک مثال ملاحظہ ہو:

> "جو والدین یا میرج بیورو والے شادی کے اشتہارات اخبار میں چھپواتے ہیں، ان کی رسائی ڈاک کے ایک لفافے یا رجسٹریشن فیس کی ادائیگی سے ممکن ہو جاتی ہے اور ہینگ پھٹکری لگے بغیر رنگ بھی چوکھا آتا ہے۔"(۶۷)

اس بیان کو دیکھا جائے تو ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چڑھا چوکھا ایک مشہور محاورہ ہے، قاسمی صاحب نے یہاں اس محاورے کو اپنے الفاظ میں اس طرح استعمال کیا ہے کہ اس کا فنی حسن نکھر گیا ہے اور تحریر میں بھی ایک نئی جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ قاری اس محاورے کو اس کی اصلی صورت میں بیان کرنے کا سا لطف لینے لگتا ہے۔ یوں قاسمی کی تحریر میں لفظی تبدیلیوں کے ساتھ محاورات کا استعمال نہ صرف ان کی تحریر کو

قابل رشک بناتا ہے بلکہ ان کے استعمال کردہ محاوروں کے اصل حسن کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والے محاورات پنجابی حسن کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں ویسے بھی پنجابی لفظیات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے، محاورے اکثر وہ ایسے استعمال کرتے ہیں جن سے پنجابیت جھلکتی نظر آتی ہے۔

محاورے کو عبارت کا حصہ بنانا اور اس طرح استعمال کرنا کہ اس سے عبارت کی روانی میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو، عطاء الحق قاسمی کا عظیم فن ہے جس کا ثبوت ان کی تحریروں میں جگہ جگہ ملتا ہے۔ اس ضمن میں اور مثال ملاحظہ ہو:

> "یہ کہتے ہوئے استاد مکرم انصاف مرحوم نے شفقت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا" دیکھو بیٹے، بیک وقت بادشاہ ہونا اور اس کے ساتھ ساتھ عادل مشہور ہونا کوئی آسان کام نہیں، اسکے لیے بہت پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔"(۶۸)

پاپڑ بیلنا ایک مشہور محاورہ ہے جس کے معنی سخت محنت کرنا، خوب تگ ودو کرنا اور ایک کام کو انجام دینے کے لیے متنوع طریقے اختیار کرنا کے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اس محاورے کو بڑی خوب صورتی سے اپنی تحریر کا حصہ بنایا ہے۔ جس سے ان کی تحریر کی رعنائی اور بڑھ گئی ہے۔

بعض اوقات وہ محاورات کا استعمال اس طرح کرتے ہیں کہ ایک ہی جملے میں ایک سے زیادہ محاورے اتنی خوبصورتی سے سمو دیتے ہیں کہ قاری کو اصلیت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ایسا وہ اس وقت کرتے ہیں جب کسی ایسے کردار کے منہ سے محاورے ادا کرتے ہیں جو زیادہ پڑھا لکھا نہ ہو لیکن خود کو دوسروں کے سامنے بہت زیادہ تعلیم یافتہ اور اہل زبان کی صف میں شامل کرنے کے جتن کرتا ہو۔ مثلاً اپنے ایک مضمون "قنوطی" میں وہ ایک کردار کے منہ سے اس طرح کے الفاظ ادا کرواتے ہیں۔

> "اوہو، یہ تو سونے پر سہاگہ ہوا، میرا مطلب ہے ایک کریلا اور دوجا نیم چڑھا۔ معافی چاہتا ہوں کوئی مناسب محاورہ نہیں سوجھ رہا، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بہت افسوس ہوا۔"(۶۹)

ان جملوں میں استعمال ہونے والے محاورے اور صورت حال کو دیکھا جائے تو دونوں میں کوئی مشترک چیز نہیں ملتی کیونکہ جو صورت حال بیان ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ ایک کردار نوکری نہ ملنے اور پانی نہ آنے کا رونا رو رہا ہے جس کو بیان کرنے کے لیے محاورے استعمال کیے جا رہے ہیں کسی کام کے بہترین ہونے

کے یعنی سونے پہ سہاگہ اور ساتھ ہی دوسرا محاورہ ایک کریلا دوسرا نیم چڑھا استعمال ہو رہا ہے۔ اور انداز ایسا اپنایا جارہا جیسے کسی شخص کو زبان پہ قدرت تو نہ ہو لیکن وہ اپنے آپ کو قادر الکلام ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عطاء الحق قاسمی محاورات کے استعمال میں بھی خاص مہارت اور ملکہ رکھتے ہیں اور محاورہ استعمال کرتے وقت صرف زبان دانی کا ثبوت ہی نہیں دیتے بلکہ سماج کے مختلف کرداروں کی سماجی حیثیت کو بھی سامنے رکھتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی بعض اوقات اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے بھی محاور تأبات کر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک جگہ یوں لکھتے ہیں:

> "عمر چھپانے کی شوقین خواتین میں سے ایک خاتون مجھے ایسی بھی ملیں جو اس رویے کی شدومد کے ساتھ مخالف تھیں، ان کا کہنا تھا کہ عمر چھپانے کے ساتھ اصلیت نہیں چھپائی جا سکتی چنانچہ جو خواتین اپنی عمر کم بتاتی ہیں، وہ صرف دوسروں کو نہیں خود کبھی دھوکے دیتی ہیں، یہ خاتون کہہ رہی تھیں کہ انھیں اپنے ۴۳ برس کے ہو جانے کا کوئی افسوس نہیں یہ ان کی زندگی کا بہترین پیریڈ ہے جو وہ گزار رہی ہیں، ان کی یہ باتیں سن کر میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ میں ان کی عمر کے حوالے سے اپنا تخمینہ بتا کر اس ۴۳ سالہ رنگ میں بھنگ ڈالوں!"[۷۰]

رنگ میں بھنگ ڈالنا بھی ایک محاورہ ہے جس کا مطلب بنے بنائے کام کو بگاڑنا ہوتا ہے یہاں کسی جمی ہوئی محفل کو خراب کر دینا بھی اس کے معنوں میں آتا ہے۔

محاورہ لوگوں کی بول چال اور تجربات سے جنم لیتا ہے اور اس میں سماج کی کسی حقیقت کو بیان کیا گیا ہوتا ہے۔ اس تناظر کو عطاء الحق قاسمی خوب مد نظر رکھتے ہیں۔ وہ سماجی تناظر کو سامنے رکھتے ہوئے محاورے استعمال کرتے ہیں اور پنجابی محاورے ان کی تحریر کو معنوی اور جمالیاتی سطح پر بہترین بناتے ہیں۔ ایک جگہ پنجابی محاورے کا استعمال یوں کرتے ہیں۔

"میں نثری نظم کے خلاف نہیں ہوں، مگر کچھ غیر شاعر نے شاعر کہلوانے کے لیے یہ چور دروازہ تلاش کیا ہے، خصوصاً کچے پکے ذہنوں والے نوجوان نثری نظم کے امام مبارک علی کے پیچھے نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ڈھٹی ہوئی میت دا گالڑ امام "(۷۱)

عطاء الحق قاسمی محاورات کے استعمال میں طبقاتی تفریق کو بھی سامنے رکھتے ہیں۔ محاورہ کسی عبارت میں اپنا حسن اسی وقت دکھاتا ہے جب اس کے تمام لوازمات پورے کرتے ہوئے اسے استعمال کیا جائے۔ سماجی، ثقافتی اور طبقاتی منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے محاورے کا استعمال نہ صرف اس تحریر کو فنی حوالے سے خوب صورت بناتا ہے بلکہ موضوعاتی اور فکری سطح پر بھی تحریر کو کثیر معنویت کے وصف سے مالا مال کرتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والے محاورات بر محل اور تحریر کے اسلوب کو زیادہ با معنی بناتے ہیں۔ حکمرانوں کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ان کے ہاں طاقت کا تصور خاصا مضبوط ہوتا ہے۔ بہت سے حکمران اپنے خلاف یا قانون کے خلاف ہونے والی سرگرمیوں کو طاقت کے ذریعے کچلنے پر یقین رکھتے ہیں۔ مارشل لا کے دنوں میں تو یہ تصور اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔ طاقت کا تصور نہ صرف حکمرانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے بلکہ حکمران بننے کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس صورت حال کو قاسمی صاحب نے کس خوبصورتی سے پنجابی محارے سے بیان کیا ہے:

"اقتدار میں آنے کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے جو تیسری دنیا کے ممالک میں نہ صرف آزمایا گیا ہے بلکہ بیشتر صورتوں میں بہت مفید ثابت ہوا ہے، چنانچہ حکمران ہمیشہ "ڈنڈا پیر اے وگڑیاں تگڑیاں دا" والے سنہری اصولوں پر عمل کرتے ہیں۔"(۷۲)

عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں میں پنجابی زبان کے محاورات اور ضرب الامثال کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جو مختلف اسفار کیے تھے ان میں ان کے ساتھ بہت سے ملکی اور خاص طور پر پنجابی لوگ شامل تھے۔ اور ان کی آپس میں گفتگو کے دوران میں پنجابیالفاظ کا استعمال موقع محل کی مناسبت سے ہونالازمی امر ہے۔ ذیل میں اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

"دوسری جنگ عظیم کے دوران بدبخت انگریز فوجیوں نے مقامی آبادی کی نسل تبدیل کرنے کی جو کوششیں کی تھیں وہ کم از کم اس کیس میں پوری طرح کامیاب ثابت ہوئی تھیں۔"لوجی ہن ٹیم چکیا گیاجے! گویا اب شاہ جی بھی قائل ہو گئے تھے۔"(۷۳)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کے اردو نثر میں محاورات اور خاص طور پر پنجابی محاورات کا استعمال خاصا موزوں اور بر محل ملتا ہے، جس سے نثر میں فنی سطح پر حسن پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ معنوی سطح پر بھی تحریر کو اعلیٰ مقام پر پہنچانے میں انہوں نے خوب کام لیا ہے۔ سماجی، ثقافتی اور طبقاتی منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے محاورے کا استعمال نہ صرف اس تحریر کو فنی حوالے سے خوب صورت بناتا ہے بلکہ موضوعاتی اور فکری سطح پر بھی تحریر کو کثیر معنویت کے وصف سے مالا مال کرتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والے محاورات بر محل اور تحریر کے اسلوب کو زیادہ بامعنی بناتے ہیں۔ حکمرانوں کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ان کے ہاں طاقت کا تصور خاصا مضبوط ہوتا ہے۔ بہت سے حکمران اپنے خلاف یا قانون کے خلاف ہونے والی سرگرمیوں کو طاقت کے ذریعے کچلنے پر یقین رکھتے ہیں۔

تلمیحات کا استعمال

تلمیح سے مراد کسی گزرے ہوئے مشہور واقعہ کی طرف تحریر میں اس طرح اشارہ کرنا کہ تحریر کی صورت حال اور ماضی کے اس واقعے میں کوئی نہ کوئی مماثلت کسی بھی حوالے سے پیدا ہو جائے۔ یہ صنعت شاعری اور نثر دونوں میں کثرت سے استعمال کی جاتی ہے جو فکری اور فنی دونوں حوالوں سے تحریر کو پر اثر بناتی ہے۔ تلمیح استعمال کرنے کا فن اسی شخص کو آتا ہے جو ماضی کا گہرا مطالعہ رکھتا ہو اس کے ساتھ ساتھ وہ مختلف چیزوں میں مماثلت ڈھونڈنے کے فن سے آشنا ہو۔ تلمیح استعمال کرتے وقت یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایسے واقعے کی تلمیح بیان کی جائے جو آپ کے قارئین کے لیے زبان زد عام کا درجہ رکھتا ہو تبھی وہ اس تلمیح سے لطف اندوز ہو پائیں گے۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی تلمیحات کا استعمال کرنا جو سماج کے اکثر لوگوں کے علم میں ہی نہ ہوں وہ مفید ثابت ہونے کی بجائے بعض اوقات تحریر کی روانی میں رکاوٹ کا باعث بھی بن جاتی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ حال کی جس صورت حال کے لیے تلمیح استعمال کی جارہی ہو اس کے اور ماضی کے واقعے کے ساتھ ساتھ گہری مماثلت ہونا ضروری ہے۔ تخلیق کار اس فن میں ماہر ہو کہ وہ حال اور ماضی میں مطابقت اور مماثلت کا

کوئی نہ کوئی زاویہ تلاش کر لے، ایسا کرنے کے بعد استعمال ہونے والی تلمیح تحریر کو قاری کے لیے دلچسپی کا سامان بننے کے ساتھ ساتھ فکری سطح پر بھی اس کے ذوق کی تسکین کا باعث بنے گی۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریریں نثر لطیف کے عمدہ نمونے ہیں۔ نثر لطیف میں تلمیح کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ قاسمی نہ صرف اس اہمیت سے آگاہ ہیں بلکہ وہ اپنی نثر میں مختلف تلمیحات استعمال کرتے وقت ان کے لوازمات کو بھی مد نظر رکھتے ہیں جس سے ان کی استعمال کردہ تلمیحات ان کی نثر کا حسن بڑھانے کے ساتھ ساتھ فکری بالیدگی بھی عطا کرتی ہیں۔ ذیل میں اس ضمن میں ایک مثال پیش کی جاتیہے۔ ملک میں جاری سفارش کے کلچر کو مختلف تخلیق کاروں نے مختلف انداز میں بیان کیا ہے، اکثریت کے ہاں اس کے منفی پہلو کی ہی عکاسی ملتی ہے کہ سفارش کے ذریعے لوگ دوسروں کا حق مار جاتے ہیں۔ لیکن عطاء الحق قاسمی سفارش کے اس عمل کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ہمیں جب کسی سے کام پڑتا ہے اور وہ کام اکثر جائز ہوتا ہے جو ناجائز نظام کی وجہ سے اپنے آپ نہیں ہورہا ہوتا، توہم کوئی سفارش ڈھونڈتے ہیں اور سراپا عجز وانکسار بن کر اس سفارشی کے پاس پہنچتے ہیں۔ سفارشی بھی اسی ناجائز نظام کا باسی ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنی سفارش اپنے پاس سنبھال کر رکھنا چاہتاہے کہ خود اسے بھی کسی وقت اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن جو میری طرح کے رقیق القلب سفارشی ہوتے ہیں، وہ فوراً اس آتشِ نمرود میں کود پڑتے ہیں۔" (۷۴)

اس بیان کو دیکھا جائے تو قاسمی نے سفارش کے حوالے سے معاشرے کا ایک نیازاویہ دکھایا ہے کہ سفارش صرف دوسروں کا حق مارنے کے لیے ہی نہیں کی جاتی بلکہ بعض اوقات اپنا حق لینے کے لیے بھی لوگوں کو سفارش بلکہ رشوت تک کی لعنت کو گلے لگانا پڑتا ہے اس کی بڑی وجہ نظام کی خرابی اور احتساب کا کمزور نظام ہے جس نے اس معاشرے کو گھن کی کھوکھلا کر دیا ہے۔ قاسمی صاحب نے اس صورت حال کو بیان کرنے کے لیے آتشِ نمرود کی تلمیح استعمال کی ہے۔ کہ سفارشی کلچر کی یہ آگ ایسی ہے کہ لوگ اس میں کودے جارہے ہیں جب کہ ان کا کوئی قصور بھی نہیں۔ آتش نمرود کی تلمیح کو دیکھا جائے تو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو جب نمرود نے آگ میں پھینکا تھاتو ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کا کوئی قصور نہیں تھابلکہ نمرودی نظام خراب تھا جس کے خلاف ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اللہ کے حکم سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ آج بھی سفارش کی جو آگ معاشرے میں جل رہی ہے اس میں کودنے والے بہت سے ایسے ہوتے ہیں جن کا اپنا کوئی قصور نہیں

ہوتا بلکہ نظام کی خرابی کی وجہ سے وہ اپنا جائز حق لینے کے لیے سفارش کی آگ میں کود پڑتے ہیں۔اس زاویے سے عطاء الحق قاسمی نے اس تلمیح کا استعمال بڑا بر محل کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں اور بھی بہت سی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں مختلف تلمیحات کا موزوں استعمال کر کے انہوں نے اپنی نثر کی تاثیر میں اضافہ کیا ہے۔

تشبیہات کا استعمال

تشبیہ دو چیزوں میں مشترک خصوصیات کی بنا پر ایک چیز کو دوسری کی مانند قرار دینے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ شاعری میں اس کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ شاعر حضرات مختلف تخیلات اور احساسات وجذبات کی عکاسی کرتے وقت مختلف تلمیحات کا استعمال کرتے ہیں جس میں وہ ایک چیز کو دوسری کی مانند قرار دے کے اس کی تاثیر میں اضافہ کرتے ہیں۔نثر میں بھی تشبیہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔نثر نگار تحریر میں مختلف چیزوں کو دوسری چیزوں کی مانند قرار دے کر بیان کر کے اپنی تحریروں کی تاثیر میں مزید اضافہ کرتے ہیں۔

تحریر کی تاثیر میں اضافہ کرنے کے ساتھ ساتھ نثر میں کسی ایک چیز کو کسی سماج کی دوسری چیز سے سماجی تناظر میں مطابقت اور مشابہت پیدا کرنے کے لیے بھی تشبیہ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک چیز ایک معاشرے کا حصہ ہوتی ہے لیکن اس سے مشابہ کوئی اور چیز کسی دوسرے معاشرے کا حصہ ہوتی ہے۔اب مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کے ذریعے ان معاشروں میں بھی مطابقت قائم کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔یوں تشبیہ کا استعمال اس کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔تشبیہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ دونوں چیزوں میں کوئی نہ کوئی اشتراک لازمی پایا جائے،اشتراک کے بغیر تشبیہ کا استعمال بے معنی ہوتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں نثر میں تشبیہ کا استعمال بڑے بہترین انداز میں ہوا ہے۔ تشبیہ کے ذریعے وہ نثر میں مختلف چیزوں کو ایک دوسرے سے مشابہ بیان کر کے جملوں میں خوب صورتی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان چیزوں کی تاثیر میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔اسی طرح ایک جگہ تشبیہ کا استعمال کرتے ہوئے صورت حال کو یوں خوب صورت انداز میں بیان کرتے ہیں:

"اگر تو آپ کی سفارش کام نہیں آتی تو"سائل" تیر کی طرح واپس آپ کی طرف آتا ہے اور کہتا ہے "جناب مجھے اپنا کام نہ ہونے کا کوئی افسوس نہیں مگر مجھے یہ دیکھ کر سخت دکھ ہوا کہ جناب کی شہر میں ٹکے کی عزت نہیں۔"(۷۵)

معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے سفارش ڈھونڈنا ہی بہت بڑا امتحان ہوتا ہے اور اگر کوئی تگ ودو کے بعد یہ مرحلہ طے کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کے بعد بھی اگر اس کا کوئی کام نہیں ہو پاتا تو اسے اپنے وقت کے ضیاع کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ افسران کے ساتھ ساتھ اس شخص کو بھی موردِ الزام ٹھہرانے لگتا ہے جس کی سفارش لے کر وہ افسران کے ہاں حاضر ہوا تھا۔ جن کا بس چلتا ہے وہ سفارش کرنے والے کو کھری کھری سنانے کے لیے فوراً اس کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے اس فوراً واپس پہنچنے کو قاسمی صاحب نے "تیر کی طرح" کی تشبیہ سے بیان کیا ہے۔ "تیر کی طرح" کی تشبیہ پنجابی میں بھی استعمال کی جاتی ہے جس کے معنی بہت جلد ہونا کے ہیں کہ جس طرح تیر کمان میں سے نکلتے ہی تیزی سے اپنے ہدف کی طرف بڑھتا ہے اسی طرح کسی کام کے لیے جلدی سے بڑھنے کو اس تشبیہ سے بیان کیا جاتا ہے۔

"تیر کی طرح" کی تشبیہ کی ایک اور خاص خوبی یہ ہے کہ کہ تیر اپنی کمان سے نکلنے کے بعد ایک تو تیزی سے ہدف کو بڑھتا ہے دوسرا یہ کہ اپنی سمت تبدیل نہیں کرتا بلکہ سیدھا چلا جاتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھیں تو قاسمی صاحب کے ہاں اس جملے میں اس تشبیہ کے استعمال کی افادیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جس طرح تیر کمان سے نکلنے کے بعد اپنی سمت تبدیل کیے بغیر جلدی سے ہدف کو بڑھتا ہے ایسے ہی "سائل" اپنا کام نہ ہونے کے بعد دفتر سے نکلتے ہی کہیں اور جانے کے بجائے سیدھا اور تیزی سے سفارشی کے گھر پہنچتا ہے اور اسے کھری کھری سنا دیتا ہے۔

پنجابی تشبیہات کا استعمال عطاء الحق قاسمی کے ڈراموں میں بھی ملتا ہے۔ ایک ڈرامے "خواجہ اینڈ سنز" میں کردار بولتے ہوئے پنجابی تشبیہاتیوں استعمال کرتے ہیں:

"میری مان تو شادی کر لے، گواچی گاں کی طرح پھرتا رہتا ہے۔"(۷۶)

یوں یہ کہا جس سکتا ہے کہ قاسمی صاحب کی نثر میں تشبیہات کا استعمال بھی خاصا موزوں اور معنوی سطح پر خاصے بہترین انداز میں ہوا ہے جس سے ان کی نثر صوری اور معنوی دونوں حوالوں سے اعلیٰ مقام کی حامل قرار پاتی ہے۔

تکرار لفظی

تخلیق کار ادب تخلیق کرتے وقت جن صناع سے کام لیتا ہے ان میں سے ایک اہم صنعت تکرار لفظی کی بھی ہے۔ اس میں ایک لفظ کو ایک سے زیادہ بار اکٹھا استعمال کیا جاتا ہے جس سے تحریر کی تاثیر میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص آہنگ بھی جنم لیتا ہے جو قاری کے لیے تحریر میں دلچسپی برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی نثر میں اس صنعت کا استعمال بھی خاصا ملتا ہے۔ وہ نثر میں مختلف الفاظ کے بار بار استعمال سے تکرار لفظی کی ایسی خوبی پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس سے قاری ان کی تحریر کے آہنگ میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ تکرار لفظی کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> "ان دنوں ہمارے ایک دوست تازہ تازہ اسیر محبت ہوئے ہیں، گزشتہ روز صبح صبح ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے "میں شدید طور پر محبت میں مبتلا ہو گیا ہوں، مجھے نصیحت کرو"(۷۷)

ان جملوں میں "تازہ تازہ" اور "صبح صبح" کی تکرار لفظی نے صورت حال کی شدت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ جملے کی تاثیر میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔

اسی طرح اپنے سفر ناموں میں انہوں نے بعض اوقات پنجابی زبان کے اشعار کا استعمال کر کے بھی اپنی نثر کو خوبصورتی اور رعنائی بخشی ہے۔ ایک سفر نامے میں پنجابی زبان کے معروف شاعر عبیر ابوذری کے شعر کو یوں استعمال کرتے ہیں۔

> "مجھے کبھی سرمایہ دار بن کر دیکھنا چاہیے تاکہ پتا تو چلے کہ اس کے بعد انسان کی "جون" میں تبدیلیاں کیسے آتی ہیں؟ اس خواہش کا اظہار عبیر ابوذری نے بھی اپنے اس شعر میں کیا ہے۔
>
> سہگل ہون نوں جی کردا اے ساڈا وی
>
> کٹے چون نوں جی کردا اے ساڈا وی (۷۸)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی لفظیات فکری اور فنی دونوں تناظرات میں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی نثر میں پنجابی لفظیات فکری سطح پر پنجابی معاشرت، پنجابی ثقافت اور پنجابی فنون لطیفہ کی عکاسی کرتی ہیں تو فنی سطح پر پنجابی لفظیات کا استعمال پنجاب کے لسانی منظر نامے کو واضح کرنے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ سماجی، ثقافتی اور طبقاتی منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے محاورے کا استعمال نہ صرف اس

تحریر کو فنی حوالے سے خوب صورت بناتا ہے بلکہ موضوعاتی اور فکری سطح پر بھی تحریر کو کثیر معنویت کے وصف سے مالا مال کرتا ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والے محاورات بر محل اور تحریر کے اسلوب کو زیادہ بامعنی بناتے ہیں۔ حکمرانوں کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور ہے کہ ان کے ہاں طاقت کا تصور خاصا مضبوط ہوتا ہے۔ بہت سے حکمران اپنے خلاف یا قانون کے خلاف ہونے والی سرگرمیوں کو طاقت کے ذریعے کچلنے پر یقین رکھتے ہیں۔ معاشرے میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے سفارش ڈھونڈنا ہی بہت بڑا امتحان ہوتا ہے اور اگر کوئی تگ ودو کے بعد یہ مرحلہ طے کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کے بعد بھی اگر اس کا کوئی کام نہیں ہو پاتا تو اسے اپنے وقت کے ضیاع کا شدید احساس ہوتا ہے اور وہ افسران کے ساتھ ساتھ اس شخص کو بھی موردِ الزام ٹھہرانے لگتا ہے جس کی سفارش لے کر وہ افسران کے ہاں حاضر ہوا تھا۔ جن کا بس چلتا ہے وہ سفارش کرنے والے کو کھری کھری سنانے کے لیے فوراً اس کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔

اشاریہ پنجابی الفاظ

عطاء الحق قاسمی کی اردو نثر میں استعمال ہونے والے اہم پنجابی الفاظ کی تفصیل یہ ہے

اباسیاں (اباسی کی جمع، جمائی لینا جو کہ تھکاوٹ ظاہر کرتی ہے)(۷۹)

شر۔ گوشیاں ۲۶

"اباسیاں" پنجابی لفظ "اباسی" کی جمع ہے اور یہ تھکاوٹ اور بے آرامی، اکتاہٹ کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اس کا اردو مترادف ہے "جمائی لینا"۔ منہ کھول کر جمائی لی جاتی ہے۔ ایک پنجابی محاورہ بھی ہے " اباسیاں دے دے تے اٹھی جانا" یعنی انتظار کر کر کے تھک کر چلے جانا۔

ادھ پچدا (تقریباً آدھا، ادھورا۔ کسی کام کی عدم تکمیل، ادھ پچدھ، معمولی سا، کچھ، تھوڑا بہت)(۸۰)

گوروں کے دیس میں، مشمولہ: سفر نامے، ص ۵۴۴

کسی کام کے مکمل نہ ہونے پر کہا جاتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال پنجابی میں عام کیا جاتا ہے اکثر لوگ ادھورے کام کو "ادھ پچدا" کہہ دیتے ہیں۔

اڈاری (اڑان، اڑنے کا کام یا حالت، کہیں چلے جانا)(۸۱)

عطائیے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۳۴۴

پرندوں کے اڑنے کو اڈاری مارنا بھی کہتے ہیں۔ اڈاری پنجاب کا ایک ٹھیٹھ لفظ ہے جو چلے جانے کے معانی میں بھی بولا جاتا ہے۔ پنجابی کے کئی گیتوں میں اس کی گونج سنائی دیتی ہے۔

ساڈی لمبی اڈاری وے بابل اساں اڈ جانا

یہ شعر ماں باپ کے گھر سے بیٹی کے رخصت ہو جانے کی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

استادی (استاد کا کام، ہنر مندی، چالاکی، کاری گر)(۸۲)

گوروں کے دیس میں، مشمولہ: سفر نامے، ص۱۱۵

استادی ویسے تو ایک پیشہ ہے لیکن سماجی منظر نامے میں دیکھا جائے تو کسی شخص کی استادی تسلیم کرنے سے مراد اسے علم اور تجربے میں خود سے بہتر سمجھنا ہے۔ سماج میں اس کا استعمال بھی انہی معنوں میں ہوتا ہے۔

اللہ لوک (اولیا اللہ، فقیر، درویش لوگ، سیدھا سادھا)(۸۳)

گوروں کے دیس میں، مشمولہ: سفر نامے، ص۵۲۱، ۵۶۳۔ دلی دور است ۶۷۳

اللہ لوک ویسے تو فقیر شخص کو کہا جاتا ہے۔ سماج میں مجنون لوگوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اس کے علاوہ سماجی سطح طرح پر اس کی اہمیت بعض لوگوں کے نزدیک ولی کامل جیسی بھی ہے۔

الاہمہ (گلا، شکوہ، طعنہ، احتجاج، الزام کی شکایت، فریاد، بری بات)(۸۴)

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص۳۲۴

الاہمہ، گلے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پنجابی سماج و ثقافت میں اس لفظ کی خاص اہمیت ہے۔ ہر پنجابی خاندان اپنے بچوں کی تربیت کے دوران اس کو بھی خاص مد نظر رکھتا ہے کہ ان کے بچے کا کوئی طرز عمل "الاہمے" کا باعث نہ بنے۔

اوچھڈ و جی (جھگڑا ختم کرو جی، تیاگنا، سمبندھ توڑ لینا، تجنا، چھوڑ دینا، ترک کر دینا،)(۸۵)

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص۳۰۸

پنجابی سماج میں اس لفظ کا سماجی سطح پر خاص مقام ہے۔ تنازع کی صورت میں تصفیہ کے لیے کہا جاتا ہے کہ " چھڈو جی یعنی چھوڑو لڑائی اور جھگڑا ختم کرو"۔

اوئی اللہ (دکھ بھری آواز درد سے آواز نکالنا، عورت ناز کے وقت یہ کلمہ بولتی)(۸۶)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص۴۴۱

پنجابی کا یہ لفظ اس وقت عام بولا جاتا ہے جب کوئی انہونی ہو جائے۔ یہ بھی پنجابی سماج میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

اوئے بھولے (مخاطب کرنے کے لیے چھوٹے یا گھٹیا درجہ کو بلانے والا مردانہ لفظ)[۸۷]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۹۵۱

بھولا پنجابی کا عام لفظ ہے۔ اس لفظ کا سماجی تناظر اس حوالے سے سامنے آتا ہے کہ سماج میں اس شخص کو عام سی بات کا بھی شعور نہ رکھتا ہو اسے بھولا کہہ کر پکارا جاتا ہے خواہ ہو کتنا ہی سمجھ دار کیوں نہ ہو۔

باراتی (دولہا کے ہمراہی، باراتی، برات سے متعلق)[۸۸]

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۷۱

دیہاتوں میں یہ لفظ بہت عام ہے۔ اس موقع پر بھی بولا جاتا ہے کہ جہاں سارے آرام سے بیٹھ جائیں تو کہا جاتا ہے کہ "تسی باراتی او اٹھ کے کم کاج کرو" کیونکہ باراتی بطور مہمان آئے ہوئے ہوتے ہیں وہ کام نہیں کرتے۔

باگ پھڑائی (واگ پھڑائی، دلہا کی گھوڑی کی باگ پکڑنے کی وجہ سے جو رقم بہنوں کو ملے)[۸۹]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۰، (مزید: خواجہ اینڈ سنز قسط نمبر ۱)

باگ پھڑائی کی رسم سماج میں بہت مقبول ہے۔ یہ رسم شادی بیاہ کے موقعوں پر ادا کی جاتی ہے۔ دولہے کو گھوڑی پر بٹھا کر اس کی بہن باگ پکڑتی ہے اور راگ کے پیسے لیتی ہے۔ اردو میں اس لفظ کو "باگ پکڑنا" کہا جاتا ہے۔

بڑی شے (اچھی چیز، انوکھا یا زبردست)[۹۰]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۰۳

"بڑی شے اے" پنجابی معاشرے میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ثقافتی حوالے سے بھی یہ لفظ عام استعمال ہوتا ہے۔ طنزاً بھی سماج میں بولا جاتا ہے۔

بڑھک (بوڑ، سنڈھے وغیرہ کے گجنے کی آواز، آواز گاؤنر، بھبک، گرج، رعب دار آواز، شیخی)[۹۱]

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۷۳

بڑھک پنجابی میں خود نمائی اور اپنے آپ کو طاقت ور اور بڑا ثابت کرنے کے لیے اونچی آواز میں بولے جانے والے الفاظ کو کہا جاتا ہے سماجی حوالے سے بڑھک مارنا سماجی سطح پر طبقاتی تفریق کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

بوٹا لاوے گا (مڈ بنھنا، لڑکا پیدا ہو جانا)[۹۲]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص۳۲۳،۲۸۱

یہ ایک دعائیہ پنجابی لفظ سماج و ثقافت میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس لفظ میں نسل بڑھنے کی دعا خاص پنجابی انداز میں دی جاتی ہے۔ بوٹا لگنا سے مراد اولاد کا ہونا ہے۔ یہ لفظ اردو میں بولا جا رہا ہے۔ فقیر بھی اکثر بولتے ہیں "دے جا سخیا راہ خدا تیر االلہ بوٹا لاوے گا"

بونگی (بونگا سے، بے سر پیر کی باتیں کرنے والا، جس کے دل میں بات نہ رہ سکے، جھلا، بدھو، احمق، بے وقوف، لمبا تڑنگا، بدھی شکل والا)[۹۳]

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص۲۳۷، ۲۳۴

دیہاتی علاقوں میں بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ بات کو بڑھا چڑھا کر باتیں کرنا۔ جسے بونگی مارنا بھی کہا جاتا ہے۔ بونگیاں مارنا یعنی جھوٹی باتیں کرنا وغیرہ

بھاگ لگے رہن (قسمت اچھی ہونا، دھن اور اولاد ہو جانا، بال بچوں کا سکھ)[۹۴]

بارہ سنگھے ۴۵

پنجابی سماج میں یہ لفظ دعائیہ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سماجی اور ثقافتی تناظر میں دیکھا جائے تو فقیر اور بھکاری کسی سے خیرات پانے کے بعد دعائیہ انداز میں یہ لفظ بولتے ہیں۔ پنجابی میں مراسی، کمی، یا پھر خیرات میں ملنے والی رقم، پیسے، گندم، جو، یا پھر اجناس کے بعد دینے والے کے لیے دعائیہ الفاظ بولے جاتے ہیں "بھاگ لگے رہن"

بھاء جی (بھائی، بھرا)[۹۵]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص۱۳۶، ۱۳۹، ۱۵۹

بھاء جی خالص پنجابی لفظ ہے اور عام طور پر بھائی کے معنوں میں آتا ہے۔ لیکن پنجابی سماج میں کسی بھی شخص کو عزت سے مخاطب کرتے یا تاکید کرنے کے لیے بھاء جی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔

بحثیا (کسی بات پر ایک سے زیادہ لوگوں کی خیال آرائی کرنے والا)[۹۶]

شر۔ گوشیاں ۶۹

پنجاب میں یہ لفظ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو بہت زیادہ سوالات کرنے والا ہو ہر بات پر بحث شروع کر دینے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

بھڑا (بھڑانا سے۔ لڑائی جھگڑا، لڑانا، گھسانا)(۹۷)

آپ بھی شرمسار ہو ۸۰

پنجاب میں لڑائی جھگڑے اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ دشمنیاں لوگوں نے پال رکھی ہیں اس لڑائی جھگڑا میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والے کو "بھڑا" کہتے ہیں۔

بھنگڑا (پنجاب کا ایک لوک رقص)(۹۸)

آپ بھی شرمسار ہو ۶۳۔ مجموعہ (بلبلے)، ۹۱

بھنگڑا پنجاب کا مقبول ترین ناچ ہے۔ بیساکھی میلے کے علاوہ عرس وغیرہ کے موقعوں پر بھی ڈالا جاتا ہے۔ خوشی اور شادی بیاہ کے موقعہ پر پنجاب کا مشہور ڈانس کیا جاتا ہے۔ جسے بھنگڑا کہتے ہیں۔ یہ ڈھول کے آگے مختلف دوست مل کر ناچتے ہیں۔

بیزتی (بے عزتی)(۹۹)

مجموعہ (ہنسنا رونا منع ہے)، ۱۹۱

دیہاتی سماج میں یہ لفظ بھی بولنے میں آتا ہے۔ دیہاتوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں۔ بیزتی کے بدلے لیے جاتے ہیں۔ کسی کو برا بھلا کہنا یا تحقیر آمیز لہجے میں مخاطب کرنے کو "بے عزتی" کرنا کہا جاتا ہے۔ اردو کے اس لفظ کو پنجابی میں تخفیفاً "بیزتی" کرنا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پاپی پیٹ (پاپ / گناہ کرانے والا پیٹ، گناہ گار، اپرادھی، جس کے لیے اپرادھ کیا جائے)(۱۰۰)

شر۔ گوشیاں ۸۲

انسان پیٹ کی بھوک کو مٹانے کے لیے ہر جائز و ناجائز کام کرتا ہے۔ اس وقت یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاپی پیٹ کے لیے سب کچھ کیا جا رہا ہے۔

پترو (پتر، سپتر، کپتر، بیٹا)(۱۰۱)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۵۷

پتر بیٹے کو کہا جاتا ہے سماجی اور ثقافتی حوالے سے اپنے سے کمزور پر اپنا رعب جمانے کے لیے پتر و کہہ کر بولا جاتا ہے۔ "پتر وایہ کر کے وکھا"

پتھلا مار کے (چوکڑی، آلتی پالتی، دھرنا مار کے بیٹھے رہنے کی حالت، نکما ہو کر بیٹھ رہنے کا فعل، اطمینان سے بیٹھ رہنا)(۱۰۲)

دلی دوراست، مشمولہ: سفر نامے، ص۶۷۵

پتھلا مار کر بیٹھنا پنجابی تہذیب و ثقافت کی پہچان ہے۔ جم کر بیٹھ جانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کے گھر جا کر کسی بات پر اصرار کرنے کو بھی پتھلا مار کر بیٹھ جانا کہا جاتا ہے۔

پٹکا ((مذ) پگڑی، دستار، صافہ، چھوٹی پگ)(۱۰۳)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص۹۲

پٹکا پگڑی نما ایک کپڑا ہوتا ہے جسے سر پر باندھا جاتا ہے پنجابی سماج میں پٹکے کو عزت اور شرف کیا ہمیت بھی حاصل ہے۔

پدھرا (صاف اور ایک جیسا ہموار، نہ اونچا نہ نیچا)(۱۰۴)

بارہ سنگھے ۷۰

اردو میں اس لفظ کا سیدھا یا ہموار کے معنوں میں برتا جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ راستہ سیدھا پدھرا ہے یعنی اس میں کوئی رکاوٹ، کھائیاں، یا پھر اونچ نیچ نہیں ہے۔ پنجابی سماج میں اس کو متنوع معنوں میں برتا جاتا ہے۔

پرنا (چھوٹا چوڑا کپڑا جو بطور تولیہ یا باندھ کر نہانے کے لیے استعمال ہو، کندھوں پر رکھنے والا صافہ)(۱۰۵)

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص۲۱۹

پنجابی میں پرنا ایسے چھوٹے کپڑے کو کہتے ہیں جو سر پر رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ پنجابی ثقافت میں اس کی اپنی خاص اہمیت ہے۔ خاص طور پر گرمی کے موسم میں پرنے کا استعمال عام ہوتا ہے۔

پرنے (چھوٹا چوڑا کپڑا جو بطور تولیہ۔ کندھے پر رکھنے والا صافہ)(۱۰۶)

شر۔ گوشیاں ۹۵

پنجابی سماج میں پرنا ایک تہذیبی و ثقافتی پس منظر رکھتا ہے اور تقریباً ہر پنجابی اپنے کندھوں پر صافہ نما کپڑا رکھتا جسے پنجابی میں " پرنا " کہتے ہیں۔ پرنا ایک اور معانی میں بھی استعمال ہوتا ہے یعنی "شادی ہو جانا" وغیرہ

پسینو پسینی (پسینہ سے شرابور، بہت زیادہ گھبرانا، شرمندہ ہونا)(۱۰۷)

گوروں کے دیس میں، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۸۴

بہت زیادہ مشقت کرنے کے بعد جب کوئی شخص پسینے سے شرابور ہو جاتا ہے تو اس کے لیے "پسینو پسینی" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ سماجی سطح پر سخت محنت اور مشقت کی حالت کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

پوتڑے (بچوں کے زیر ناف باندھنے والا کپڑا، نہالچہ، بچوں کے چوتڑوں کے نیچے رکھنے والا کپڑا تاکہ پیشاب سے بستر خراب نہ ہو، ننھی چادر، نیپ کن، ننھے بچے کے لپیٹنے کا کپڑا)(۱۰۸)

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۴۶

پنجاب کے دیہاتوں میں اس لفظ کا استعمال بہت زیادہ ہے۔ نوزائیدہ بچوں کو" نیکر "یا" کاچھا " نما کپڑے کو پوتڑا کہتے ہیں۔ اس کا ایک سماجی و ثقافت پس منظر بھی ہے کئی کہاوتوں میں بھی اس کا استعمال ملتا ہے۔ مثال کے طور پر "پوتڑیاں دے وگڑے نہیں سور دے"

پھاڑی (پھاڑنا سے۔ پاڑ۔ کسی چیز کا پاڑ کر کیا ہوا ٹکڑا۔ پھاڑی)(۱۰۹)

ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۲۶۲

مالٹے کی پھاڑی ہوتی ہے جسے اردو میں قاش کہتے ہیں۔ دیہاتی علاقوں میں مالٹے کی قاش کو پھاڑی بھی کہتے ہیں۔

پھڈا (نفاق جھگڑا)(۱۱۰)

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۷۲

خاص پنجابی لفظ پنجابی سماج و ثقافت میں عام مستعمل ہے۔ پنجابی سماج میں کسی بھی تھوڑے بہت جھگڑے کے لیے کہا جاتا ہے کہ " پھڈا پئے گیا اے۔"

پھڑک (پھڑکنا سے، پھڑکنے کی حالت)(۱۱۱)

آپ بھی شرمسار ہو ۴۷

پنجاب میں یہ لفظ اکثر بولنے میں آتا ہے۔ سماجی حیثیت سے اس کے اپنے معانی ہیں۔ کسی کی بات سن کر کسی کا شعر سن کر پھڑک جانا۔ یعنی مرنا، جسم لرزا بر اندام ہو جانا وغیرہ

پھنے خان (اپنے کو دوسروں سے بڑا سمجھنے والا، گھمنڈی، آکڑ باز، زبردستی بنا ہوا معتبر)(۱۱۲)

بارہ سنگھے ۱۰۸

پنجابی تہذیب و ثقافت میں پھنے خان کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے جس کو چودھرہٹ کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کہے میں نے فلاں کام بھی کروایا، فلاں کام بھی میری وجہ سے ہوا اس موقع پر کہا جاتا ہے کہ وہ شخص ایسے ہی پھنے خان بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

پھیرے (لانواں (لینا)، ہندوؤں کی شادی کی رسم، چکر، پھیرا)(۱۱۳)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۳۷

اس لفظ کا بھی پنجابی ثقافت و سماج میں خاص منظر نامہ ہے۔ بیلنا پر بیلوں کے پھیرے۔ چارا کاٹنے والی مشین سے جڑے پھیرے۔ اس کے علاوہ ہندو سماج میں شادی کے وقت آگ کے گرد پھیرے خاص سماجی تناظر کے حامل ہیں۔

پھینٹی (مار پڑنا، کپڑے کی تھوڑی چوڑی، پٹی جو چپڑاسی، بہرے وغیرہ، پگڑی کے اوپر پہنتے ہیں، مارنا، کٹنا، مار پیٹ)(۱۱۴)

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۸۷

دیہاتی سماج میں یہ لفظ بہت زیادہ بولا جاتا ہے اکثر لڑائی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں وہاں کسی کو مارنے کو پھینٹی کہتے ہیں۔

پنگھوڑا (پینگھ، پگھوڑا، چھوٹی چارپائی، جھولا، بچہ کا جھولا، پگھوڑی، چھوٹا پنگھوڑا)(۱۱۵)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۰۰، ۱۰۶

مشرقی سماج میں پنگھوڑا خاص سماجی تناظر رکھتا ہے۔ یہ وہ جھولا ہوتا ہے جس میں بچپن میں بچے کو لٹایا جاتا ہے۔ پنجابی سماج میں "پنگھوڑے وچ پینا" سے مراد علم میں کم درجے کا ہونا بھی ہے۔

پیکے (والدین کا ٹبر یا گھر، باپ کا گھر)(۱۱۶)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۵۶

سماج کا ایک اہم عنصر پیکا (میکا) ہوتا ہے یہ شادی شدہ لڑکی کے گھر والوں کو کہا جاتا ہے۔ خاندانی نظام کا اہم عنصر ہے۔ پیکے میں لڑکی کے ماں باپ، بہن بھائی اور دیگر رشتہ دار شامل ہوتے ہیں۔

تھلے (نیچے، ہیٹھاں، نیچے)[۱۱۷]

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۳۱۵

یہ لفظ بھی دیہاتی علاقوں میں اردو لفظ "نیچے" کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ نشیبی جگہ کے لیے بھی "تھلے" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ پنجابی سماج میں گھر کے وسیع اور اونچے صحن کو "تھلا" کہا جاتا ہے اسی طرح کسی کی بات کو بے چوں وچرا ماننے والے کے لیے کہا جاتا ہے کہ فلاں، فلاں کے "تھلے" لگا ہوا ہے۔

تھڑے (تھڑھا، چبوترہ، بوجھ لادنے والا جانور)[۱۱۸]

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۶۷

پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں دکانوں اور مکانوں کے سامنے کچھ جگہ کو عام سطح سے اونچا کر دیا جاتا ہے۔ اسے تھڑا کہا جاتا ہے۔ یہ جگہ بیٹھنے کے ساتھ ساتھ بعض اوقات بہت سے مسائل کے حل میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے۔ لوگ یہاں بیٹھ کر مختلف مسائل کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔

ٹکے (حقیر، ٹکا کی جمع، دو پیسے کا سکہ، دو پیسے، معمولی رقم، بنگلہ دیش کا روپیہ)[۱۱۹]

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۹۱

بہت ہی حقیر شے کے لیے "ٹکے" کا لفظ بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً دو ٹکے کا آدمی ایسا شخص جس کی کوئی قدر قیمت نہ ہو۔ جب کہ بنگلہ دیش کی کرنسی کو بھی "ٹکہ یا ٹکے" بولا جاتا ہے۔

ٹوٹے (ٹوٹا کی جمع، گھاٹا، تھڑ، لوڑ، توڑا، خسارہ، نقصان، ٹکڑا، ٹوٹا ہوا)[۱۲۰]

آپ بھی شرمسار ہو ۵۹

کسی بھی چیز کے ٹکڑوں کو پنجاب زبان میں "ٹوٹے" ہی کہتے ہیں۔

ٹھرکی (عاشق مزاج، جس کا کوئی ٹھرک ہو، حرصی، بوالہوس)[۱۲۱]

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۸۹

ٹھر کی ایسے لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو عاشق مزاج ہوتے ہیں اور ہر وقت عورتوں کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ ان کا مقصد عورتوں کو اپنے دام میں پھنسا کر اپنی جنسی اور نفسیاتی تسکین حاصل کرنا ہوتا ہے۔

ٹیم چکنا (ٹائم، وقت، سمے، وقت پر پہنچنا)[۱۲۲]

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۲۰

ٹیم چکنا پنجابی کا لفظ کسی وقت کے مکمل ہو جانے کے بارے میں بولا جاتا ہے۔ پنجابی سماج میں اس کا استعمال بھی عام ہے۔ خاص طور پر ڈرئیور حضرات کا کہنا ہوتا ہے کہ میں نے نو(۹) بجے کا ٹیم چکنا ہے۔ یعنی نو(۹) بجے سواریاں گاڑی میں بیٹھا کر چلنا ہے۔

جاگ (جمن، دہی جمانے کی لاگ، چھاچھ وغیرہ)(۱۲۳)

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۱۶

دہی جمانے کے لیے دودھ میں جو لسی یا کسی اور چیز سے کھٹاس ملائی جاتی ہے اسے پنجابی میں جاگ کہتے ہیں۔

جپھا (دبا کر چھاتی سے لگانا، بغل گیر ہونا، دست و بغل ہونا، دونوں بازوؤں میں دبانے کا فعل)[۱۲۴]

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۴۷

جپھا ڈالنا پنجابی ثقافت کی عام روایت ہے۔ ملنے کے مواقع پر یا ویسے دوست احباب ایک دوسرے کو جپھا ڈال کر گلے لگا لیتے ہیں یہ محبت اور خلوص کی والہانہ عقیدت سمجھی جاتی ہے۔ دلوں کی کدورت اس سے ختم ہو جاتی ہے۔ دو ناراض دوستوں میں صلح کے بعد ان کی جپھی ڈلوائی جاتی ہے۔ کبڈی کے کھیل میں کھلاڑی ایک دوسرے کو جپھا ڈال کر اس کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جپھی (دبا کر چھاتی سے لگانا، بغل گیر ہونا، دست و بغل ہونا، دونوں بازوؤں میں دبانے کا فعل)[۱۲۵]

دلی دور است، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۳۷

جپھی ڈالنا پنجابی ثقافت کی عام روایت ہے۔ ملنے کے مواقع پر یا ویسے دوست احباب ایک دوسرے کو جپھی ڈال کر گلے لگا لیتے ہیں یہ محبت اور خلوص کی والہانہ عقیدت سمجھی جاتی ہے۔ دلدل کی کدورت اس سے ختم ہو جاتی ہے۔ دو ناراض دوستوں میں صلح کے بعد ان کی جپھی ڈلوائی جاتی ہے۔

جثے (جثہ کی جمع، جسم، سریر، تن، بدن، وجود)[۱۲۶]

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۲۵

دیہاتوں میں نوجوان اپنے جثے کا خیال رکھتے ہیں کبڈی، کشتی کے کھلاڑی اپنا جثہ بناتے ہیں اسی لیے یہ لفظ پنجابی کے سماج میں اکثر سننے میں آتا ہے۔

جنا (گھبرو، جوان، پُرش، شخص، جن، اُت پتی، پیدائش)(۱۲۷)

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۹۲

تنومند گھبرو، جوان کو پنجاب میں "جنا" بھی کہتے ہیں۔ یہ لفظ پنجابی سماج میں بہت عام ہے۔ طاقت اور قوت کے منبع کو "جنا" کہا جاتا ہے۔

جھانویں (مٹی کا کھردرا پکا یا ہوا روڑا، جس کو بدن پر گھسا کر میل اتاری جاتی ہے، کم عقل اور احمق)(۱۲۸)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۲۴۱

کم عقل شخص کے لیے جھانواں کا لفظ پنجابی سماج میں عام مستعمل ہے۔ اس لفظ کا کثرت سے سماجی سطح پر استعمال پر استعمال اس کی سماجی حیثیت کو دوچند کرتا ہے۔

چسکا (چسک، سواد، رس، لذت، چاٹ، مزہ، عادت، لت)(۱۲۹)

عطایئے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۳۶۲

پنجاب کے دیہاتوں میں یہ پنجابی لفظ عادت کے معنوں میں برتا جاتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی خاص عادت کو اپنا لے دیہاتوں میں نوجوانوں کو نشے کی لت پڑ جاتی ہے ایسی صورت میں کہا جاتا ہے کہ فلاں کو فلاں چیز کا "چسکا" پڑ گیا ہے۔

چوٹیاں (چوٹی کی جمع، سر کے گوندھے ہوئے بال، سر کی گندھی ہوئی میڈھی، سکھر، ٹیسی، سب سے اوپر کا حصہ، بودی، عورتوں کی گت، بچوں کے بڑے بال)(۱۳۰)

مجموعہ (بلبلے)، ۶۰

کسی بلند یا پہاڑ کو کہا جاتا ہے جسے کوہ پیما سر کرتے ہیں۔ قاسمی نے لاہوری عورتوں کے سر کے بالوں کو ایک خاص شکل میں باندھ کر سر کے اوپر جوڑا بنانے کے عمل کو چوٹی سے تشبیہ دی ہے۔ اور اس جوڑے کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر نوجوان لڑکوں کے جذبات جو ان لڑکیوں کے بارے میں ہوتے ہیں اور محبت کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں اسے چوٹیاں سر کرنا کہا ہے۔

چوسنیاں (بچوں کا نپل (ربڑ کا بنا ہوا دودھ پینے کے لیے جو کہ ربڑ کے تھن جیسا اندر سے نرم اور میٹھا س والا ہوتا ہے اور بچہ چوسنے میں مشغول رہتا ہے)[۱۳۱]

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص،۵۹

چوسنیاں پنجابی لفظ چوسنی کا جمع ہے۔ چوسنی بچوں کو عموماً ربڑ کا نپل منہ میں دے دیا جاتا ہے جسے بچے چوستے رہتے ہیں۔ پنجابی دیہاتوں میں گنے کی فصل بکثرت کاشت کی جاتی ہے۔ گنے کی گنڈیروں کو بھی چوسا جاتا ہے اسی طرح بچوں کو بہلانے کے لیے فیڈر دیئے جاتے ہیں اور وہ اسے چوستے رہتے ہیں اور اپنی بھوک اور پیاس کو بھلا بیٹھتے ہیں۔

چوکڑی (بیٹھنے کا انداز، چاروں پاؤں اٹھا کر لگائی ہرن وغیرہ کی چھال، چھلانگ اچھل کود)[۱۳۲]

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص،۵۶

پنجابی سماج و ثقافت میں چوکڑی مار کر بیٹھنا خاص سماجی تناظر رکھتا ہے۔ عام طور پر گاؤں کے سماجی منظر نامے میں چوکڑی مار کر بیٹھنے کا عمل اور اس لفظ کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کو پنجابی زبان میں چوکڑی کہتے ہیں۔ گوتم بدھ بھی چوکڑی مار کر بیٹھ گیا تھا پھر اسے نروان حاصل ہوا تھا۔ پنجاب کے اکثر بچے کھانے کے وقت والدہ کے پاس چوکڑی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

چوکڑی (چار چیزوں کا مجموعہ، چار آدمیوں کی ٹولی، چاروں پاؤں جوڑ کر لگائی چھلانگ، آلتی پالتی (بیٹھنے کا ڈھنگ) [۱۳۳]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۸۱

پنجابی سماج و ثقافت میں چوکڑی مار کر بیٹھنا خاص سماجی تناظر رکھتا ہے۔ عام طور پر گاؤں کے سماجی منظر نامے میں چوکڑی مار کر بیٹھنے کا عمل اور اس لفظ کا استعمال بہت زیادہ ہوتا ہے۔

چونڈا (نئی پھوٹی ہوئی گھاس جو جانوروں کے چونڈنے لائق ہو)[۱۳۴]

شر۔ گوشیاں ۸۲

چونڈا کثیر المعانی لفظ ہے جو پنجاب میں استعمال ہوتا ہے یہ لفظ سماجی، تہذیبی و ثقافتی پس منظر رکھتا ہے۔ سر کے اوپر والے بالوں کا جوڑا بھی ہے اور کچے کنوائیں کو بھی کہتے ہیں جس کا پانی نزدیک ہو۔

چوکھا (بہت زیادہ، بہت بہتیرا، اچھا، صاف، ستھرا، اصلی خالص، اصل، مقدار سے زیادہ) [۱۳۵]

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۲۷

پنجاب کے سماج میں یہ لفظ اکثر بولنے میں آتا ہے بہت زیادہ کے معانی میں " چوکھا" بولا جاتا ہے۔جب کسی بھی چیز کی مقدار بڑھ جائے تو پنجابی میں اسے " چوکھا" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔اس ضمن میں مختلف چیزیں اور اشخاص یکساں طور پر شامل ہیں۔

چھڑے (ان ویاہیا، ناکتخدا، کنوارا، جس کا ساتھی کوئی ٹبر نہ ہو، اکیلا)(۱۳۶)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۱۱

" چھڑے" ان مردوں کے لیے بولا جاتا ہے جو غیر شادی شدہ ہوں۔ایسے لوگ سماج میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور بہت سی کہاوتوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔مثال کے طور پر" رَناں والے دے پکن پروٹھے تے چھڑیاں دی اگ نہ بلے" وغیرہ

دوٹکیاں (ٹکا کی جمع، دو پیسے کا سکہ، دو پیسے، معمولی رقم، بنگلہ دیش کا روپیہ)(۱۳۷)

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۲۸

ہمارے دیہاتوں میں یہ لفظ اکثر بولنے میں آتا ہے ایک معروف گیت کے بول میں بھی اسے برتا گیا ہے:

"تیری دوٹکیاں دی نوکری وے میرا لاکھوں کا ساون جائے"

دوندا (دو دانتوں والا مویشی)(۱۳۸)

آپ بھی شرمسار ہو ۲۶۸

عید قربان پر اکثر لوگ منڈی میں جا کر بکرے خریدتے ہیں سب سے پہلا ایک ہی سوال کیا جاتا ہے کہ کیا یہ دوندا ہے۔یعنی قربانی کے لائق ہے؟ پنجاب میں یہ لفظ اکثر بولا اور سمجھا جاتا ہے

دھڑلے (طاقت کے بل پر۔زبردستی، رعب، بے دھڑک، بے خوف، بے خطر)(۱۳۹)

بارہ سنگھے ۴۷

یہ لفظ پنجابی زبان میں طاقت ، قوت ، زور اور گھمنڈ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ چودھری صاحب نے بڑے دھڑلے سے کسی کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے ۔ پنجابی سماج میں یہ لفظ بھی متنوع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔سب کے سامنے سچی بات کہہ دینے پر کہا جاتا ہے کہ اس نے سچی بات بڑے دھڑلے سے کہہ دی ہے۔

دھوتی (ہندوؤں کے نیچے باندھنے والا ایک کپڑا۔ پانچ گز سے لے کر چھ گز تک لمبی ہوتی ہے۔ یہ عام طور پر مرد باندھتے ہیں جو کہ سوا گز چوڑا ہوتا ہے۔)(۱۴۰)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۴۲

دھوتی پنجابی لباس میں خاص اہمیت رکھتی ہے اس کے ساتھ پنجابی ثقافت جڑی ہے۔ دھوتی پنجاب کا مخصوص لباس ہے۔ دھوتی کے ساتھ کھلا کُرتا لباس کی تکمیل کرتا ہے۔ دھوتی کی بھی کئی اقسام ہیں اور یہ ساری کی ساری پنجاب کے ساتھ وابستہ ہیں۔

دھوتی (ہندوؤں کے نیچے باندھنے والا ایک کپڑا۔ پانچ گز سے لے کر چھ گز تک لمبی ہوتی ہے۔ یہ عام طور پر مرد باندھتے ہیں جو کہ سوا گز چوڑا ہوتا ہے۔)(۱۴۱)

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۴۰

دھوتی پنجابی لباس میں خاص اہمیت رکھتی ہے اس کے ساتھ پنجابی ثقافت جڑی ہے۔ دھوتی پنجاب کا مخصوص لباس ہے۔ دھوتی کے ساتھ کھلا کُرتا لباس کی تکمیل کرتا ہے۔ دھوتی کی بھی کئی اقسام ہیں اور یہ ساری کی ساری پنجاب کے ساتھ وابستہ ہیں۔

ڈانگوں (بانس کی سوٹی، ونجھ، لاٹھی، لمبی پتلی چھڑی)(۱۴۲)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۵۳

ڈانگ ایسی لمبی چھڑی کو کہتے ہیں جو حفاظت کے لیے رکھی جاتی ہے۔ یہ بانس کی ہوتی ہے۔ سماجی حوالے سے اس سے بھی کئی کہاوتیں جڑی ہوئی ہیں مثلاً "چوراں دے تھان تے ڈانگاں دے گز"

ڈکی (روکی ہوئی۔ بند کی ہوئی، کسی چیز کا دانتوں سے کاٹا ہوا ٹکڑا، رکاوٹیں، بندشیں)(۱۴۳)

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۹۴

کسی چیز کو کسی ڈربے، دکان، مکان یا کسی بھی ڈبے وغیرہ میں بند کر دیا جائے تو پنجابی میں اسے ڈکی ہوئی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر وہ چیز جس کو کسی بھی حوالے سے روک دیا جائے تو اس کے لیے بھی مذکورہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ راستہ بند کر دینا، فصلوں کا پانی روک دینا یا ٹریفک کو روک دینا ان سب کے لیے پنجابی زبان میں "ڈکی" کا لفظ مستعمل ہے

ڈھانگا (کیکر کی پھلیاں وغیرہ جھاڑنے والا لمبا بانس، کھونڈی والی لوہے کی خم دار شکل لگی ہوئی، لمبا بانس جس کے سرے پر داتری لگی ہوئی ہے۔)(۱۴۴)

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص،۵۴

پنجاب کے دیہاتوں میں مال مویشی رکھنے والے افراد کے پاس اکثر ڈھانگا ہوتا ہے جو بکریوں وغیرہ کو ڈھانگے کی مدد سے کیکر کے پتے وغیرہ اتار کر ان کو بطور چارا دیتے ہیں۔ ایک لمبا بانس جس کے سرے پر خمدار قسم کی کھونڈی لوہے کی درانتی لگی ہوتی ہے۔

ڈکار (معدہ کی ہوا آواز کے ساتھ منہ سے نکالنا، بکھیڑا، جھگڑا، لڑائی، گرج بول، پرایا مال ہضم کرنا، نگل جانا)[۱۴۵]

شر۔ گوشیاں ۱۶

پنجابی سماج میں یہ لفظ بہت زیادہ استعمال ہوتا ہے اور کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ معدہ کی ہوا آواز کے ساتھ منہ سے نکالنے کو بھی ڈکار کہتے ہیں۔ جب کہ "ڈکار جانا" ہضم ہو جانا، پرایا مال ہضم کر جانے کو بھی کہتے ہیں۔

ڈیک (ایک ہی سانس سے نگلنا، ایک ہی سانس میں پی جانے کا فعل)[۱۴۶]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص۱۹۳

ڈِیک لگا کر پینا، پنجابی سماجی و ثقافتی منظر نامے میں اس حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

رن مریدی (بیوی کی باتیں ماننا، عورت، بیوی، پتنی کی تابعداری کرنے والا)[۱۴۷]

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص۳۱۵

دیہاتی علاقوں میں ایسے مرد کے یہ لفظ بولا جاتا ہے جو اپنی بیگم کی باتوں کو سر آنکھوں پر رکھے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانے والے کو رن مرید کہا جاتا ہے۔

ستے ای خیر اں (ہر طرح سے خیریت)[۱۴۸]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۳۴

یہ دعائیہ الفاظ پنجابی سماج میں عام مستعمل ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے کسی کو دعا دی جاتی ہے اس کے علاوہ سماجی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ الفاظ امید کے معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں.

سرمچو (آنکھوں میں سرمہ لگانے والی سلائی)[۱۴۹]

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص۹۷

سرمچو سرمہ دانی کا وہ حصہ ہوتا ہے جو ایک تنکا نما ہوتا ہے اور سرمہ دانی کے اندر رہوتا ہے۔ اس سے سرمہ آنکھوں میں ڈالا جاتا ہے۔پنجابی ثقافت میں سرمے کا استعمال بہت عام ہے۔ عام حالات میں بالعموم اور شادی بیاہ، عیدوں اور تہواروں پر اچھے لباس کے ساتھ ساتھ سرمہ ڈالنے کو خوشی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ پنجاب میں اکثریت کے اہل اسلام ہونے کی بنا پر اسے سنت رسول ﷺ سمجھ کر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

سوٹے (ڈنڈے، لاٹھی، لٹھ)(۱۵۰)

گوروں کے دیس میں، مشمولہ: سفر نامے، ص۷ ۴۳

سوٹا بھی پنجابی ڈانگ کے متبادل ہے۔ بانس یا کسی بھی درخت کا لمبا سا ڈنڈا سوٹا کہلاتا ہے۔ دیہاتی سطح پر اس کا استعمال متنوع ہے۔ کپڑے دھونے کے بھی "سوٹا" استعمال ہوتا ہے جب کہ لڑنے جھگڑنے اور دوسرے فریق پر حملہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

سیانوں (عقل مند، دانش مند، دانا، ہوشیار، چوکس، چتر، چالاک)(۱۵۱)

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص، ۶۲

پنجاب کے اکثر علاقوں میں عقل مندوں کے لیے سیانے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بہت زیادہ عقل مند ہوتے ہیں اور لوگ ان کے مشوروں کو اہمیت دیتے ہیں۔

شریک (بمعنی حصہ دار، دشمن، ساتھی، رشتہ دار، ورثا، کڑم)(۱۵۲)

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص، ۴۸

یہ لفظ اپنی ثقافتی و سماجی روایات کے ساتھ بہت مقبول ہے۔ دشمنوں کو بھی شریک کہا جاتا ہے۔ شریک عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معانی حصہ دار اور ساجھی ہے۔ پنجابی میں بھی یہ لفظ بکثرت استعمال ہوتا ہے۔ اس کے اصطلاحی معانی "دشمن" لیے جاتے ہیں۔ اسی طرح معاشرتی طور پر ہم پلہ رشتہ داروں کو بھی شریک کہا جاتا ہے۔

شوشا (جھوٹی بات، چٹکلا، نئی شرارت، چھیڑ خانی، فساد والی بات، چھوٹی سی نوک)(۱۵۳)

شر۔ گوشیاں ۱۰۴

شوشا چھوڑنا بھی کہا جاتا ہے۔ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو جھوٹی باتیں کر کے فساد کرواتا ہو۔

کائیاں (جو بڑا سیانا، ہوشیار، اور تجربہ کار ہو، اور کانپ نہ کھائے)[۱۵۴]

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص، ۸۷

یہ لفظ ایسے لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جو عقل مند ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی چالاک بھی ہوتے ہیں اور اپنے کام نکلوانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ مختلف علاقوں میں آتے جاتے رہتے ہیں جس کی بنیاد پر وہ لوگوں کی طرز بود و باش، ذہنی رجحانات، طبعی میلانات اور انداز فکر و نظر سے بخوبی واقفیت رکھتے ہیں۔ پنجابی سماج میں ایسے افراد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

کُب (ٹیڑھ پن، خم، جھکاؤ، کبڑا پن، کجی)[۱۵۵]

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص ۲۸۱

کُب کا پنجابی لفظ کمر خمیدہ ہو جانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عموماً سماجی حوالے سے یہ بزرگی کی علامت میں سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سماج میں سے بھی بہت سی کہاوتیں اور ضرب الامثال جڑی ہوئی ہیں۔ کسی کا کام حادثاتی طور پر مکمل ہونے پر کہا جاتا ہے کہ " کُبے والی لگ گئی اے"

کج نہ پھول (کچھ نہ پوچھیں)[۱۵۶]

شر۔ گوشیاں ۱۶۰، ۱۶۱

اس بات کو دبا ہی رہنے یعنی " کج نہ پھول " کہا جاتا ہے۔ کسی کے پوچھنے پر اسے چپ کراتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ اس بات کو راز ہی رہنے دو۔

کدوں آئے او (کس وقت، کب، کد، کون سے وقت آئے ہو)[۱۵۷]

شر۔ گوشیاں ۴۱

پنجابی زبان کا یہ لفظ " کدوں آئے او " عام طور پر آنے والے شخص سے پوچھا جاتا ہے کہ کس وقت آئے ہو عزت واحترام سے پوچھا جانے والا یہ لفظ سماجی و ثقافتی پس منظر رکھتا ہے۔

کدی (کسی وقت، کسی موقعہ، کدے، بہت دیر بعد)[۱۵۸]

تجاہل کالمانہ ۴۱

سماج میں اس لفظ کئی معنی ہیں۔ کبھی کے معنوں میں استعمال ہونے والا لفظ بہت زیادہ بولا اور سمجھا جاتا ہے۔

کڑیو (کنیا، لڑکی، چھوکری، پُتری، کالی، دھی، وہ لڑکی جس کی شادی نہ ہوئی)[۱۵۹]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۲۶۴

لڑکی کے لیے پنجابی میں "کڑی" کا لفظ بولا جاتا ہے اور زیادہ لڑکیوں کو مخاطب کرنے کے لیے "کڑیو" کہا جاتا ہے کڑی سے پنجابی سماج و ثقافت بہت سے امور جڑے ہیں۔ عزت و ناموس تک کے اور کڑی سے میل کھاتے ہیں۔

کڑ کڑ شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۸۲

(مرغی کا انڈا دینے کے وقت یا انڈوں پر بیٹھتے وقت کڑ کڑ کی آواز دینا)[۱۶۰]

کڑ کڑ پنجابی سماج کا ایک عام لفظ ہے، اس لفظ سے اور بھی بہت سی سماجی کہاوتیں جڑی ہوئی ہیں مثال کے طور پر:

کڑ کڑ کدائیں تے انڈے کدائیں وغیرہ

کڑچھا (لوہے یا پیتل کا برتن جو آگے سے کٹوری نما ہوتا ہے اور پیچھے ڈنڈی ہوتی ہے، چمچہ)[۱۶۱]

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۸۸

کڑچھا پنجابی میں کف گیر کو کہا جاتا ہے۔ یوں تو یہ ایک برتن یا آلے کا نام ہے۔ لیکن سماج میں یہ لفظ اپنا خاص منظر نامہ رکھتا ہے۔ سماجی سطح پر ہر ایسا شخص کڑچھا کہلاتا ہے جو کسی کا خوشامدی یا چیلہ ہو اور اپنی صلاحیتوں کی بجائے اس کی ہاں میں ہاں ملانے والا ہو۔

کَکھ نہ رہوے (برباد ہو جانا، سب کچھ لٹ پٹ جانا، جو کچھ پلے ہو وہ کھو یا جانا، ایک گالی)[۱۶۲]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۸۳

بد دعا کا یہ لفظ پنجابی سماج میں خوب بولا جاتا ہے۔ اس کا مفہوم ایسی بد دعا دینا ہے کہ دوسرے شخص کے پاس کچھ نہ رہے۔ تباہ حال ہو جائے۔ آنے آنے کا محتاج ہو جائے۔ بد دعا کے اس لفظ کا دائرہ کار نہایت وسیع ہے۔

کنڈا (کنڈ، پیٹھ، وزن ماپنے کا آلہ)[۱۶۳]

شر۔ گوشیاں ۱۰

پنجابی سماج میں یہ لفظ کثیر المعانی ہے یہ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ایک معانی کنوئیں میں سے گری ہوئی چیز نکالنے کے آلہ کو بھی کنڈا کہتے ہیں۔ وزن ماپنے کا مشینی ترازو ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا وزن ماپا جاتا ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کے لیے کنڈیا کنڈا بھی استعمال ہوتا ہے۔

کنّی (پوادھی، کانوں کو، کانوں میں، کانوں کے اندر، کانوں کے راستے، کنی، کنارا)(۱۶۴)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۳۴

کنی کنارے کو کہتے ہیں پنجابی سماج کی اہم پہچان دوپٹہ ہے اور دوپٹے کے کنارے کو کنی بولا جاتا ہے۔ اس لفظ کی سماجی اہمیتیوں بھی واضح ہوتی ہے کہ اس سے کئی کہاوتیں منسوب ہیں "کنی کترانا" یا پھر "کنی دینا" وغیرہ

کھرک (کھاج، جھور، خراش)(۱۶۵)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۷۴، ۱۷۹، ۲۰۷

کھرک کے حوالے سے پنجابی سماج میں بہت سی حکایات بھی مستعمل ہےں۔ مثلاً "پیراں وچ کھرک ہونا" سے مراد سفر پر نکلنا لیا جاتا ہے اس طرح اس کا سماجی منظر نامہ خاص وسیع ہے۔

کھڑکاتے (دستک دینا، کھٹکٹایا، کنڈی ہلانا، کھڑکھڑاتے، چیزوں کو ٹکرانے کی آواز)(۱۶۶)

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۵۵

کسی چیز کو ضرب لگا کر آواز نکالنے کو پنجابی میں "کھڑکانا" کہا جاتا ہے۔ اسی طرح دروازے پر دستک دینا کھٹکھٹانا کے الفاظ بھی اسی معانی میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ پنجابی سماج میں پانی کے گھڑوں کو کھٹکھٹا کر جائزہ لیا جاتا ہے کہ گھڑا پختہ ہے یا کچا ہے۔ اسی طرح خربوزے کو بھی کھٹکھٹا کر اس کے پختہ یا خام ہونے کو جانچا جاتا ہے۔

کھنگورا (حلق میں سے اٹھی ہوئی کھانسی جیسی آواز۔ گلے کی اونچی آواز جو بلغم صاف کرنے کے لیے نکالتے ہیں۔ ایک مرتبہ کھانسانا)(۱۶۷)

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۴۱

پنجاب کے دیہاتوں میں اکثر مرد گھروں میں داخل ہوتے ہوئے "کھنگورا" مارتے ہیں جس کا مطلب ہوتا ہے کہ گھر میں کوئی پردہ کرنا چاہے تو کر لے۔

کھیس (ایک طرح کا اوپر اوڑھنے والا یا نیچے بچھانے والا سوتی موٹا کپڑا)[۱۶۸]
عطایئے، مشمولہ: مجموعہ، ص۳۳۸
ہمارے پنجاب کے دیہاتوں میں کھیس وغیرہ کا استعمال بہت عام ہے۔ چارپائی کے پائنتی کی طرف کھیس تہہ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔

گاٹیاں (گیٹی، گول ٹھیکری یا روڑا جس سے بچے کھیلتے ہیں، پتنگ کی ڈور کو کسی روڑے کے ساتھ باندھ کر لوٹنا)[۱۶۹]
بارہ سنگھے ۱۸۸
پنجابی سماج کا یہ لفظ "گاٹیاں" گاٹی کی جمع ہے۔ پتنگ کی گاٹیاں ڈالنا ہے۔ وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

گچی (گردن کے سامنے والا حصہ، گلا، گردن)[۱۷۰]
آپ بھی شرمسار ہو ۲۱۶
پنجابی زبان میں گردن کو گچی کہتے ہیں۔ سر اور دھڑ کے درمیانی اگلے حصے کو اردو گلا اور گردن جب کہ پنجابی میں "گچی" کہا جاتا ہے۔ پنجاب کے باسی اپنی مادری زبان میں اسے عمومی طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں۔

گلمے (گلا، قمیص، کُرتے کا گلا، مویشیوں کی گردن کے نیچے لٹکتی گوشت کی جھالر)[۱۷۱]
شر۔ گوشیاں ۱۷۴
پنجابی زبان میں گلمے کا لفظ بہت زیادہ استعمال ہونے والا ہے۔ اس کے مترادف اردو "گریباں" ہے۔

گورے (جس کا رنگ سفید ہو۔ سفید اور گورے رنگ والا، انگریز خصوصاً چھوٹا رتبے کا فرنگی سپاہی)[۱۷۲]
دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص۲۹۵
گورے کے لفظی معنی تو سفید رنگ کے ہیں لیکن پنجابی سماج میں اس لفظ کا خاص تاریخی و سماجی تناظر ہے کہ یہ لفظ انگریزوں سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ آج بھی سماج میں انگریزوں کے لیے "گورے" بولا جاتا ہے جو ان کی سفید رنگت کی وجہ سے ان کی خاص پہچان بن گیا ہے۔

گوڑھی (گوڑھا سے، گہرا گھنا رنگ، زیادہ، تیز، گاڑھا شوخ، دوستی میں مضبوط)[۱۷۳]

گوروں کے دیس میں، مشمولہ: سفر نامے، ص ۲۵۴

پنجابی سماج میں لفظ گوڑھی عام استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ گہری کے معنوں میں ہے۔ عام طور پر اس لفظ کا استعمال گہری دوسری کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ سماجی اور ثقافتی حوالے سے "گوڑھییاری" پنجابی سماج میں اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ جان تو چلی جاتی ہے لیکن یہ گوڑییاری قائم رہتی ہے۔

لارا (جھوٹا اقرار، جھوٹا وعدہ، جھوٹی تسلی)(۱۷۴)

عطایئے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۳۶۳

جھوٹا وعدہ کو پنجابی زبان میں "لارا" کہتے ہیں۔ پنجاب کے دیہاتوں میں یہ لفظ بہت عام ہے اور بولا اور سمجھا جاتا ہے۔ ایک مشہور گیت میں بھی اس کی گونج کچھ یوں ملتی ہے۔ "کوئی لارالا کے سانوں رول جا جھوٹیاوے اک جھوٹ ہور بول جا"۔ پنجابی سماج میں ایسے الفاظ عمومی طور پر محبوب کی بے اعتنائی کے اظہار کے لیے بولے جاتے ہیں۔

لانگڑیاں (دولتیاں مارنا۔ لانگڑی کی جمع۔ باورچی، نوکر جو کہ خیرات خانہ میں کھانا پکائے، لنگر تیار کرنے والا)(۱۷۵)

ہنسارونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۶۰

پنجاب کے اکثر دیہاتوں میں لانگڑیاں مارنا بولا جاتا ہے جس کے معانی دولتیاں مارنا کے ہیں۔ ٹھڈے کی طرح ٹانگیں اٹھا کر مارنے کو بھی لانگڑیاں کہتے ہیں۔

لاہوریئے (لہوری، لہوریا۔ لاہور کے رہنے والے، لاہور سے تعلق)(۱۷۶)

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۳۸۔ بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۵۸

لاہور کے رہنے والے کو لاہوریا کہا جاتا ہے گزشتہ چند سالوں سے لاہور والوں کی مخصوص سماجی و ثقافتی عادات کی وجہ سے لاہوریا لفظ اب اپنی سماجی مقام بنا چکا ہے۔ اب یہ لفظ لاہوریا، لاہور کے سماج اور ثقافت کا اظہاریہ بن چکا ہے۔

لڈیاں (لڈی کی جمع، نچنا ٹپنا، رقص، دھمال، لڑکے یا لڑکیوں کا ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یا محض گھیرا بنا کر گت کے اوپر ناچنا اور بولیاں گانا)(۱۷۷)

ہنسارونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۱۹

رقص کی ایک خاص قسم جو پنجاب میں خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں بہت مقبول ہے۔ جو اکثر اوقات خوشی کی تقریبات میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر دلہے کے قریبی رشتہ دار خوشی کے اظہار کی خاطر اس رقص میں شریک ہو کر شادی کی رونقیں بڑھاتے ہیں۔

لسی (چھ چھ، پکی لسی، دہی کو رڑک (بلو) کر پانی ڈالا ہوا اور خصوصاً مکھن نکالا ہوا)(۱۷۸)

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص، ۴۲

پنجاب کے دیہاتوں میں لسی کا بڑا رواج ہے۔ دوپہر کے کھانے میں لسی نہ ہو تو کھانا ادھورا سمجھا جاتا ہے۔ دہی کو رڑکنے سے مکھن اوپر آجاتا ہے اور نیچے بچنے والی چیز لسی ہی ہوتی ہے۔

لولے (ٹانگوں سے بیکار، لنگڑے، جس کا ایک عضو ٹانگ نہ ہو، لنجا، لنگ)(۱۷۹)

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص۱۱۸

پنجاب میں کاہل، سست، اور ٹانگوں سے بے کار شخص کے لیے "لولے" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جو لوگ کام سے جی چراتے ہیں یا پھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں انہیں پنجابی میں تنبیہ واستہزا "لولے لنگڑے" کہا جاتا ہے۔

لیپا پوتی (کری کرائی پر پانی پھیرنا۔ مکان کو گیلی مٹی سے لیپنا پوتنا، لیپنے کا فعل، لیپ، پوچا)(۱۸۰)

شر۔ گوشیاں۱۹

یہ لفظ تہذیب وثقافت کو نمایاں کرنے میں استعمال ہوتا ہے جو کچے مکانوں کی سفیدی اور مٹی سے لیپا کرنے کو کہتے ہیں جہاں کوئی لیپا پوتی ہو وہاں کہا جاتا ہے کہ کوئی شادی بیاہ کی تقریب نزدیک ہے۔ ویسے پنجاب کے لوگ گھر کو لیپا پوتی کر کے اسے خوبصورت بنانے کیکوشش کرتے ہیں۔ بعض لوگ بیل بوٹے بھی بناتے ہیں۔

مخولیا (مخول، ٹھٹھا کرنے والا، ہنسی مذاق کرنے والا، تمسخر کرنے والا)(۱۸۱)

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۳۲

دوسروں کو ہنسانے والا یہ شخص مخولیا کہلاتا ہے۔ پنجاب کے دیہاتوں میں ایسے کئی شخص موجود ہیں خاص طور پر مراسی جن کا کام ہی دوسروں کو ہنسانا ہوتا ہے۔

مسیت (مسجد، مسلمانوں کے نماز پڑھنے والا گھر)(۱۸۲)

شر۔ گوشیاں ۱۸۵

پنجاب میں عام طور پر مسجد کو مسیت ہی کہتے ہیں۔ دیہاتوں میں اور شہروں میں بسنے والے پنجابی لوگ مسجد مسلمانوں کی عبادت کو "مسیت" کہتے ہیں۔

مشہوریاں (مشہوری کی جمع، شہرت، تشہیر، مشہور ہونے کی گُن)(۱۸۳)

آپ بھی شرمسار ہو ۲۱۹

پنجاب میں یہ لفظ اکثر بولا جاتا ہے جس سے مراد شہرت اور مشہوریاں ہے۔ جان پہچان اور تعارف بڑھ جائے تو اس پر شہرت کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ شہرت کے لیے پنجاب زبان میں مشہور یا مشہوریاں کا لفظ عموماً استعمال ہوتا ہے۔

مصلی (ایک قوم، موصلی، مصلی، (مذکر)، موچرس)(۱۸۴)

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۳۵

مصلی ایک اہم قوم ہے عام طور پر یہ نچلے طبقے کے لوگ ہوتے ہیں جو بھٹوں پر مزدوری کر کے گزر بسر کرتے ہیں اس قوم کی اپنی مخصوص سماجی روایات اور ثقافت ہوتی ہے جو ان کے شادی بیاہ پر بھی واضح نظر آتی ہے۔

مصلنیں (مصلن کی جمع، مسلن (مونث)، مصلی (مذکر)، مسلی)(۱۸۵)

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۳۵، گوروں کے دیس میں ۵۱۸،

مصلی کی مونث۔ واحد "مصلن" بنتا ہے۔ تمام سماجی اور ثقافتی روایات میں مصلی کی ہم پلہ ہوتی ہیں۔ کئی محاورے اور آکھان بھی اس حوالے مشہور ہیں مثلاً "چوڑھیوں مصلی کیتا، آکڑ اُہو دی اُہو"

مکھ (ہڈی کی میخیا گودا، مغز، بھیجا)(۱۸۶)

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۱۷

پنجاب کی سرزمین پہلوانوں کی سرزمین ہے، مکھ پہلوانوں کی اہم خوراک ہے۔ سماج میں مکھ کھانے سے مراد اچھی خوراک کھانا بھی لیا جاتا ہے۔ اور پہلوانی کے حوالے سے بھی یہ لفظ خاص ثقافتی تناظر رکھتا ہے۔

مکھڑے (مکھ، منہ، چہرہ، پیار کا لفظ)(۱۸۷)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۸۲

مکھڑا پنجابی میں چہرے کو کہا جاتا ہے۔ پنجابی سماج میں اس لفظ کا استعمال عام ہے۔ اور بہت سی سماجی امور بھی اس سے جڑے ہوئے ہیں اس کے علاوہ مکھڑ چن ور گا اور دیگر پریمی بول بھی اس کی سماجی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

مٹھ (قرضہ یا معاملہ کی قسط، (استعاراً)، سہاگا)[۱۸۸]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۳۴

مٹھ کا خاص سماجی اور ثقافتی منظر نامہ ہے۔ مٹھ سے بہت سی کہاوتیں جڑی ہیں۔ پنجابی کہاوت میں " مٹھ رکھنا" مشہور ہے۔

مٹھی چاپی (رشوت وڈھی دینا، مٹھ کھولنا، خرچ کرنا)[۱۸۹]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۷۵

رشوت ستانی کے لیے مستعمل یہ لفظ اپنا وسیع سماجی منظر نامہ رکھتا ہے۔ پنجابی سماج میں رشوت عام ہونے کی وجہ سے اس لفظ کا استعمال بھی عام ہے۔

منکا ٹوٹے (پیٹھ کی ہڈی کا اوپر کا حصہ، ریڑھ کی ہڈی کا وہ حصہ جو گردن کا ہو، گردن کے مہرے کا ٹوٹنا)[۱۹۰]

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۸۱

منکا پنجابی میں گردن کو کہتے ہیں۔ پنجابی سماج میں یہ لفظ بد دعا کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ منکا ٹوٹے کی بد دعا بھی پنجابی سماج میں ملتی ہے۔

مختلف پنجابی مقابلوں میں لسی، دودھ یا گھی کو ایک ہی سانس میں پیا جاتا تھا اسے ڈیک لگانا کہتے ہیں۔

مینوں لے چل بابلا

(تصغیر بابا سے، باپ، والد، اے باپ، اے بابلا مجھے لے چلے، سسرال جاتے وقت)[۱۹۱]

دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ: سفر نامے، ص ۳۴۲

یہ پنجابی لفظ خاص طور پر بیٹی کی شادی کے موقع پر لڑکی کی طرف سے ایک ایسا دکھ بھرا گیت ہوتا ہے جو اپنے والد سے فریاد کر رہی ہوتی ہے کہ مجھے اب غیر لوگ بیاہ کر لے جا رہے ہیں مجھے روک لیا جائے۔ یہ ہیر رانجھا کے قصہ میں وارث شاہ نے بھی لکھا تھا اور یہ اسی کے مصرعے کا حصہ ہے

"مینوں لے چلے بابلا لے چلے"

نتھی (ساتھ جوڑے ہوئے، وہ دھاگہ جس کے ساتھ کاغذوں کو ایک جگہ ٹانکا جاتا ہے، کسی معاملہ سے متعلق کاغذوں کا سموہ، پرو کر اکٹھا کرنا)(۱۹۲)

ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۱۲۳

پنجاب کے دیہاتوں میں یہ لفظ اکثر بولا جاتا ہے دفتروں میں اس کا استعمال کسی معاملہ سے متعلق کاغذوں کو جوڑنا یا پھر کاغذوں کا ایک جگہ ٹانکا جاتا ہے اسے بھی نتھی کہتے ہیں۔ لیکن پیشہ ور عورتوں میں یہ رواج ہوتا ہے جب کہ کوئی لڑکی سن بلوغت کو پہنچ جاتی ہے تو ان کی ناک میں سوراخ کر کے نتھ ڈالنے کی رسم ادا کی جاتی ہے اسی طرح پنجاب میں زور آور جانوروں کو قابو کرنے کے لیے ان کے ناک میں باریک رسی ڈالی جاتی ہے اسے بھی نتھ کہا جاتا ہے۔

نہر دے اتے (نیہر، پانی کی وہ بڑی کھال جو زمین سیر اب کرنے کے لیے دریا جھیل وغیرہ سے نکالی گئی ہو، نہر کے اوپر)(۱۹۳)

شر۔ گوشیاں ۱۴

پانی کی نہر جو کھیتوں کو سیر اب کرتی ہے۔ پنجابی سماج میں کسانوں کو کہتے ہیں کہ ہماری فصلوں کا دارو مدار نہر دے اتے منحصر اے۔ پانی وقت پر مل گیا تو پھر فصل بہتر ہو جائے گی۔

وٹوٹ (بل پڑنا، ولوں سے بھرا ہوا)(۱۹۴)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۲۲۷

وٹ کا لفظ اردو کے بل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کپڑے کو وٹ یا بل پڑنے کے ساتھ ساتھ سماجی تناظر میں دیکھا جائے تو ناگواری کی حالت میں ماتھے پر پڑنے والے بل کو بھی پنجابی میں متھے تے وٹ پانا کہا جاتا ہے۔

وکدی (بکتی۔ فروخت ہوتی، وکدا سے، بک جانا، فروخت سے)(۱۹۵)

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص ۹۳

اس سے مراد وہ چیز ہے جو مختلف ہاتھوں میں فروخت ہوتی چلی جاتی ہے۔ پنجاب میں مختلف اشیا و اجناس کی خرید و فروخت عام پر منڈیوں میں کی جاتی ہے اور بعض اوقات ایک چیز کسی ایک

شخص کے ہاں خرید و فروخت میں آتی ہے اور پھر اس کی خرید و فروخت دست بدست ہوتی چلی جاتی ہے۔اس کے لیے پنجابی زبان میں "وکدی" یا "وکدی ہوئی" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

وری (رسوم ، برات ، زیور کپڑا ، بیاہ کے موقع پر دلہا کی طرف سے دلہن کو بھیجے گئے کپڑے زیور وغیرہ)(۱۹۶)

بلبلے، مشمولہ: مجموعہ، ص۳۹

پنجابی تہذیب و ثقافت میں یہ لفظ اپنی ایک پوری روایت رکھتا ہے۔وری سے مراد وہ اشیاء جو لڑکے والے لڑکی کے لیے خریدتے ہیں اور شادی کی رسم میں لڑکی کو دیتے ہیں۔

ہتھ جوڑی (ہاتھ جوڑنا، وینی پکڑنے کا کھیل، ایک بوٹی جس کا استعمال جئی مساک کی طرح باؤلے کتنے کے کاٹے کا علاج ہے۔)(۱۹۷)

شر۔ گوشیاں ۲۴

یہ لفظ بھی پنجاب میں عام بول چال کا حصہ ہے۔میلے ٹھیلوں پر "ہتھ جوڑی" کے مقابلے پنجاب کا ایک مقبول کھیل بھی ہے جس میں نوجوان ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر زور آزمائی کرتے ہیں۔

ہٹی (چھوٹی ہٹ، دکان)(۱۹۸)

شر۔ گوشیاں ۱۰۹

سماج میں ہٹی سے مراد کریانہ کی دکان لیا جاتا ہے۔ تاہم دیہاتوں میں ہر اس دکان کو ہٹی کہتے ہیں جہاں کوئی چیز بکتی ہو، مرمت ہوتی ہو۔

ہڈ حرامی (کوئی کام نہ کرنا۔ محنت سے جی چرانا، کام چور، کام سے دل چرانے والا، آرام طلب)(۱۹۹)

بارہ سنگھے ۶۹

پنجاب میں یہ لفظ اس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کوئی کام کاج نہ کرے۔ اسے "ہڈ حرامی" کہا جاتا ہے۔ نکما، نکھٹو، اس کے اردو میں استعمال ہونے والے الفاظ ہیں۔

ہنڈائے (ہنڈھانا)(۲۰۰)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۹۴۱

ہنڈائے ہوئے ایسے کپڑوں کو بولا جاتا ہے جو کافی عرصہ سے استعمال رہے ہوں۔ پنجابی سماج کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ آزمائے ہوئے رشتوں ناطوں کے حوالے سے بھی استعمال ہوتا ہے۔

ہن کی کراں (اس وقت کیا جائے، اس سمے میں، اب کیا کروں)(۲۰۱)

شوقِ آوارگی، مشمولہ: سفر نامے، ص ۱۹۴

پنجابی زبان کا یہ لفظ کوئی کام بن نہ پانے پر بولا جاتا ہے۔ سماج میں اس کا استعمال عام ہونے کی وجہ سے لفظ کثرت سے بولا جاتا ہے۔ انور مسعود نے ایک پنجابی کتاب کا نام بھی " ہن کیہ کریے" رکھا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی نثر میں استعمال ہونے والی ان پنجابی لفظیات کے مطالعے سے ایک اہم عنصر جس کا پتا چلتا ہے وہ مشرقیت کا غلبہ ہے۔ قاسمی نے مشرق کی اسلامی اقدار کو سامنے رکھتے ہوئے پنجابی لفظیات کو تہذیبی تناظر میں برتا ہے۔ مشرق اور اسلام کی روایات تہذیبی حوالے سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مولانا مودودیؒ ان اسلامی روایات اور تہذیبی افکار کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " انگریزی زبان میں تہذیب کے لیے کلچر کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ میرے خیال سے آج دنیا کو اس سے بھی انکار نہیں کرنا چاہیے کہ بیشک اسلامی تہذیب و تمدن سے ہی دنیا کی تہذیبوں کے چشمے پھوٹے ہیں۔ جس نے دنیا کو ترقی و خوشحالی اور معیشت اور سیاست کے ان راستوں پر گامزن کیا ہے کہ جس پر قائم رہ کر انسانی فلاح کے تمام دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔"(۲۰۲)

عطاء الحق قاسمی کے ہاں پنجابی لفظیات کے تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں ہمیں اسلامی اقدار کا پرتو صاف دکھائی دیتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۵۸

۲۔ ایضاً، ۶۲

۳۔ ایضاً، ۶۲

۴۔ عطاء الحق قاسمی، ہر فن مولا (ڈراما)، تدوین و تسوید، ڈاکٹر ثوبیہ نسیم، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص ۹۷

۵۔ ایضاً، ص ۱۴۲

۶۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۷۸

۷۔ ایضاً، ص ۳۱۷

۸۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۴۵۲

۹۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۹

۱۰۔ فقیر حسین ساگا، ڈاکٹر، پنجاب کے لوک رقص، گورا پبلشرز لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۷۵

۱۱۔ سردار محمد خان، پنجابی اردو ڈکشنری، سچل سٹوڈیوز، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، ص ۷۸

۱۲۔ فقیر حسین ساگا، ڈاکٹر، پنجاب کے لوک رقص، گورا پبلشرز لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۷۷

۱۳۔ عطاء الحق قاسمی، دھوتی، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵۱

۱۴۔ سلیم حسن مرزا، کیمرے کے روبرو، نقش گر، راولپنڈی، جنوری ۲۰۱۰ء، ص ۴۳

۱۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۵۰

۱۶۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۹۱

۱۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۹۱

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۱۰

۲۰۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، ص ۲۱۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۲۷۶

۲۲۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۲۳۔ ایضاً، ص۲۶۶

۲۴۔ ایضاً، ص۲۶۲

۲۵۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۹۷

۲۶۔ عطاءالحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۲۸۴

۲۷۔ ایضاً، ص۳۰۹

۲۸۔ ایضاً، ص۲۸۹

۲۹۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۶۵

۳۰۔ عطاءالحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۲۳۰

۳۱۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۹۵

۳۲۔ ایضاً، ص۵۵

۳۳۔ عطاءالحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۲۶۴

۳۴۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۹۱

۳۵۔ فقیر حسین ساگا، ڈاکٹر، پنجاب کے لوک رقص، گوراپبلشرز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۳۱

۳۶۔ ایضاً، ص۳۳

۳۷۔ ایضاً، ص۳۳

۳۸۔ عطاءالحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۱۸۷

۳۹۔ ایضاً، ص۱۳۲

۴۰۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۵۵

۴۱۔ ایضاً، ص۵۶

۴۲۔ ایضاً، ص۶۰

۴۳۔ عطاءالحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۱۵۹

۴۴۔ ایضاً، ص۱۵۹

۴۵۔ ایضاً، ص۱۶۰

۴۶۔ ایضاً، ص۱۶۹

۴۷۔ ایضاً، ص۱۶۹

۴۸۔ ایضاً، ص۲۲۲

۴۹۔ ایضاً، ص۲۶۳

۵۰۔ ایضاً، ص۱۶۲

۵۱۔ ایضاً، ص۲۹۸

۵۲۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۲۷

۵۳۔ میاں محمد بخش، کلامِ محمد بخش، (انتخاب: محمد سعید)، چوہدری برادرز، دینہ، جہلم، ۱۹۹۷ء، ص۸۷

۵۴۔ نیامت علی، کلامِ نیامت علی، مشمولہ، منتخب پنجابی کلام، بشیر اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۶۱

۵۵۔ عطاء الحق قاسمی، عطایئے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۵۱۹

۵۶۔ ایضاً، ص۵۱۹

۵۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۱۲۷

۵۸۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، ص۱۵۰

۵۹۔ عطاء الحق قاسمی، حویلی (ڈراما)، سی ڈی

۶۰۔ ایضاً

۶۱۔ ایضاً

۶۲۔ ایضاً

۶۳۔ ایضاً

۶۴۔ ایضاً

۶۵۔ عطاء الحق قاسمی، خواجہ اینڈ سنز (ڈراما)، سی ڈی

۶۶۔ ایضاً

۶۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۱۶۳

۶۸۔ ایضاً، ص۲۳۵

۶۹۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔گوشیاں، نستعلیق، مطبوعات، لاہور، اشاعت ہشتم، ۲۰۱۲ء، ص۱۵۸

۷۰۔ ایضاً، ص۲۸۰

۷۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۳۹۵
۷۲۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، نستعلیق، مطبوعات، لاہور، اشاعت ہشتم، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹۱
۷۳۔ ایضاً
۷۴۔ عطاء الحق قاسمی، عطایئے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۳۶۷
۷۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۸۷
۷۶۔ عطاء الحق قاسمی، خواجہ اینڈ سنز (ڈراما)، سی ڈی
۷۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۲۸۷
۷۸۔ ایضاً
۷۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۸۵
۸۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۱۱۰
۸۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۱۱۷
۸۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۱۳۷
۸۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۲۰۷
۸۴۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۱۹۹
۸۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۱۳۹۰
۸۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۱۶۳۸
۸۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۲۷۹
۸۸۔ تنویر بخاری، سید، تنویر الغات، لاہور: ایونیو بک پیلس، س ندارد، ص ۱۳۷
۸۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۳۱۶
۹۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۲۱۲۱
۹۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۴۰۶
۹۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۴۷۲
۹۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۴۸۶
۹۴۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۵۰۲

۹۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۱۹۳۳

۹۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۶۳۰

۹۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۶۳۵

۹۸۔ فقیر حسین ساگا، ڈاکٹر، پنجاب کے لوک رقص، گوراپبلشرز، لاہور، ۱۹۹۶ئ، ص ۱۳

۹۹۔ تنویر بخاری، سید، تنویر الغات، لاہور: ایونیو بک پیلس، س ندارد، ص ۱۷۲

۱۰۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۲۴۵

۱۰۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۵۷۸

۱۰۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۵۸۶

۱۰۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۵۹۴

۱۰۴۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۶۲۰

۱۰۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۲۷۸

۱۰۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۸۴۶

۱۰۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۶۷۵

۱۰۸۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۵۸۰۱

۱۰۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۷۴۹

۱۱۰۔ تنویر بخاری، سید، تنویر الغات، لاہور: ایونیو بک پیلس، س ندارد، ص ۲۸۴

۱۱۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۹۶۷

۱۱۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۷۸۵

۱۱۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۵۱۱

۱۱۴۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۸۰۲

۱۱۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۷۲۱

۱۱۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۸۲۵

۱۱۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۹۷۲

۱۱۸۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۸۶۹

۱۱۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص۱۰۱۷

۱۲۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص۰۳۰۱

۱۲۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص۲۰۶۱

۱۲۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص۱۷۰۱

۱۲۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص۳۰۱۲

۱۲۴۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص۱۰۸۵

۱۲۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص۵۹۰۱

۱۲۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص۸۰۲

۱۲۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص۱۱۷۳

۱۲۸۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص۱۲۹۱

۱۲۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص۳۴۰۲

۱۳۰۔ تنویر بخاری، سید، تنویر الغات، لاہور: ایونیو بک پیلس، س ندارد، ص۵۹۴

۱۳۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص۱۵۳۱

۱۳۲۔ تنویر بخاری، سید، تنویر الغات، لاہور: ایونیو بک پیلس، س ندارد، ص۴۵۰

۱۳۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص۴۶۳۱

۱۳۴۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص۷۵۳۱

۱۳۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص۱۳۹۳

۱۳۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص۷۱۰۱

۱۳۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص۴۴۳۲

۱۳۸۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص۱۶۲۲

۱۳۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص۸۰۰

۱۴۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص۸۳۶۱

۱۴۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص۱۶۶۹

۱۴۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص۲۸۶۱

۱۴۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۲۱۶۲

۱۴۴۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۱۶۸۳

۱۴۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۱۷۳۴

۱۴۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۱۸۱۵

۱۴۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۱۹۳۳

۱۴۸۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۱۹۶۹

۱۴۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۲۰۴۲

۱۵۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۱۸۰۲

۱۵۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص ۹۰۷۱

۱۵۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۲۱۱۲

۱۵۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۲۲۸۸

۱۵۴۔ تنویر بخاری، سید، تنویر الغات، لاہور: ایونیو بک پیلس، س ندارد، ص ۶۴۹

۱۵۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۲۳۲۴

۱۵۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۲۳۴۴

۱۵۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۳۱۴۳

۱۵۸۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۲۳۹۹

۱۵۹۔ سردار محمد خاں، پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، (لاہور: سچل سٹوڈیوز پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۲۰۰۹ء)، ص ۲۳۹۵

۱۶۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۲۳۹۴

۱۶۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۲۴۲۵

۱۶۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۲۴۹۶

۱۶۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۲۴۸۰

۱۶۴۔ تنویر بخاری، سید، تنویر الغات، لاہور: ایونیو بک پیلس، س ندارد، ص ۷۱۰

۱۶۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۲۵۳۱

۱۶۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۷۴۶۲

۱۶۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۲۶۷۲

۱۶۸۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۲۴۹۶

۱۶۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۳۲۷۲

۱۷۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۳۵۷۲

۱۷۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۲۷۸۰

۱۷۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۲۷۸۲

۱۷۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۲۸۵۸

۱۷۴۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۷۶۸۲

۱۷۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۲۸۷۰

۱۷۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۱۹۸۲

۱۷۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۶۲۷

۱۷۸۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۹۳۹۳

۱۷۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۲۹۵۷

۱۸۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص ۶۳۰۳

۱۸۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۹۷۰۳

۱۸۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۳۸۰۳

۱۸۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۳۰۸۵

۱۸۴۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۳۰۸۵

۱۸۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۳۱۰۱

۱۸۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۳۱۰۱

۱۸۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۲۰۱۲

۱۸۸۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص ۳۰۱۳

۱۸۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص ۳۱۴۹

۱۹۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول، ص۲۹۸

۱۹۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد اول: ص۲۶۲۳

۱۹۲۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص۵۳۳۳

۱۹۳۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص۳۳۸۴

۱۹۴۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص۶۲۴۲

۱۹۵۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص۳۱۴۳

۱۹۶۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص۳۴۹۰

۱۹۷۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص۱۰۵۳

۱۹۸۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص۳۵۰۶

۱۹۹۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص۳۵۴۰

۲۰۰۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم، ص۳۵۳۶

۲۰۱۔ پنجابی اردو ڈکشنری جلد دوم: ص۲۶۹۸

۲۰۲۔ مودودی، ابو اعلیٰ، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، لاہور، اسلامک پبلیکیشنز، س ن، ص۴۷

باب سوم:

عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی لفظیات کا ثقافتی اور فنی تناظر

الف۔ عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی لفظیات کا ثقافتی تناظر

تاریخ انسانی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں تہذیبی اقدار اور سماجی روایات عام رہیں۔ معاشرے ان کے اثر و رسوخ سے متاثر ہوتے رہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ زندگی کے ہر دور میں کسی نہ کسی تہذیب و ثقافت کا عروج رہا۔ یونانی، ایرانی، رومی، اسلامی اور مغربی تہذیبوں نے اپنے اپنے دور عروج میں عالم انسانیت کے ایک خاصے حصے کو متاثر کیا۔ ہر تہذیب اپنے مذہب و ثقافت کی روشنی میں خوبیوں اور خامیوں کے حوالے سے مخصوص خد و خال رکھتی ہے۔ بعض اوقات ایک نکتہ نظر سے کوئی چیز خوبی شمار ہوتی ہے لیکن دوسرے اسے خامی گردانتے ہیں۔ اسی بنیاد پر کبھی کبھار تہذیبوں کا ٹکراؤ بھی عمل میں آجاتا ہے۔ جس دور میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا عروج تھا تو اس نے عالم انسانیت پر دور رس نتائج مرتب کیے۔ جہاں جہاں تک وہ روشنی پہنچی لوگوں نے دل و جان سے نہ صرف اسے قبول کیا بلکہ اپنی آبائی تہذیبوں کو خیر آباد کہہ کر اسے اختیار کیا۔ مصر، الجزائر، مراکش، الجیریا، لیبیا، انڈونیشیا، موریطانیہ اور صومالیہ افریقی ممالک ہیں لیکن وہاں کے باسیوں نے اپنی آبائی زبانوں، روایات اور لباس کو چھوڑ کر اسلام کی زبان عربی کو اختیار کیا اور تہذیب اسلامی کے فرزند بن گئے۔ کئی حوادث زمانہ وقوع پذیر ہوئے لیکن آج بھی وہاں عربی زبان اور اسلامی لباس کو اہمیت حاصل ہے۔ ہر دور کے تخلیق کاروں نے ادب اور سماج کے تعلق کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ عصر حاضر میں عطاء الحق قاسمی ایسے لکھاریوں کی فہرست میں صفحہ اول پر نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی نگارشات میں ثقافتی تناظر کو موزوں انداز میں پیش نظر رکھا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے زندگی میں بے شمار اسفار کیے جن میں برطانیہ، امریکہ کے علاوہ بہت سے یورپی ممالک شامل ہیں۔ انھوں نے بطور سفارت کار مختلف ممالک میں خدمات سر انجام دیں اس دوران میں انھوں نے ان ممالک کی ثقافت اور سماج کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ ایک وسیع مشاہدہ رکھنے والے انسان ہیں اور مزاح کا لطیف عنصر ان کے مزاج میں شامل ہے یوں کہا جا سکتا ہے کہ عطاء الحق قاسمی کا مزاح دراصل ان کا مزاج ہے۔ یہی مزاج ان سے سفرنامے لکھواتے وقت بھی معاشرے کو گہری نظر سے دیکھنے اور پھر اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے پر اکساتا ہے۔

انگریزی معاشرت کی عکاسی:

ایک تخلیق کار سماج سے کٹ کر کسی صورت نہ تو تخلیقی عمل میں سرخ رو ہو سکتا ہے اور نہ ہی محض تخیل کی بنیاد پر سماج کی عکاسی کر سکتا ہے۔اسے سماج کو بیان کرنے کے لیے اس سماج میں اترنا پڑتا ہے۔جب کوئی تخلیق کار کسی سماج کا حصہ بن جاتا ہے خواہ یہ شراکت قلیل عرصے کے لیے ہی کیوں نہ ہو، وہ اس سماج کے اسرار و رموز سے کسی نہ کسی حد تک آگاہی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔سماجی آگاہی کا یہ زاویہ تخلیق کار کے لیے رہبر کا کام کرتا ہے۔سماج کا حصہ بن جانے کے بعد جب وہ اس سماج کے بارے میں کچھ بھی تخلیق کرتا ہے تو اس سماج کی حقیقی تصویر پیش کرتا چلا جاتا ہے۔یہ ایسی تصویر ہوتی ہے جو تخلیق کار کے تخیل کی رنگ آمیزی سے صفحہ قرطاس پر اتری ہوتی ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماجی عکاسی کے لیے تخلیق کار کو اس سماج کا حصہ بننا سود مند ثابت ہوتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی ایک عرصہ تک انگریزی سماج کا حصہ رہے ہیں۔انھوں نے انگریزی معاشرے کو جس طرح دیکھا اس میں انھوں نے اپنے تخیل کی رنگ آمیزی کرتے ہوئے بیان کیا ہے۔ان کا بیانیہ اپنے اندر ایک عجیب تاثیر رکھتا ہے جس کی وجہ سے قاری ان کی تحریر کے سحر میں کھو جاتا ہے۔قاسمی کی تحریریں جہاں انگریزی معاشرت پر طنز کے نشتر چلاتی نظر آتی ہیں وہیں ان کی تحریروں میں اس معاشرت کے مثبت پہلوؤں کی بھی عکاسی ملتی ہے۔انگریزی معاشرت ان کی تحریروں میں خاص انداز سے جھلکتی ہے، وہ انگریزی معاشرت کی عکاسی کرتے وقت اپنی تحریروں میں ثقافتی اور سماجی تناظرات کو مد نظر رکھتے ہیں اور کوئی بھی واقعہ بیان کرتے وقت اس کے تمام سماجی اور ثقافتی جزیات اور عناصر کو بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

آج کا دور مغربی تہذیب و ثقافت کے عروج کا دور ہے۔ایک طویل جدوجہد اور علمی کاوشوں کے بعد اس تہذیب نے یہ مقام پایا۔جہاں سے بھی اچھی روایات ملیں انہوں نے انہیں اپنایا۔معاشرے میں علم کو عام کیا۔وقت حالات اور ماحول کے تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے ممالک میں جدید علوم کی یونیورسٹیز کے جال پھیلا دیے۔ہر طرح کی ایجادات اور انکشافات کے ذریعے زندگی کو آسان بنا دیا۔یہاں تک کہ سخت ترین گرم ممالک میں رہنے والے لوگ بھی فریج، فریزر اور ائر کنڈیشنڈ بنانے کا فن برف میں ڈھکے ان سرد ترین ممالک سے سیکھنے پر مجبور ہیں۔اگر منصفانہ تجزیہ کیا جائے تو اس حقیقت کو ماننا پڑتا ہے کہ اس تہذیب میں بیشمار خوبیاں ہیں۔اپنے رویوں میں دیانتداری اور سچائی کو رواج دیا۔ملاوٹ اور دھوکہ دہی سے باز رہے۔یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کی منڈیوں میں ان کی بنائی ہوئی مصنوعات کو اعتماد اور برتری حاصل ہے۔اور آج ہمارے ہاں

صورت حال یہ ہے کہ ہمارے ممالک میں ابھی تک صرف "گھی اور انڈہ" ہی رہ گئے جو دیسی ہو تو پسند کیے جاتے ہیں باقی ہر چیز جو دل سے پسند کی جاتی ہے وہ "ولایتی" ہی ہے اگر بغور جائزہ لیا جائے تو وہ تمام خوبیاں جو اس تہذیب میں پائی جاتی ہیں آج سے پندرہ سو سال پہلے ہمارے پیارے نبی ﷺ نے ہمیں ان کی تعلیم دے دی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "سچائی نجات دینے والی اور جھوٹ ہلاک کرنے والا ہے" لیکن ہمارے ہاں ارباب اقتدار سے لیکر ایک عام آدمی تک ہر ایک نے شاید یہ ذہن بنالیا ہے کہ جھوٹ کی بیساکھی کے بغیر ہمیں زندگی میں کامیابی نہیں مل سکتی۔ ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں بتا دیا تھا کہ "جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں" لیکن ہمارے ہاں کیا کوئی چیز ہے جو ملاوٹ کے بغیر ہو۔ دودھ میں پانی اور غذائی اجناس میں نقصان دہ اشیاء کی ملاوٹ سے بھی ہم باز نہ آئیں اور دعویٰ کریں حب رسول ﷺ کا، یہ قول و فعل کی تفاوت اور علم و عمل کا تضاد نہیں تو اور کیا ہے؟ مغرب کے کلچر میں ٹریفک کا منظم نظام بھی ایک بڑی خوبی ہے جو یقیناً ہمارے ممالک کیلئے قابل تقلید ہے۔ ڈرائیونگ ٹیسٹ اور ٹریفک کے قواعد و ضوابط پر عمل درآمد اس لئے بھی بہت اہم ہے کہ اس میں انسانی جانوں کے تلف ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق "ہمارے ممالک" کا ٹریفک کا نظام ایک بہت بڑی "دہشت گردی" ہے۔ جو ہر روز کئی جانیں نگل جاتا ہے۔ اس کے بھیانک نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ ہر روز کے حادثات میں بلاشبہ سینکڑوں قیمتی جانیں ضائع ہو رہی ہیں۔ لیکن ارباب اقتدار اور عوام الناس کی طرف سے اس پر کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی جارہی۔ "آف شور کمپنیوں" سمیت تہذیبِ مغرب کی ہر روایت ہمارے ارباب حل و عقد اور اصحاب ثروت وہاں سے اٹھالائے۔ اور آج صورت حال یہ ہے کہ نیو ائر نائٹ، ویلنٹائن ڈے، نیو برانڈ کی شراب اور رقص و سرود کی محافل وہاں سے بڑھ کر یہاں ہیں۔ کیا ممکن نہ تھا کہ کوئی اچھی روایات بھی یہاں سے لے جاتے۔ ان میں سے ایک "ٹریفک کا نظام" ہے۔ جہاں تک تہذیب مغرب کی خامیوں کا تعلق ہے اس میں فحاشی و عریانی اور جنسی بے راہروی صف اول میں آتی ہیں۔ خاندانی نظام کا تقدس مجروح ہو چکا ہے۔ رشتوں کا احترام آخری سانسیں لے رہا ہے۔ وہاں کے رہنے والے اس امر کو بہت محسوس بھی کرتے ہیں، ان کے مشاہدے اور دانست کے مطابق ان کی اس فکری بے اعتدالی کا سبب یہ ہے کہ اس حوالے سے ان کے پاس کوئی "رول ماڈل" نہیں۔

یہ انگریزی معاشرت اور تہذیب کا ایک اجمالی سا جائزہ ہے جو ان سطور میں پیش کیا گیا۔ اہلِ مغرب نے جب انسانی اقدار کو پس پشت ڈالا تو ان کی زندگی میں سے انسان کی قدر و قیمت کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی اور آج صورت حال یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں کے نزدیک انسان اور انسان کی بنیادی ضروریات کوئی خاص اہمیت

نہیں رکھتی۔ کاروبار کو وہاں اہمیت حاصل ہے اور کاروبار جب پھیلتا ہے تو اس کا پھیلاؤ بعض اوقات انسانی اقدار کو بھی نگل جاتا ہے یہی آج کل مغرب میں ہو رہا ہے۔ آج مغرب کا انسان دن رات کام کرنے کے بعد بھی بنیادی ضروریات کا محتاج ہے۔ اور پاکستان سمیت جن ممالک نے بھی اپنی ثقافتی اقدار اور سماجی عناصر کو پس پشت ڈال کر مغرب کی اندھی نقالی کی ہے وہاں بھی صورت حال مغرب سے مختلف نہیں۔

مغرب میں دولت اور پیسے کی دوڑ نے انسانوں سے آرام و سکون کی دولت چھین لی ہے، ان کی آرام گاہیں بھی سکڑ گئی ہیں کیوں کہ اب وہ آرام گاہیں انسان کے آرام کے لیے نہیں بلکہ اس کی ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لیے موجود ہیں یوں ان کے ہاں انسان سے زیادہ وقعت چیزوں کی بن چکی ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے ایک سفر نامے کے دوران مغربی معاشرت کا قریب سے مشاہدہ کیا اور اسے قارئین کے لیے پیش کیا۔ وہ ایک آرام گاہ کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں:

> "ایک گیسٹ روم جس میں ایک گیسٹ اور اس کی چارپائی آسکتی ہے۔ درمیان میں باتھ روم جس میں موجود ٹب کے گرد کرٹن نہیں ہوتا کیونکہ برطانیہ میں نہانے کا نہیں آشنان کرنے کا رواج ہے۔ ایک بیسن جس میں گرم اور ٹھنڈے پانی کی ٹونٹیاں لگی ہوتی ہیں لیکن مکسر نہیں ہوتا۔ ٹھنڈا اور گرم پانی بیسن میں جمع کر کے منہ پر چھینٹے مارے جاتے ہیں۔ باتھ روم کے ساتھ ایک چھوٹا ٹائلٹ جس کی تنگی داماں کی وجہ سے کئی قسم کی تنگیاں بپا ہو جاتی ہیں۔ اس میں داخل ہونے اور نکلنے کے لیے پریکٹس ضروری ہے۔"(۱)

اس تحریر سے ایک طرف تو مغرب میں آرام گاہوں کی تصویر سامنے آتی ہے تو دوسری طرف ان کے طرز معاشرت کا بھی علم ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب وہاں بطور مہمان گئے تھے اور ظاہر ہے مہمان کو ٹھہرانے کے لیے انھوں نے اپنے طور پر بہترین انتظام کیا ہو گا لیکن اس بہترین انتظام کی آرام گاہ کے اس نقشے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کے عام آدمی کو بنیادی سہولیات زندگی بھی میسر نہیں۔ اس آرام گاہ کا نقشہ کھینچتے وقت قاسمی صاحب نے جو انگریزی کے الفاظ استعمال کیے ہیں وہ بھی اس تحریر میں اپنا ایک خاص تاثر قائم کرتے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کا مدعا انہی انگریزی الفاظ کی بدولت ہی بہتر طور پر بیان ہو پایا ہے۔

گیسٹ روم (GUEST ROOM) کا مطلب اردو میں مہمان خانہ لیا جاتا ہے۔ وہ کمرا جس میں مہمان کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ اب قاسمی صاحب جس ملک کے مہمان خانے کا حال بیان کر رہے ہیں اس ملک میں

اسے گیسٹ روم ہی کہا جاتا ہے اور ان کے نزدیک "گیسٹ روم" کے لفظ کے سامنے آتے ہی اسی کمرے کا نقشہ ابھرتا ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ایک اور بات جو یہاں بیان کرنے کے قابل ہے کہ ثقافتی اختلاف کی وجہ سے مغرب اور مشرق میں مہمان کا تصور بھی الگ الگ ہے، مشرق میں مہمان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور میزبانوں کے لیے باعث برکت خیال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے قریبی رشتہ داروں کی مہمان نوازی کے لیے پورا گھر حاضر ہوتا ہے کوئی باقاعدہ مہمان خانہ نہیں اور جو مہمان، مہمان خانہ میں ٹھہرائے جانے ہوتے ہیں ان کے لیے بھی مہمان خانے خاصے وسیع ہوتے ہیں تاکہ مہمان کو کوئی تکلیف پیش نہ آئے۔ مشرق میں مہمان کے ٹھہرنے کے اوقات بھی عام طور پر کئی دنوں پر بھی محیط ہوسکتے ہیں کیوں کہ یہ مشرقی معاشرت اور سماج کا حصہ ہے جب کہ مغرب میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں کی زندگی یہاں کی نسبت زیادہ مصروف ہے اور وہاں مہمانوں کا ٹھہرنا اسی قدر ہی اہمیت رکھتا ہے گویا کہ مسافر نے سرائے میں رات بسر کی اور آگے چل دیا اس لیے ان کے "گیسٹ روم" بھی مختصر وقت گزارنے کے تقاضوں کے مطابق تعمیر کیے جاتے ہیں۔

اسی تحریر میں قاسمی صاحب کا یہ بیان کہ اس میں داخل ہونے اور نکلنے کے لیے بھی پریکٹس کی ضرورت ہوتی ہے۔ لفظ پریکٹس بھی اپنا ایک ثقافتی منظر نامہ سامنے لاتا ہے۔ عام طور پر پریکٹس کو تربیت یا مشق کے طور پر لیا جاتا ہے۔ انگریزی معاشرت میں ایسے چھوٹے گھروں میں رہنے والوں کو ان گھروں اور کمروں کا چھوٹا پن اس لیے محسوس نہیں ہوتا کہ یہ ان کا روزمرہ کا کام بن چکا ہوتا ہے وہ ان مکانوں میں رہتے ہی صرف اپنا فارغ وقت گزارنے کے لیے ہیں نہ کہ آسائش کے لیے اس لیے انھیں وہاں آنے جانے کی خوب پریکٹس ہوتی ہے جبکہ ایک مسافر کے لیے نہ تو وقت گزاری اس انداز کی ہوتی ہے جیسے ان مقامی لوگوں کی اور نہ ہی اس کو ایسے کمروں میں رہنے کا کوئی تجربہ ہوتا ہے اس لیے ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اگر کوئی وہاں مستقل سکونت اختیار کرلے تو تھوڑے ہی عرصے میں وہ بھول جائے گا کہ وہ کسی ایسے تنگ مکان میں رہتا ہے جو اس کی بنیادی ضرورت بھی پورا نہیں کرتا۔ یوں سوچ کے اس حد تک تبدیل ہونے کے لیے وہاں گئے ہوئے ہر شخص کو ایسی پریکٹس یعنی اس معاشرے میں وقت گزارنے کے مواقع ملنا ضروری ہیں اگر ایسا کسی بھی وجہ سے ممکن نہ ہو پائے تو ایک آدھ دن کے مسافر کیلیے ایسے آرام خانے کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑتے۔ مغربی معاشرت کا بڑا مسئلہ ہی انسان کی شناخت کا مسئلہ ہے، مغرب نے انسان سے اس کی پہچان چھین لی اور اب اسے چیزوں کے استعمال کے لیے بھی دوسروں کا دست نگر ہونا پڑا ہے۔

یوں اس اقتباس میں عطاء الحق قاسمی نے بڑے لطیف انداز میں انگریزی معاشرت میں مہمان کے تصور کو واضح کیا ہے کہ مہمان کے ٹھہرانے کی جگہ کی تنگی داماں مہمان کی مغربی معاشرت میں قدر کو ظاہر کرتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے انگریزی معاشرت کی عکاسی کرتے ہوئے وہاں کی سہولیات کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ کسی بھی واقعہ کو بیان کرتے وقت مکمل جزیات کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں جس سے ایک طرف تو قاری پر حقیقت حال پوری طرح منکشف ہو جاتی ہے تو دوسری طرف وہ اس منظر میں کھو کر لذت آشنائی حاصل کرنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ تحریر میں بوجھل پن پیدا نہیں ہوتا کہ جزئیات نگاری سے کڑی سے کڑی ملتی چلی جاتی ہے۔ ذیل کے اقتباس سے دیکھیے کہ قاسمی کا قلم مغربی معاشرے کی سہولیات سے کس طرح آشنا کرواتا ہے۔ وہ اپنی کتاب "گوروں کے دیس میں" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> "بائیں جانب ٹکٹ کی مشین جس میں پیسے ڈال کر ٹکٹ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ چینج حاصل کرنے والی مشین، پاؤنڈ ڈالیں اور چینج حاصل کریں۔ ایک کونے میں ٹیلی فون، پلیٹ فارم تک پہنچنے کے لیے سیڑھیاں، اترنے سے پہلے بائیں ہاتھ "ٹکٹ بابو" جو ٹکٹ چیک بھی کرتا ہے اور اگر مشین خراب ہو تو ٹکٹ دیتا بھی ہے۔"۔ (۲)

"چینج" (CHANGE) کا معنی تبدیلی ہے۔ کسی کام میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا اس کام کو چینج کرنا کہلاتا ہے۔ اسی طرح بدلنا بھی چینج کے معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً کپڑے چینج کرنا، مکان چینج کرنا، موٹر کار کا ٹائر چینج کرنا وغیرہ۔ یہاں چینج کا لفظ بھی ایک طرح سے تبدیلی کے معنوں میں ہی استعمال ہو رہا کہ بڑی کرنسی کو چھوٹی کرنسی میں بدلا جا رہا ہے۔ اس تبدیلی کے لیے مختلف جگہوں پر مختلف الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً اردو میں بڑے کرنسی نوٹ کے بدلے چھوٹے کرنسی نوٹ لینے کو "کھلے پیسے" لینا بھی کہا جاتا ہے، پنجابی میں اس عمل کے لیے لفظ "بھان" بھی استعمال ہوتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ گزشتہ کچھ سالوں سے چینج کا لفظ کرنسی نوٹوں کی تبدیلی کے لیے پنجابی اور اردو دونوں میں ہی استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہاں قاسمی صاحب نے چینج کا لفظ بھی کرنسی کی تبدیلی کے لیے استعمال کیا ہے اور یہ اس مغربی معاشرے کا مقبول عام لفظ ہے جو ایک طرف ان کی زبان میں کرنسی نوٹوں کی تبدیلی کے عمل کو ظاہر کرتا ہے تو دوسری طرف ہمارے ہاں بھی اسی عمل کے لیے اپنے اصلی تلفظ کے ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے۔ یوں اس جگہ کرنسی کی تبدیلی کے لیے "چینج" کا

لفظ تحریر میں کسی طرح بھی ٹھونسا ہوا معلوم نہیں ہوتا بلکہ قاری پر انگریزی طرز معاشرت کی سہولیات کو بیان کرنے کے لیے بر محل معلوم ہوتا ہے۔

اسی طرح دیگر الفاظ ٹکٹ، ٹکٹ بابو، پلیٹ فارم، چیک نہ صرف اردو میں عام مستعمل ہیں بلکہ بعض کے نزدیک تو یہ لفظ اب اردو کے ہی قرار دیے جاتے ہیں کیوں کہ ان کا اردو میں استعمال اردو قواعد کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ آج ہم ٹکٹ کی جمع بناتے وقت انگریزی کی طرح لفظ "ٹکٹس"(TICKETS) استعمال نہیں کرتے بلکہ اردو قواعد کے مطابق "ٹکٹوں" یا "ٹکٹیں" استعمال کرتے ہیں۔

انگریزی معاشرت کے حوالے سے دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں انگریزی معاشرت کے بہت سے لطیف پہلوؤں کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ وہ اپنے سفر ناموں میں انگریزی معاشرت کی عکاسی بھی بڑے واضح انداز میں کرتے ہیں۔ انگریزی ممالک اور خاص طور پر یورپ میں تیز ترین ترقی نے جہاں مشینی صنعت کو فروغ دیا وہاں انسان کی قدرو منزلت بھی کم ہوتی چلی گئی۔ انسان کا مقصد صرف پیسے کا حصول رہ گیا، اسی پیسے کی خاطر انسان نے انسان سے بھی بیگانگی اختیار کر لی اور نوبت یہاں تک آگئی کہ ایک دوسرے سے بات کرنا بھی گوارا نہیں اس امر کے پیچھے دراصل وہ پیسے کی دوڑ اور پیسے کی اہمیت ہے جس نے مغربی معاشرے کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا، یوں مغربی معاشرے سے اخلاقی اقدار ختم ہوتی چلی گئیں، معاشرہ بے راہ روی کا شکار تو ہوا ہی تھا ساتھ تنہائی نے بھی اس معاشرے میں ڈیرے ڈال لیے یوں افراد معاشرہ ایک دوسرے سے بیگانے ہوتے چلے گئے۔ ایسے میں وہ نسل جس نے اس اخلاقی زوال سے پہلے آنکھ کھولی تھی اس میں ان اخلاقی اقدار کی طرف لوٹنے کا رجحان بھی کسی نہ کسی حد تک پایا جاتا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے میل ملاقات کے بھی تمنائی ہوتے تھے لیکن نئی نسل کے نزدیک ان کا ٹھکانہ اب صرف "اولڈ پیپلز ہوم" ہی رہ گیا تھا۔ عطاء الحق قاسمی نے مغربی معاشرت کے اس پہلو کو بڑے لطیف انداز میں واضح کیا ہے۔

"انگریز کو مطالعے کا بہت شوق ہے۔ چنانچہ تمام خواتین و حضرات ایک دوسرے سے بے نیاز اخبار کے مطالعے میں مشغول تھے یا کوئی انعامی معمہ حل کر رہے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ اونگھ بھی رہے ہوتے ہیں۔میرا ذاتی خیال ہے کہ یہ ایک دوسرے سے بات نہ کرنے کا بہانہ ہے۔کیوں کہ ان سے بات کریں تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ کتاب تو کیا اخبار بھی نہیں پڑھتے ہوں گے۔"[۳]

اس بیان سے مغربی معاشرت کی ایک جھلک نظر آتی ہے کہ کس طرح اس معاشرے میں اندرونی تنہائی نے لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے۔لوگ ایک دوسرے سے بات کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں لیکن ایک دوسرے کے قریب آنے کو بھی تیار نہیں۔ ایک دوسرے سے دلوں کے فاصلے اس حد تک بڑھ چکے ہیں کہ خاندانی نظام تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔ وہ نسل جو اس جدید ترقی یافتہ دور کی پروردہ ہے وہ اس نے اپنے اسلاف سے بالکل منھ موڑ لیا ہے اور یوں معاشرے میں خاندان اور خاندان کے افراد کا تصور مٹ گیا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں اس المیے کو خوب نمایاں کیا گیا ہے۔ انھوں نے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے معاشرے کے ان منفی رویوں پر چوٹیں بھی کی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کا مشاہدہ خاصا وسیع ہے وہ ایک منظر میں اپنے مشاہدے کی بنا پر ایسے رنگ بھر دیتے ہیں کہ قاری ان کے ساتھ سفر کرنے لگتا ہے۔ وہ جزئیات نگاری میں خاص مہارت رکھتے ہیں اور کسی منظر کو بیان کرتے وقت اس کے جملہ امور کو سامنے لانے کا فن خوب جانتے ہیں۔ ان کے سفر نامے جہاں ایک معاشرے کے بارے میں جغرافیائی معلومات مہیا کرتے ہیں وہاں اس معاشرے کا سماجی تجزیہ کرنے میں بھی خاص مہارت رکھتے ہیں۔

تنہائی جو مغربی معاشرے کو تباہ کیے جا رہی اس سے سب سے زیادہ متاثر وہ نسل ہوئی ہے جس نے اپنا سب کچھ اپنی اولاد کی خاطر قربان کر دیا اور آج وہی اولاد اور معاشرہ ان کو قبول کرنے کو بھی تیار نہیں۔ ان سے بات کرنے کو بھی کوئی تیار نہیں، زر اور زن کی ہوس معاشرے کو تباہی کے کنارے پر لے گئی ہے۔ اخلاقی اقدار دم توڑ چکی ہیں۔ لوگ سفر کے دوران میں بھی اس ہمدردی کی تلاش میں ہوتے ہیں جس کا نتیجہ چند بول ہی کیوں نہ ہو، دوسروں سے بات کرنے کو ترسنے والی یہ نسل قابل رحم بن چکی ہے۔ وہ آج بھی لوگوں سے بات کرنے کو ترستے ہیں۔ ذیل مین دیکھیے کہ قاسمی صاحب ان لوگوں کے ہاں اخلاقی اقدار کے زوال کو کیسے نمایاں کرتے ہیں۔

"میرے سامنے والی سیٹ پر ایک بوڑھی میم بیٹھی تھی۔اس نے پاؤں میں سودا سلف خریدنے کے لیے کسن کی بنی ٹوکری رکھی ہوئی تھی اور وہ اپنے ساتھ والے مسافر سے مسلسل گفتگو کرتی جارہی تھی۔ جو اس کی طرف دیکھے بغیر مسلسل اخبار کے مطالعے میں مشغول تھا۔ وہ مسافر اگلے اسٹیشن پر اتر گیا تو بوڑھی میم نے دوسرے مسافر کے ساتھ بے ربط قسم کی گفتگو شروع کر دی جس پر اس نے کھڑکی سے باہر جھانکنا شروع کر دیا۔ یورپ اور امریکہ میں بوڑھوں کو "سینئر شہری" کہا جاتا ہے۔ اور ریاست انہیں زندگی کی تمام سہولتیں فراہم کرتی ہے۔ صرف اتنا ہے کہ ان بوڑھوں سے کوئی بات نہیں کرتا۔"[۴]

یہ سینئر شہری یا انگریزی کی زبان میں سینئر سیٹیزن وہ ہیں جنہوں نے نوجوانوں کو پروان چڑھا کر اس قابل بنایا کہ آج وہ سر اٹھا کر چلنے کے قابل بن گئے ہیں اور اقوام عالم پر حکومت کرنے کے خواب دیکھتے ہیں لیکن اخلاقی زوال اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ گھر میں موجود بوڑھے والدین سے بات تک کرنے کو وقت نہیں، اور وہ اگر بازار سودا لینے بھی جائیں تو ان کی آنکھیں کسی ایسے شخص کی متلاشی ہوتی ہیں جو ان سے دو بول ہی بول دے لیکن وہاں زبانوں کو لگے قفل بزرگوں کے لیے نہیں کھلتے۔

مغربی معاشرے میں بزرگوں کو سینئیر سیٹیزن کہا جاتا ہے۔ یہ ترکیب دو الفاظ سے مل کر بنی ہے۔ سینئیر (Senior) کو عام طور پر بڑے کے معنوں میں لیا جاتا ہے اور سینئر سیٹیزن کہتے وقت بھی ان بزرگوں کی عمر کی وجہ سے ان کے لیے یہ لفظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ بزرگوں کے علاوہ سینئیر کا لفظ ملازمت کے مختلف درجات کی بلندی کے لیے بھی استعمال ہوتا۔ جو جتنی زیادہ اعلیٰ پوسٹ پر بیٹھا ہوگا وہ دوسروں سے اتنا ہی سینئر سمجھا جاتا ہے۔ یہاں بھی سینئر بڑائی کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ بڑائی عہدے کی ہوتی ہے ضروری نہیں کہ عمر کی بھی ہو، کیونکہ بہت سے ایسے اعلیٰ عہدیدار بھی ہوتے ہیں جو اپنے ماتحتوں سے عمر میں بہت چھوٹے ہوتے ہیں لیکن پھر بھی ان سے سینئر کہلاتے ہیں یوں یہ سینیارٹی عہدے کے بڑا ہونے پر ملی۔ یورپ میں بزرگوں کو جو سینئر شہری کہا جاتا ہے اس کی بڑی وجہ ان کی عمر ہے اور وہ اس عمر کی وجہ سے سینئر شہری کہلاتے ہیں۔ اس لفظ میں بھی ایک عجیب حقیقت پوشیدہ ہے کہ جب تک کوئی سینیارٹی کی عمر کو پہنچتا ہے تب تک وہ نہ صرف خود کئی تجربات سے گزر چکا ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے تجربات بہت سے دوسروں لوگوں کو بلواسطہ یا براہ راست منتقل کر چکا ہوتا ہے یوں اس سے دوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جب وہ دوسروں کو فائدہ

پہنچانے کے عمل انجام دے چکا ہوتا ہے تو اسلامی معاشرے میں وہ ایک قابلِ عزت شخص گردانا جاتا ہے کیوں کہ اسلامی معاشرے کی بنیاد اخلاقی اقدار اور روحانیت پر رکھی گئی ہے اس لیے اخلاقی طور پر اس کی اہمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے اور اس وقت جب وہ خود کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا اس کی خدمت کو باعث اجر و ثواب و باعث فخر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے دراصل اسلام کی وہ روحانیت کارفرما ہے جو بزرگوں کا ادب اور احترام سکھاتی ہیں۔

یورپی اور دیگر انگریز ممالک میں معاشرے کی بنیاد اخلاق و روحانیت کی بجائے ذاتی اور مالی مفاد پر رکھی گئی ہوتی ہے۔ وہاں ہر کمان آخر آکر مالی مفاد پر ٹوٹتی ہے، پیسے کا حصول ہی انکاسب سے بڑا مقصد قرار پاتا ہے اس لیے افراد کے باہمی تعلقات بھی پیسے پر استوار ہوتے ہیں اور جب تک کسی سے مالی مفاد حاصل ہوتا رہے تب تک ہی وہ اس کی کوئی اہمیت ہے لیکن جوں ہی وہ کسی کو مالی فائدہ پہنچانے کے قابل نہ رہے اسے ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا جاتا ہے۔ یوں وہاں بزرگ شہری یا سینئر سیٹیزن کو کوئی اہمیت یا عزت نہیں دی جاتی بلکہ یہ معاشرے کا ایک ایسا طبقہ بن کر رہ جاتے ہیں جو دوسروں سے محض بات کرنے کو ترستے ہیں لیکن کوئی ان سے محبت اور خلوص کے دو بول تک بولنا گوارا نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی ان سے کوئی بات کر لے تو ان کے لیے گویا جہاں بھر کی دولت دامن میں سمٹ آئی اور یہ اس دولت سے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ وقت گزر جائے اور وہ خالی ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنی تحریروں میں ان بزرگوں کی ذہنی اذیت کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک جگہ وہ انگریزی معاشرت کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں۔

> "سمندر کے کنارے بنچوں پر بابے اور بابیاں بیٹھے غم رفتہ کو آواز دے رہے تھے۔ ان سے اگر ہیلو ہیلو کیا جائے تو جان چھڑانی مشکل ہو جاتی ہے۔ کہ وہ تو کسی ذی روح سے گفتگو کے لیے ترسے ہوتے ہیں۔"(۵)

یوں یہ طبقہ جس نے ایک عمر دوسروں کو پالنے پوسنے اور دوسروں کی خدمت میں گزار دی ہوتی ہے وہ بے بسی اور لاچارگی کی تصویر بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور یہ بے بسی و لاچارگی ان کے لیے ذہنی اذیت کا باعث بن جاتی ہے جو آخر کار اپنے آپ یا دوسروں کو نقصان پہنچانے پر منتج ہوتی ہے۔

بزرگ شہریوں سے یہ غفلت صرف دوسروں کے بزرگوں کے لیے ہی نہیں ہوتی بلکہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ ماں اور باپ وہ ہستیاں ہیں جو انسان کے لیے ایک

عظیم نعمت ہوتی ہیں اور یہ ایسی نعمت ہیں جن کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ اولاد بچپن سے لے کر آخر دم تک ان کے احسانات کا شمار نہیں کر سکتی۔ وہ وقت جب انسان بچپن میں اپنا کہا ہوا خود آپ بھی سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے اور انسان کے پاس رونے کے علاوہ اور کوئی ایسا حربہ نہیں ہوتا جس کے ذریعے وہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروالے، اس وقت صرف ماں اور باپ ہی ہوتے ہیں جو اس کے رونے سے اور اس کے منھ سے نکلنے والی دیگر بے معنی آوازوں سے اس کا مدعا سمجھ پاتے اور اس کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں والدین کو بڑا عظیم رتبہ حاصل ہے اور والدین کی نافرمانی یا ان سے بدسلوکی کرنے والوں کے لیے دنیا و آخرت میں ذلت کی وعید سنائی گئی ہے۔ یورپی معاشرے میں والدین کے ساتھ جو سلوک بڑھاپے میں کیا جاتا ہے اس کی ایک جھلک عطاء الحق قاسمی کے ہاں ملاحظہ ہو:

> "ماں پاکستان کی ہو یا انگلینڈ کی اپنے بچوں کے لیے ماں یکساں ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پاکستانی بچے بھی عموماً اپنے والدین کی خدمت اور دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جب کہ مغرب میں بچے والدین سے غافل رہتے ہیں۔ والدین بوڑھے ہو جائیں تو یہ بچے انھیں "اولڈ پیپلز ہوم" میں جمع کرا دیتے ہیں اور رسید حاصل کر لیتے ہیں تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔"(۶)

خاندانی نظام کی ابتری کی اس سے بڑھ کر اور کیا صورت حال ہو گی کہ وہ والدین جن کے طفیل اور جن کی کاوشوں سے وہ اس مقام پر پہنچا آج وہی اس کے لیے ناقابل برداشت بن جاتے ہیں۔ وہ گھر جہاں اس کے والدین نے اسے پالا پوسا ہوتا ہے اسی گھر کے دروازے والدین پر بند کر دیے جاتے ہیں اور انھیں "اولڈ پیپلز ہوم" کی زینت بنا دیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ کل کو انھوں نے بھی اس بڑھاپے کی عمر کو پہنچنا ہے اور پھر یہی سب کچھ ان کے ساتھ بھی ہو گا، یہ عمل رکتا نہیں اور نسل در نسل آگے چلتا چلا جاتا ہے۔ قاسمی صاحب نے صرف اولاد کے رویے کی ہی عکاسی نہیں کی بلکہ اس سے پہلے وہ ماں کے ازلی پیار کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ ماں باپ کی طرف سے اس بارے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوتی کہ پیدا ہونے والا بچہ مشرق کا ہے یا مغرب کا۔ انھیں صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ بچہ ان کا ہے اور وہ اس کے والدین ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماں اور باپ کی شفقت کا رویہ اور اولاد کی خاطر اپنا آرام و سکون ترک کر دینے کا جذبہ ہر معاشرے میں یکساں ملتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے انگریزی معاشرے کا انتہائی قریب سے مشاہدہ کیا ہے اور جب ان کی تحریروں کو پڑھا جاتا ہے تو قاری ایک لمحے کے لیے خود کو بھی اسی مقام پر پاتا ہے جس مقام کی منظر کشی قاسمی صاحب اس کے سامنے کر رہے ہوتے ہیں۔ یوں انگریزی معاشرے کی ایک جھلک ہی نہیں بلکہ پورا منظر نامہ وہ سامنے لا کھڑا کرتے ہیں۔ یوں وہ انگریزی معاشرے کے روشن چہرے سے نقاب کی پرتیں اتارتے چلے جاتے ہیں اور چنگیز سے تاریک تر اندروں سامنے آتا چلا جاتا ہے۔ اور دلچسپ امر یہ ہے کہ قاری کوئی بوجھل پن محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ ایک معمول کی کارروائی کے مطابق ان کی تحریروں کو پڑھتا چلا جاتا ہے اور ان کے فن کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو بہت کم ادیبوں کے حصے میں آیا ہے۔ کسی بھی سماج کی معاشرت کی تعمیر میں جہاں دیگر بہت سے عناصر کارفرما ہوتے ہیں وہاں قانون کی عملداری بھی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ قانون کی عملداری سے معاشرہ درست خطوط پر گامزن رہتا ہے اور سماج میں دوسروں کی حق تلفی میں کمی آتی ہے۔ جو سماج قانون کا احترام کرتا ہے اور قانون پر عمل کرتا ہے وہ بہت جلد ترقی کی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اور قانون سے روگردانی کرنے والے افراد کا سماج ایک ایسی افراتفری کا شکار بنا رہتا ہے جس کے سدھارنے کے لیے کوئی اور آلہ کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔

انگریزی معاشرے نے جو ترقی کی منازل طے کی ہیں اس کی بڑی وجہ ان معاشروں میں قانون کی حکمرانی ہے۔ وہاں قانون بناتے وقت تمام پہلوؤں کو مد نظر رکھا جاتا ہے اور جب کوئی قانون بن جائے تو اسے بغیر کسی تفریق کے تمام افرادِ معاشرہ کے لیے یکساں طور پر لاگو کیا جاتا ہے۔ وہاں اخلاقی اقدار تو زوال پذیر ہوئی ہیں لیکن قانون کی حکمرانی نے ان معاشروں کی ساکھ کو کافی حد تک بحال رکھا ہوا ہے۔ وہاں قانون سب کے لیے ایک ہے اور جو قانون سے روگردانی اختیار کرتا ہے اسے دوسروں کی طرح ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس میں چھوٹے بڑے یا کمزور طاقتور کی کوئی تفریق نہیں۔ اصل حقیقت بھی یہی ہے کہ جہاں قانون کی حکمرانی ہو وہاں انصاف کا چلن عام ہوتا ہے اور معاشرے انصاف کے اصولوں پر کاربند رہ کر ہی ترقی کی منازل طے کرتے ہیں، یورپ اور دیگر انگریزی ممالک کی ترقی میں قانون اور انصاف کی حکمرانی کا بہت بڑا عمل دخل ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں جہاں انگریزی معاشرت کے حوالے سے دیگر بہت سے عناصر کی عکاسی ملتی ہے وہاں انھوں نے اس پہلو پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ عطاء الحق قاسمی نے انگریزی ممالک کا تجزیہ انتہائی غیر جانبداری سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس معاشرے کے صرف منفی

پہلو ہی بیان نہیں کیے بلکہ جہاں انھیں جو بھی مثبت طرز عمل ملا ہے انھوں نے اس کا ذکر بھی کھل کر کیا ہے۔ ذیل میں دیکھیے کہ کس طرح انھوں نے اس معاشرے میں قانون کی حکمرانی اور دیگر مثبت امور کو بیان کیا ہے۔

"سرخ فیتے کا چکر نہیں ہے۔ جو قانون بنایا جاتا ہے اس پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ نہیں کی جاتی۔ معاشی طبقے موجود ہونے کے باوجود غیر طبقاتی فضا ہے۔ یعنی کسی کی عزت نفس کو کچلنے کی پوری آزادی نہیں ہے۔ جہیز کا چکر نہیں ہے۔ دفتروں میں سازشیں ہوتی ہیں مگر ترقی سازش کی بنیاد پر نہیں عموماً میرٹ پر ہوتی ہے۔ دوسروں کے معاملات میں اس کی عدم موجودگی میں تو بات ہو جاتی ہے مگر اس بات کو بنیاد بنا کر کسی کی زندگی حرام نہیں کی جاتی۔ دماغ اگرچہ ذرائع ابلاغ کے مفتوح ہیں مگر بظاہر فکر کی آزادی نظر آتی ہے۔"(۷)

ان باتوں پر غور کیا جائے تو ان میں سے بہت سے امور ایسے ہیں جو اسلام کے اصول معاشرت میں اہم مقام رکھتے ہیں اور ایک ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل کے لیے اسلام نے ان اصولوں کی خاص تاکید کی ہے لیکن اہل مشرق کی اکثریت نے ان اصولوں کو پس پشت ڈال کر اپنی من مانیاں شروع کر دی ہیں جس کی وجہ سے رستے سے بھٹک گئے اور معاشرے میں افراتفری نے جنم لے لیا۔ آج ہمارے ہاں قانون کی حکمرانی چند جگہوں کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی، ہمارے معاشرے میں جتنی ملاوٹ زدہ چیزیں لوگوں کے جسموں میں داخل کی جا رہی ہیں اور ان کے نتیجے میں جتنی بیماریاں اور صحت عامہ کے جتنے مسائل سامنے آ رہے ہیں ان کی کہیں نظیر نہیں ملتی، ہر سال لاکھوں افراد صرف ان ملاوٹ زدہ چیزوں کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہے ہیں جبکہ حضور اکرم ﷺ نے ملاوٹ کرنے والے کے بارے میں سخت وعید فرمائی کہ وہ ہم میں سے ہی نہیں۔

جہیز کے حوالے سے دیکھا جائے تو آج ہمارے معاشرے میں جہیز ایک لعنت بن چکا ہے،۔ صرف اس ایک جہیز کے نہ ہونے کی وجہ سے ہزاروں جوان لڑکیاں ماں باپ کی چوکھٹ پر پڑی عمر گزار رہی ہیں اور کوئی ان کو اپنانے کو تیار نہیں اور اسی جہیز نے معاشرے میں انسان اور خاص طور پر عورت کے مقام کو گرا دیا ہے۔ اب چیزوں کی قدر بڑھ گئی ہے اور انسان کی قدر و اہمیت زوال پذیر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ہمارے ہاں اخلاقی اقدار کا زوال بھی ہو رہا ہے اور مادی اقدار کی اہمیت بڑھتی جا رہی ہے۔

کسی بھی نظام کی کامیابی کا انحصار اس نظام کے اصولوں پر ہوتا ہے۔ ہر نظام میں کام کرنے والے افراد پر اگر ان اصولوں کا اطلاق یکساں کیا جائے تو وہ نظام کامیابی سے اپنی منازل طے کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا ایک اہم فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے نظام کو قابل اور اہل افراد اسی نظام کے اندر سے ہی دستیاب ہوتے رہتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی کے بیان کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انگریزی ممالک میں نظام کے کامیابی سے چلتے رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں ہر کام میرٹ پر کیا جاتا ہے۔ بھرتی کے عمل سے لے کر ترقی کی منازل طے کرتے تک وہاں چاپلوسی، سفارش اور رشوت کی بجائے میرٹ کو سامنے رکھا جاتا ہے اور یہی میرٹ اس نظام کو کامیابی کی طرف لے کر جاتا ہے لیکن اگر میرٹ کو نظر انداز کر دیا جائے تو بہت سے نااہل افراد اس نظام کا حصہ بنتے چلے جاتے ہیں اور آخر کار وہ نظام تباہی کے رستے پر چل نکلتا ہے۔ میرٹ ہی کسی نظام کی کامیابی کی ضمانت ہوتا ہے۔

لفظ میرٹ Merit اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ عام طور پر میرٹ کا معنی اہلیت ہے کہ کسی کام کے لیے جو کم سے کم اہلیت درکار ہو اس پر پورا اترنا میرٹ کہلاتا ہے۔ میرٹ کو قابلیت کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی کام کے لیے کتنا قابل اور اہل ہے۔ اسی طرح بعض اوقات یہی میرٹ سنیارٹی کا درجہ بھی لے لیتا ہے کہ اگر کسی نظام میں ترقی کی بنیاد عرصہ ملازمت میں سنیارٹی ہو تو وہاں میرٹ دیگر شخصی خوبیوں کی بجائے اس کی سنیارٹی ہی گردانا جائے گا، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرٹ کا تعین جن اصول و ضوابط کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے ان اصولوں پر پورا اترنا ہی دراصل میرٹ پر پورا اترنا ہے اور ان اصول و ضوابط کو پورا کرنا کسی بھی نظام میں شامل ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ مغرب میں میرٹ کا لفظ اسی سماجی پس منظر میں استعمال کیا جاتا ہے کہ جس ملازمت یا کسی بھی کام کے لیے جو بھی اصول و ضوابط بنا دیے جاتے ہیں اور جو اہلیت کا معیار مقرر کر دیا جاتا ہے ہر شخص کو اس کی پیروی کرنا ہوتی ہے بصورت دیگر اس نظام سے ان کو نکال باہر کیا جاتا ہے اور ان کی جگہ دوسرے اہل افراد اس نظام کا حصہ بن جاتے ہیں۔ میرٹ کی اس بالادستی سے اس معاشرے میں افرادی قوت کے مسائل پیدا نہیں ہوتے اور ہر شخص اپنے کام سے غرض رکھتا اور اپنے درجے سے اگلے درجے میں ترقی کے لیے خود کو اہل بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے یوں نظام میں بہتری کے آثار پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ نظام سماج میں اپنی ساکھ مضبوط کرتا چلا جاتا ہے۔

انگریزی معاشرے کے ان اصولوں پر سختی سے کاربند ہونے کی وجہ سے وہاں کے سماج میں بہت سی ایسی اقدار جنم لیتی رہتی ہیں جو کسی بھی سماج کی بحالی اور ترقی کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اس سماج میں پیدا ہونے والا مسلمان بچہ مشرق کے مسلمان بچوں کی نسبت اپنے مذہب اور اپنی اقدار پر زیادہ سختی سے کاربند ہوتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سماج میں اقدار مذہب کی بجائے سماج کی بیاد پر رائج پارہی ہوتی ہیں اور وہاں مذہب وملت کی تفریق کے بغیر ہر کوئی ان اقدار کو اپنانے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں اس اہم امر کی طرف بھی کافی رہنمائی کی ہے اور انگریزی سماج کو سمجھنے میں قاری کو خاصی معاونت فراہم کی ہے۔ یورپ کے سماج میں مسلمانوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> "ان میں سے بیشتر کی جڑیں ثقافت اور مذہب میں کافی گہری ہیں۔ مگر صرف اس صورت میں اگر ان کے والدین کو اس میں دلچسپی ہے۔ تمہارے لیے یہ باعثِ حیرت ہوگی کہ یہاں جو مسلمان بچہ مذہب کی طرف راغب ہوتا ہے، وہ پاکستانیوں کے برعکس اپنے کردار میں انتہائی مضبوط ہوتا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا، دھوکا نہیں کرتا، دوغلے پن سے نفرت کرتا ہے اور اردگرد کے ماحول کے شدید دباؤ کے باوجود ایک سچے مسلمان کی تصویر نظر آتا ہے۔" (۸)

انھوں نے مسلمان بچوں کی اسلام اور اسلامی اقدار کی طرف رغبت اور ان پر کاربند ہونے کے لیے ایک اہم امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر ان کے والدین اس میں دلچسپی لیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اقدار اور خاص طور پر مذہبی اقدار بچوں میں والدین کے ذریعے ہی منتقل ہوتی ہیں۔ اگر والدین بچوں کو اسلام کی تعلیمات اور اسلامی اقدار کی طرف راغب کریں گے تو لازمی طور پر بچے اس کی طرف آئیں گے۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ مشرقی معاشرے میں تو اسلام ملتا ہی بچوں کو ماں کی گود سے ہے اور ان کے والدین بھی اسلامی تعلیمات کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ مغرب کا مسلمان بچہ اسلامی اقدار کے زیادہ قریب ہوتا ہے؟

اس سوال کا جواب جاننے کے لیے ہمیں تھوڑی دیر کے لیے دونوں معاشروں پر نظر ڈالنا ہوگی۔ مشرق میں معاشرے کا قیام جہاں اسلام کے نام پر ہے وہاں اسلام صرف پڑھنے لکھنے کی حد تک یا نکاح اور وفات کے وقت تک کے لیے محدود ہے عملی طور پر معاشرے میں اسلام کی اقدار کو نظر انداز کرتے

ہوئے جھوٹ، ریاکاری، دھوکا، فریب اور ناانصافی کا راج نظر آتا ہے۔ اب ایسے معاشرے میں جب ایک بچہ اپنے شعور کی عمر کو پہنچتا ہے تو وہ اس معاشرے کے رنگ میں رنگتا چلا جاتا ہے اور اسلامی و اخلاقی اقدار سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ دوسری جانب مغرب کے معاشرے میں وہ اقدار جو اسلامی تعلیمات کی روح ہیں مثلاً سچائی، کام سے لگن اور دیگر ایسی اقدار جب ایک بچہ اسلام کے بارے میں ان چیزوں کو جان جاتا ہے اور معاشرے میں قدم رکھتا ہے تو وہی تعلیمات دن رات عملی طور پر اس کے سامنے ہوتی ہیں تو اس کو نہ صرف ان پر یقین پختہ ہوتا چلا جاتا ہے بلکہ وہ اس کی عملی زندگی میں رواج پاتی چلی جاتی ہیں، اور جیسا کہ قاسمی صاحب نے لکھا ہے کہ اگر والدین اس بچے کی رہنمائی کرتے رہیں تو وہ اسلامی تعلیمات کی پیروی میں پوری توجہ سے مگن ہو جاتا ہے لیکن اگر والدین اس کی رہنمائی نہ کریں تو پھر یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ اس معاشرے کی چکا چوند میں پڑ کر رستے سے بھٹک بھی سکتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں انگریزی معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے اس امر کی طرف بھی روشنی ڈالی ہے کہ انگریزی معاشرے میں پروان چڑھنے والے بچوں اور مشرقی معاشرے کے بچوں میں اسلام کی طرف رغبت کے حوالے سے کیا فرق پایا جاتا ہے اور بچے جو فطری طور پر دین اسلام پر پیدا ہوتے ہیں وہ آگے چل کر معاشرے کا سامنا کس انداز میں کرتے ہیں۔ اپنے سفر نامے "گوروں کے دیس میں" میں لکھتے ہیں۔

> "برطانیہ میں پیدا ہونے والی نئی نسل کو ہم اپنے سے بہتر مسلمان بنا سکتے ہیں کیوں کی یہاں پر جو بچہ مذہب کی طرف راغب ہوتا ہے وہ مذہب کی صحیح اسپرٹ کے مطابق اپنی شخصیت کی تعمیر کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں منافقت اور دو عملی نہیں پائی جاتی۔ یعنی ایسا نہیں کہ وہ نماز بھی پڑھتا ہو اور جھوٹ بھی بولے بلکہ اس کی دنیا اس کے دین کے عین مطابق ہو جائے گی۔"(۹)

دین کی عملی تصویر ان بچوں کی زندگی میں نظر آنے کی بڑی وجہ وہاں کے معاشرے میں سچائی اور دیانت داری ہے۔ بچہ جس معاشرے میں رہے گا لازمی طور پر وہاں کے اثرات قبول کرے گا۔ یہی چیز بچوں کی شخصیت میں نکھار یا بگاڑ پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

مشرقی اور مغربی معاشروں میں جو بنیادی فرق ہے وہ نظریات کا ہے، مشرقی معاشرہ اپنے نظریات پر قائم ہے جب کہ مغرب کے ہاں قومیت اور وطنیت کے تصورات رائج ہیں، جب نظریات پر قومیں بنتی ہیں تو ان کا تصور وسیع ہوتا ہے وہ جغرافیائی حدود سے ماورا ہوتی ہیں اور ان کے نظریات ان کی اخلاقی تربیت بھی

کرتے ہیں اور ان کو رہنمائی بھی فراہم کرتے ہیں جس کی وجہ سے وہ سماج اعلیٰ اخلاقی اقدار کا حامل بنتا چلا جاتا ہے اور اس سماج کی اپنی معاشرت اور ثقافت کے ساتھ وابستگی نہ صرف گہری ہوتی چلی جاتی ہے بلکہ وہ اس ثقافت کا اظہار بھی یوں کرتے ہیں کہ سماج میں مثبت سرگرمیاں فروغ پاتی ہیں۔

دوسری طرف انگریزی معاشرے کو دیکھا جائے تو اس معاشرے کی بنیاد قومیت اور وطنیت کے تصور پر قائم ہے جس کی وجہ سے اس تصور میں عالمگیریت نہیں اور یہ تصور معاشرے میں اعلیٰ اقدار کو بھی رواج نہیں دے سکتا جس کی وجہ معاشرہ اخلاقی حوالے سے بدحالی کا شکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں مادیت کا فروغ ہوتا ہے جبکہ روحانیت اس معاشرے سے رخصت ہو جاتی ہے۔ آج ہم اپنے گردوپیش میں کتنے ہی ایسے مغرب زدہ یا مغرب سے مرعوب لوگوں کو دیکھتے ہیں جنہوں نے اچھے مستقبل کی خاطر مغرب کا رخ کیا اور وہاں جا بسے یا کسی بھی طرح اس معاشرے کو اپنا لیا، جس کے نتیجے میں وہ مادی طور پر تو شاید کچھ خوش حالی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہوں لیکن روحانی واخلاقی سطح پر وہ زوال کا شکار ہو کر رہ گئے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ اس معاشرے کی وہ ظاہری چکا چوند ہے جو دور سے تو آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے لیکن حقیقت میں اس میں کچھ بھی نہیں بلکہ وہ ایک سراب ہے جس کے پیچھے انسان جتنا دوڑتا چلا جاتا ہے وہ اس کی نظروں کو اتنا ہی دھوکا دیتے ہوئے اس سے دو آگے کو بھاگتا چلا جاتا ہے اور انسان آخر میں تھک ہار کر خالی ہاتھ بیٹھ جاتا ہے۔ یہی کچھ مغربی معاشرے کی چکا چوند کے پیچھے بھاگنے والوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

مشرق کا اپنا ایک سماجی پس منظر ہے جو اخلاقی اقدار کا حامل ہے۔ اس سماج کا خاندانی نظام معاشرے میں بڑے چھوٹے اور اپنے پرائے میں تمیز سکھانے کے ساتھ ساتھ معاشرے میں مختلف رشتوں کے تقدس کا باعث بھی بنتا ہے جب کہ مغربی نظام میں سب سے کاری ضرب اسی خاندانی نظام پر ہی پڑی ہے، وہاں ایک طرف تو خاندانی نظام نیست ونابود ہو چکا ہے تو دوسری طرف مختلف رشتوں کا تقدس بھی مجروح ہو کر رہ گیا ہے جس کی وجہ سے وہاں بسنے والے والدین کی پریشانی قابل رحم حد تک کر بڑھ چکی ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے انگریزی معاشرے کے بارے میں اپنی تحریروں میں آگاہی دلانے کے ساتھ ساتھ اس اہم امر کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ جو لوگ مشرق کو پسماندہ خیال کر کے مغرب کی طرف رجوع کرتے ہیں وہ حقیت میں اپنے نظریے کے منکر ہو کر رہ جاتے ہیں، وہ نظریہ جس نے اس قوم کو صدیوں کی غلامی کے بعد انگریز کے شکنجے سے آزادی عطا کی تھی اس کا انکار کر کے خود کو دوبارہ انہی کی غلامی میں دھکیلنے

والے حقیقت میں اپنے مستقبل سے ناآشنا ہیں اور صرف مادیت کو ہی مستقبل قرار دے کر دھوکے کا شکار ہورہے ہیں۔ایک جگہ اسی صورت حال کی عکاسی یوں کرتے ہیں۔

"خود کو امریکی یا یورپی معاشرے کے غلبے کے سپرد کر دینا میرے نزدیک پاکستان بننے کے بعد تصور پاکستان کے خلاف ووٹ دینا ہے۔اور اس کے نتائج یورپ اور خصوصاً امریکہ میں دیکھے جاسکتے ہیں جہاں پاکستانی والدین کے لیے پھولوں کی سیج کانٹوں کا بستر بنی ہوئی ہے۔"(۱۰)

یہ پھولوں کی سیج ایک ایسا ہی سراب تھا جس کی تقلید میں پاکستانی والدین اپنے وطن کے ساتھ ساتھ اپنی خاندانی روایات، سماجی برتری اور اخلاقی اقدار سے دور ہوتے چلے گئے لیکن وہ سراب ان کے ہاتھ نہ آنا تھا نہ ہی آیا یوں ان کی حالت ایک ایسے شخص کی سی ہو کر رہ گئی ہے جو سب کچھ لٹانے کے باوجود کچھ بھی حاصل نہیں کر سکا اور وہ اولاد جس کی خاطر اس نے اس دیار غیر کو اپنا مسکن بنایا تھا وہی اولاد آج اس کا ٹھکانہ "اولڈ پیپلز ہوم" قرار دے رہی ہے۔یہ حقیقت میں پھولوں کی سیج کے کانٹوں کے بستر میں تبدیل ہونے کا عمل ہے جس میں پڑ کر پاکستانی والدین نہ صرف اپنی اقدار اور اپنے سماج سے دور ہوئے بلکہ اسی نظام کی وجہ سے وہ اب اپنی اولاد سے بھی دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔یوں وہ مغربی معاشرہ جس میں بستے وقت وہ بہت سے سہانے خواب آنکھوں میں سجائے وارد ہوئے تھے ایک ایک کر کے وہ تمام خواب ختم ہوتے چلے جارہے ہیں اور حقائق سامنے آکر ایک گھمبیر صورتحال اختیار کرتے چلے جارہے ہیں۔عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں اس امر سے بھی خاصی آگاہی ہوتی ہے۔

انگریزی معاشرے نے انسان کو محض کمائی کا ایک پرزہ سمجھ لیا ہے اور انسان کی وقعت اور قدرومنزلت محض مالی مفاد کے زاویے سے ناپی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہاں انسان اشرف المخلوقات ہونے کی بجائے مخلوقات کا غلام بنا نظر آتا ہے۔اس معاشرے میں انسان مشینوں کا غلام ہے اور اس کی حرکات و سکنات تک مشینوں کی مرہون منت ہیں۔وہ اپنی مرضی اور اپنی آزادی سے کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔ اس کے جاگنے سونے اور دیگر معاملات تک مشینوں کی مرہون منت ہو کر رہ گئے ہیں یہ کتنی ہی بدنصیبی کی بات ہے کہ انسان جسے دنیا میں اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ بنا کر بھیجا گیا تھا وہ مشینوں کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔وہی مشینیں جن کی تخلیق انسان کے اپنے ہاتھوں سے ہوئی ہے وہی مشینیں آج انسان پر حکومت کر رہی ہیں اور انسان ان کی مرضی کے مطابق اپنی حرکات وسکنات کو اختیار کرنے پر مجبور ہو چکا ہے۔

انگریزی معاشرے میں انسان جب مالی مفادات کی دوڑ میں لگا تو پھر اس دوڑ میں وہ دھنستا ہی چلا گیا۔ وہ تصور بے گانگی کا عملی نمونہ بن کر رہ گیا، اپنی ذات کا عرفان اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ محض مالی فائدے کا اسیر ہو کر رہ گیا اس اسیری نے اسے مالی فائدہ تو کیا بہم پہنچایا الٹا اس سے اس کی اپنی ذات تک چھین لی اور وہ ایک مشینی پرزے کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا اور صورت حال یہاں تک پہنچ گئی کہ جب تک اس مشینی پرزے کی ضرورت رہتی ہے اسے معاشرے اور سماج کا ایک رکن سمجھا جاتا ہے لیکن جونہی وہ ایک مشینی پرزے کے طور پر کام کرنے کے قابل نہیں رہتا اسے معاشرے سے ہی نکال باہر کر دیا جاتا ہے۔ وہاں معاشرے میں جو رعنائی اور چکاچوند نظر آتی ہے اس کی ظاہری صورت حال سے اگر نقاب سرکایا جائے تو اندر سے تصویر کا جو دوسرا رخ سامنے آتا ہے وہ انتہائی گھمبیر اور ناقابل دید ہے۔ عطاء الحق قاسمی کا اعجاز یہ ہے کہ انہوں نے انگریزی معاشرے کی رعنائی والے رخ سے نقاب سرکا کر اس کے اندر سے ان کا وہ وجود برآمد کر کے قارئین کے سامنے پیش کیا ہے جو حقیقت میں چنگیز سے تاریک تر ہے۔ وہاں زندگی کی رعنائی محض دکھلاوے کی حد تک رہ گئی ہے جب کہ انسان حقیقی خوشی اور مسرت سے کوسوں دور ہو چکا ہے اور ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ انسان کا فطرت سے اور خود اپنے آپ سے دوری کا یہ فاصلہ بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے اور انسان تمام تر رعنائیوں میں رہتے ہوئے اندرونی طور پر تنہائی اور بیگانگی کی کیفیت میں مبتلا ہو چکا ہے۔ یہ انگریزی معاشرے کا وہ المیہ ہے جو تصویر کے دوسرے رخ میں پنہاں ہے۔ عطاء الحق قاسمی تصویر کا یہی دوسرا رخ سامنے لاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "وہاں کے مقامی لوگ زندگی کی تمام چکاچوند کے باوجود زندگی کی حقیقی خوشیوں کے لیے ترسے ہوئے ہیں۔ وہاں انسان مشین میں موبل آئل کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ ان کی زندگیاں ماڈرن "سود خور پٹھانوں" کی ماہانہ اقساط کے شکنجے میں کسی ہوئی ہیں۔ ان کی آزادیاں ذرائع ابلاغ کی برین واشنگ کی غلام ہیں، وہاں کا معاشرہ جنت کا پبلسٹی ڈیپارٹمنٹ ہے جو دل خوش کن مناظر کی جھلک دکھانے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ کے گہرے غاروں میں دھکیل دیتا ہے۔ یورپی اور امریکی معاشرے کی چیخیں سننا ہوں تو وہاں کے ادیبوں کی تحریروں میں سنیں۔"(۱۱)

یورپی اور امریکی معاشرے کی یہ چیخیں نہ صرف وہاں کے ادیبوں کی تحریروں میں سنائی دیتی ہیں بلکہ اس معاشرے میں بسنے والے افراد دن رات ایک دوسرے کی یہ چیخیں سنتے ہیں لیکن وہ اس سماج میں اس قدر

مجبور ہو کر رہ گئے ہیں کہ اس سے باہر نکلنے کی کوئی راہ انھیں سجھائی نہیں دیتی اور وہ مشینی پرزے بن کر رہ گئے ہیں۔ سماجی ابتری کی جو صورت حال اس معاشرے میں بن چکی ہے وہ انتہائی گھمبیر ہو چکی ہے اس سماج میں انسان کی قدر و منزلت مشینی حوالے سے جانچی جانے لگی ہے اور جو انسان جتنا زیادہ مشین کا ساتھ دے سکتا ہے اتنی ہی اس کی سماج میں حیثیت ہے ورنہ وہ ایک بے کار پرزہ سمجھ کر معاشرے سے الگ کر دیا جاتا ہے۔

انگریزی رسم ورواج کی عکاسی:

عطاء الحق قاسمی کی اردو نثر میں انگریزی رسم ورواج کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ انھوں نے انگریزی معاشرے کی جو تصویر اپنے سفر ناموں میں پیش کی ہے اس میں انگریزی سماج کے رسم ورواج کو ایک خاص انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ انگریزی رسم ورواج کو بیان کرتے وقت انھوں نے انگریزی سماج کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ ان کے ہاں گھروں کی تعمیر سے لے کر سماج کے زندگی گزارنے کے مختلف انداز اور رسوم کا بیان ملتا ہے۔

انگریزی معاشرت میں گھروں کی تعمیر کرتے وقت مشرقی انداز تعمیر کو مد نظر نہیں رکھا جاتا، کیوں کہ پردے کا تصور اس معاشرے میں نہیں پایا جاتا۔ اس لیے گھروں کی تعمیر کرتے وقت پردے کے خیال کو سامنے نہیں رکھا جاتا نہ ہی خلوت کا کوئی خاص انتظام کیا جاتا ہے اور یہ امر ان علاقوں میں زیادہ پایا جاتا ہے جہاں کے لوگ زیادہ عیش پرست ہیں۔ وہاں گھروں کے اندر تو مختلف سہولیات کا انتظام کیا جاتا ہے لیکن گھروں کو گھروں سے جدا کرنے کے لیے محض ایک باڑ ہی کافی سمجھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس معاشرے میں رہنے والے دیگر لوگوں کا طرز عمل کیا ہوتا ہے قاسمی صاحب کے طنزیہ قلم کی کاٹ اس کو بھی عیاں کرتی ہے۔

> "گراؤنڈ فلور میں ڈرائنگ روم، ٹی وی لاؤنج اور کچن! گھر کے پچھواڑے میں ایک لان برابر والے گھر کے لان سے علیحدہ کرنے کے لیے لکڑی کی چھوٹے قد کی باڑ، جس کے آر پار دیکھا جا سکتا ہے۔ گرمیوں میں میمیں ادھورے کپڑوں میں باہر آ کر لیٹ جاتی ہیں اور ان کے ہمسائے پورے کپڑے پہنے، کالی عینک لگائے دھوپ سینکنے اپنے لان میں آن کھڑے ہوتے ہیں۔"[۱۲]

"میم" انگریزی کا ایسا لفظ ہے جو مختلف جگہوں پر مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ میڈم سے ہے۔ انگریزی میں "میم" بچوں کی زبان میں ماں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ میم کے علاوہ ماں

کے لیے موم(Mom)یامام بھی بولا جاتا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے ہمارے معاشرے میں میم کا لفظ سکول کے بچے اپنی استانی کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔اس لفظ کے استعمال کے جتنے بھی طریقے ہیں ان سب میں ایک بات مشترک ہے کہ یہ لفظ ایسی عورت کیلیے بولا جاتا ہے جو جاذب نظر اور پر کشش ہو۔ عطاء الحق قاسمی نے مغربی عورتوں کے لیے "میمیں" کا لفظ بھی ان کی اسی خاصیت کو سامنے رکھتے ہوئے استعمال کیا ہے۔اور تحریر میں "میم" کا لفظ پڑھتے ہی قاری کا ذہن اس منظر نامے میں پہنچ جاتا ہے جہاں مغربی عورت مختصر لباس پہنے دعوتِ نظارہ دیتی نظر آتی ہے، یوں اس لفظ کا اپنا ثقافتی منظر نامہ اس لفظ کے استعمال سے تحریر کو زیادہ پر اثر بنا رہا ہے۔ اگر یہاں پر "میمیں" کی بجائے "انگریز عورتیں" کے الفاظ استعمال کیے جاتے تو قاری تحریر کی اس لذت سے ناآشنا ہی رہتا جو مغربی معاشرے کی جھلک دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔یوں اس لفظ کے استعمال سے عطاء الحق قاسمی نے قاری کو مغربی معاشرے کی وہ جھلک دکھائی ہے جس میں ان کا "چہرہ روشن" نظر آتا ہے، اندروں کی تاریکی ان لوگوں کے افعال سے سامنے آرہی جو کالی عینکیں لگائے لان میں کھڑے دھوپ سینک رہے ہوتے ہیں۔یوں ظاہر ہوتا ہے کہ قاسمی تصویر کا ایک رخ ہی سامنے نہیں لاتے بلکہ مغربی معاشرت کی عکاسی کرتے وقت انھوں نے ہر پہلو کو سامنے رکھا اور قارئین کو دکھایا ہے۔

گراونڈ فلور، کچن، لان، ڈرائینگ روم کے الفاظ متبادل اردو میں موجود بھی ہیں اور مستعمل بھی لیکن ان الفاظ کو اسی طرح انگریزی میں ہی بیان کرنے سے تحریر میں مغربی معاشرت کی جھلک زیادہ واضح نظر آنے لگی ہے اور قاریوں محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اس جگہ پر کھڑا ایک ایک چیز کا نظارہ کر رہا ہے۔

کسی بھی سماج کی عکاسی کرتے وقت جن امور کو بطورِ خاص مدّ نظر رکھا جاتا ہے ان میں سے ایک اہم لباس ہے۔ ملبوسات نہ صرف کسی معاشرے کی عکاسی میں معاون ثابت ہوتے ہیں بلکہ دوسرے معاشروں سے ان افرادِ معاشرہ کو ایک الگ پہچان عطا کرنے میں بھی ملبوسات کا خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔یہ پہچان مختلف رسم ورواج کی بھی عکاسی کرتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سماج میں مختلف رسوم ورواج میں مختلف طرح کے ملبوسات استعمال ہوتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک ہی معاشرے میں رہنے والے لوگ ایک وقت میں مختلف لباس زیب تن کر رہے ہوتے ہیں۔ ہر معاشرے کا اپنا ایک خاص لباس ہوتا ہے جو اس کی ثقافتی اور سماجی پہچان کرواتا ہے۔ لیکن اس مخصوص لباس جسے ہم قومی لباس کہہ سکتے ہیں اس کی موجودگی میں دیگر بہت سے ملبوسات اس معاشرے کے لوگ استعمال کر رہے ہوتے ہیں لیکن ان میں غالب

اکثریت کا رجحان اسی قومی لباس کی طرف ہی ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی سیاح یا مصنف کسی سماج کی عکاسی کا بیڑہ اٹھاتا ہے تو وہ ملبوسات کے ذکر بغیر اپنا کام مکمل طور پر سامنے نہیں لا سکتا۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنی تحریروں میں انگریزی سماج کے رواج کی عکاسی کرتے وقت امر کو بھی خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں کے دوران میں مغربی ملبوسات کو جس انداز میں دیکھا اسی طرح بیان کیا ہے۔ ان کی تحریر سے مغربی رسوم و رواج اور خاص طور پر ملبوسات کے حوالے سے مغربی ثقافت سے خوب آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ایک سفر نامے میں مغربی ملبوسات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "سکرٹ، جین، ہاٹ پینٹ، اور دوسرے ملبوسات یا غیر ملبوسات سے خود کو آراستہ کیے ہوئے "میمیں" زلفیں کاندھے پر لہرائے اور اونچی ہیل کی جوتی سے ٹک ٹک کی آواز پیدا کرتی ہوئی تیزی سے برقی سیڑھیوں کی طرف لپک رہی تھیں۔"(۱۳)

قاسمی صاحب کے بیان سے نہ صرف ملبوسات کے بارے میں آگاہی حاصل ہوتی ہے بلکہ وہ منظر نامے کو یوں بیان کرتے ہیں قاری اسی منظر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ "گوروں کے دیس میں" انھوں نے متعدد جگہ اس طرح کے مناظر بیان کیے ہیں جن کو پڑھنے سے قاری خود کو اس منظر میں پاتا اور مصنف کے ساتھ ساتھ سفر کرتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے لباس خاص طور پر جینز، سکرٹ وغیرہ کا ذکر اس انداز میں کیا ہے کہ پڑھنے والا ایک خاص لذت حاصل کرنے لگتا ہے، یہی قاسمی صاحب کا بڑا فن ہے کہ وہ کسی لمحے بھی قاری کو تحریر سے جدا نہیں ہونے دیتے۔

ملبوسات کے ساتھ ساتھ انھوں نے انگریز "میموں" کی چال ڈھال کو بھی یوں بیان کیا ہے گویا وہ ایک حقیقی منظر قاری کے سامنے پیش کر رہے ہوں۔ بعض جگہ انھوں نے انگریزی الفاظ سے دامن بچا کر ان کی جگہ اردو کے الفاظ بھی لگائے ہیں، جبکہ اس جگہ انگریزی کے الفاظ ہمارے ہاں بھی عام مستعمل ہیں۔ اس کی ایک مثال مندرجہ بالا بیان میں دیکھی جا سکتی ہے جہاں وہ "برقی سیڑھیوں" کا ذکر کرتے ہیں جبکہ برقی سیڑھیوں کی جگہ "لفٹ" وغیرہ کے الفاظ اردو میں بلکہ ان مقامات پر جہاں وہ سیڑھیاں لگی ہوں وہاں پنجابی بولنے والے بھی ان کے لیے لفٹ یا اس طرح کے دیگر انگریزی الفاظ ہی استعمال کرتے ہیں لیکن قاسمی صاحب نے اس مقام پر انگریزی کی بجائے اردو کے الفاظ کا استعمال کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنی تحریر کو پر وقار بنانے میں انگریزی الفاظ کے محتاج نہیں بلکہ ان کا اپنا ایک خاص انداز تحریر وہ اس میں جہاں مناسب

سمجھتے ہیں وہ لفظ استعمال کرتے ہیں اور ان کے استعمال کیے ہوئے الفاظ برمحل ہوتے ہیں کہیں کوئی لفظ ٹھونسا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔

قاسمی صاحب ملبوسات کا ذکر کرتے وقت تمام ثقافتی امور کو بھی خاص طور پر سامنے رکھتے ہیں، وہ نئی اور پرانی نسل کے ملبوسات میں آنے والی تبدیلی کو دیکھتے ہوئے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی ملبوسات کے ساتھ مشرقی ملبوسات پر بھی نظر رکھتے ہوئے ایک طرح کا تشبیہاتی انداز بھی اختیار کرتے چلے جاتے ہیں اور قاری کو چونکانے کی بجائے اسے لطیف انداز میں حقیقت سے آشنا کرتے ہیں۔ چوڑی دار پاجامہ مشرقی معاشرے کا بھی ایک مقبول اور عام لباس ہے۔ ہمارے معاشرے میں لڑکیاں اس کا استعمال مختلف ملبوسات کے ساتھ کرتی ہیں جبکہ مغربی معاشرے میں اسی سے ملتی جلتی جین بھی استعمال کی جاتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی مغربی معاشرت کی عکاسی کرتے ہوئے ان کا ذکر یوں کرتے ہیں

> "چوڑی دار پاجامے کی طرح ایک چوڑی دار جین بھی ہوتی ہے۔ جو نئی نسل کی مغربی لڑکیاں پہنتی ہیں۔ یہ لوگ ہر میدان میں ہم سے آگے ہیں۔ انھوں نے اس چوڑی دار جین کے لیے بھی کوئی تکنیک ایجاد کی ہوگی۔"(۱۴)

اس بیان سے ایک اور بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی سماج کی رسوم ورواج اور ثقافت جامد نہیں ہوتی بلکہ ایک نسل سے دوسری نسل تک سفر کرنے کے دوران میں اس میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوتی چلی جاتی ہیں۔ بہت سے انداز زندگی جو پرانی نسل میں رائج ہوتے ہیں وہ نئی نسل کے ہاتھوں متروک ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ بہت سی نئی چیزیں معاشرت اور ثقافت کا حصہ بنتی چلی جاتی ہیں۔ ایک کہنہ مشق ادیب جب کسی سماج کی معاشرت اور ثقافت پر قلم اٹھاتا ہے تو وہ اس امر کا خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھتا ہے کہ نسل در نسل آنے والی ان تبدیلیوں کو بھی سامنے لائے اور سماجی وثقافتی ارتقا کو مد نظر رکھے، صرف اسی صورت میں قارئین کو وہ درست انداز میں اس سماج کے بارے میں معلومات فراہم کر سکے گا۔ عطاء الحق قاسمی کی تحریریں اس لیے بھی اہم اور قابل قدر گردانی جاتی ہیں کہ وہ اس سماجی اور ثقافتی ارتقا کو خاص طور پر مد نظر رکھتے ہیں اور قاری کو نسل در نسل تبدیل ہوتی ثقافتی وسماجی اقدار سے آگاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ انگریزی معاشرے میں جو ایک اور منفی رجحان پروان چڑھ رہا ہے اور اس معاشرے کو گھن کی طرح کھائے جا رہے رہا ہے، وہ منشیات کا رجحان ہے۔ یہ رجحان اس سماج میں ایک رواج کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ہر سال لاکھوں انسانی جانیں اس منشیات کے قبیح عمل کا شکار ہو کر زندگی کا چراغ گُل کر بیٹھتی ہیں۔ مشرقی اور مغربی معاشرے

میں اس کی نوعیت خاصی مختلف ہے۔ مشرقی معاشرے میں وہ طبقہ جو معاشرے سے کٹ کر رہ جاتا ہے اور اخلاق رذیلہ کا شکار ہو جاتا ہے وہ منشیات کی لعنت اختیار کر لیتا ہے اور یوں اپنی زندگیوں کے ساتھ ساتھ معاشرے کے دیگر افراد کی زندگیوں کی بربادی کا سامان بھی کرتے ہیں۔ لیکن مغرب میں دیکھا جائے تو منشیات کی لعنت اس قدر عام ہو چکی ہے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے اور باشعور افراد بھی اس کا شکار ہو رہے ہیں۔

ہمارے ہاں تعلیمی اداروں میں بھی منشیات کا استعمال ہوتا ہے لیکن اس کی نوعیت انفرادی ہے، نشے کا عادی کوئی طالب علم یا فرد اپنی تسکین کی خاطر استعمال کرتا ہے اور وہ بھی اعلیٰ سطح کے تعلیمی اداروں میں۔ ابتدائی و ثانوی سطح کے تعلیمی اداروں میں ہمارے ہاں منشیات کا کوئی تصور نہیں لیکن مغربی معاشرے میں ہر سطح کے اداروں میں یہ لعنت رواج پا چکی ہے اور بڑے فخر سے استعمال کی جاتی ہے۔ انگریزی معاشرے میں منشیات کے استعمال کے بارے میں عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں۔

> "امریکہ کے تعلیمی ادارے ایک ایسے طوفان کی زد میں ہیں، جس سے بچاؤ کی فی الحال کوئی ٹھوس صورت نظر نہیں آتی، یہ طلبہ و طالبات میں منشیات کا روز افزوں استعمال ہے۔ شراب نوشی کے علاوہ ہیروئن اور ماوانا وغیرہ امریکہ کی نئی نسل کے رگ وپے میں سرایت کر گئے ہیں۔ اور اس سے سکولوں کے ننھے منے بچے بھی محفوظ نہیں رہے۔ فینکس کے ایک ویسٹ ہائی سکول ہی میں دسویں جماعت کی ایک طالبہ کو اپنے ایک سوال کے جواب میں جب یہ بتایا گیا کہ ہمارے سکولوں میں بچے شراب نوشی نہیں کرتے تو پوری کلاس نے سیٹیاں بجا کر اس پر حیرت کا اظہار کیا بلکہ لگتا تھا انہیں ہمارے بچوں کی محرومی پر بہت ترس آیا ہے۔"[۱۵]

اس اقتباس سے اس معاشرے میں منشیات کے استعمال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ معاشرے کے وہ طلبا جنھوں نے آگے چل کر معاشرے میں مثبت اقدار کو فروغ دینا ہوتا ہے اور ایک مفید اور کارآمد شہری بننا ہوتا ان کو ابتدا سے ہی منشیات کی لت لگادی جاتی ہے اور یہ منشیات پھر ان کی طبیعت کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے لوگ ساری عمر اخلاق رذیلہ سے دامن نہیں بچا سکتے اور معاشرے میں منفی رجحانات پروان چڑھتے چلے جاتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی نے اس معاشرے میں منشیات کی لعنت کے استعمال کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ انھوں اس امر کو بیان کرتے وقت ایک ایسا انداز اختیار کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشیات کا

استعمال اس معاشرے میں دیگر اشیائے خورد ونوش کی طرح کیا جاتا ہے اور وہ لوگ اس کے استعمال کو زندگی کی ایک بنیادی ضرورت سمجھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جب ایک تعلیمی ادارے میں طلبا کو علم ہوتا ہے کہ مشرقی معاشرے کے طلبا شراب نہیں پیتے تو وہ اس پر بڑے تعجب کا اظہار کرتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ امر ان کے لیے اس لیے بھی باعث حیرت ہوتا ہے کہ جس سکول کے بچے شراب نہیں پیتے وہ پھر کھاتے کیا ہوں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس انگریزی معاشرے میں تعلیمی اداروں میں جنسی تشدد، مار پیٹ اور بربریت کے جتنے مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں مشرقی اداروں میں ان کی شرح نہ ہونے کے برابر ہے، اس کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ امریکہ اور دیگر انگریزی معاشروں میں منشیات کی عادت نے اس معاشرے کے طلبا اور نوجوانوں کے ذہنوں سے اخلاقیات کو نکال باہر کیا ہے جس کی وجہ سے اس معاشرے میں عدم برداشت کے تصور نے فروغ پایا ہے اور اسی عدم برداشت کی وجہ سے معاشرے میں تشدد، جنسی جرائم اور دیگر منفی سرگرمیوں کو فروغ ملا ہے، یوں اس معاشرے نے اپنی بدحالی کا سامان خود کیا ہے اور تعلیمی اداروں میں منشیات کے عام استعمال کی وجہ سے معاشرے کے مفید ذہن پراگندگی کا شکار ہوتے چلے جارہے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفرناموں میں جہاں انگریزی معاشرے کے دیگر بہت سے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے وہاں انہوں نے اس امر کو بھی بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ جس معاشرے کی تصویر کشی کرتے ہیں وہاں کے تمام اسرار و رموز اور مثبت و منفی پہلوؤں کو سامنے لاتے ہوئے انتہائی غیر جانب داری کے ساتھ اس کا تجزیہ پیش کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں اس معاشرے کی معاشرت اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ ساتھ عیاں ہوتی نظر آتی ہے۔منشیات کی لعنت نے اس معاشرے کو اخلاقی حوالے سے جس طرح تباہ کر کے رکھ دیا ہے اس کی جھلک عطاء الحق قاسمی کے ان سفرناموں میں دیکھی جاسکتی ہے جو انھوں نے ان ممالک کے اسفار کے بعد اپنے مشاہدات قلم بند کرنے کے لیے تحریر کیے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی نے معاشرے کی سماجی صورت حال کی اس ابتری کو بڑے بہترین انداز میں پیش کیا ہے کہ یورپی سماج ظاہر سے بہت خوب صورت ہے لیکن اس خوب صورتی میں پائیداری نہیں بلکہ اس کی دوسری طرف انسانیت حقیقی خوشیوں کے لیے سسکتی نظر آتی ہے یوں یورپی سماج ابتری کی آخری حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔

دوسری طرف اس سماج کے ذرائع ابلاغ ہیں جو ظلم ڈھا رہے ہیں۔ وہاں کے انسان کا جسم تو مشینوں کا غلام ہو کر رہ گیا ہی ہے ان کے ذہن ذرائع ابلاغ نے فتح کر لیے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ذرائع

ابلاغ کے رحم و کرم پر آ گئی ہیں۔ ذرائع ابلاغ جو دکھاتے اور بتاتے ہیں اس سماج کے باشندے اسی پر یقین لانے اور اس کے مطابق اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے پر مجبور ہیں یوں جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی بھی اس سماج کے باشندوں کا مقدر بن چکی ہے اور یہی وہ ذہنی اور جسمانی غلامی تھی جس سے نجات حاصل کرنے کے لیے نظریہ پاکستان کا پرچار کیا گیا اور آزادی حاصل کی گئی لیکن آج مشرق سے بیزار افراد جب مغرب میں جابسیرا کرتے ہیں تو لاشعوری طور پر اسی ذہنی اور جسمانی غلامی کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔

یورپی اور امریکی معاشرے میں مقامی افراد جس غلامی اور ابتری کا شکار ہیں وہاں بیرون ملک سے جانے والے بعض افراد ایسے بھی ہیں جو ان ابتر حالات میں بھی نہ صرف اپنی تہذیب و ثقافت پر جمے نظر آتے ہیں بلکہ وہ وہاں اسلامی تہذیب، اسلامی تشخص اور اسلامی ثقافت کو رواج دینے کی کوششوں میں بھی مصروف ہیں جس کے نتیجے میں وہاں اسلام کی راہ ہموار ہو رہی ہے اور ہر سال وہاں اسلام پسندوں اور اسلام قبول کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کو ایک نظریہ حیات کے طور پر قبول کیا ہے اور اپنی زندگیوں میں اس کا عملی نفاذ کیا ہے، انھوں نے اسلام کی اعلیٰ اخلاقی اقدار کو نہ صرف اپنایا بلکہ ان کو رواج دینے میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان لوگوں میں اکثریت ان افراد کی ہے جنہوں نے اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ پاکستان میں گزارا ہوتا ہے اور پھر امریکہ یا یورپ میں منتقل ہو گئے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے آباؤ اجداد اسلامی ثقافت سے وابستہ رہے ہوتے ہیں یوں اسلامی ثقافت ان کی فطرت میں شامل ہوتی ہے۔ یہی فطرت ان کو اسلام اور اسلامی ثقافت کی ترویج پر اکساتی ہیں کیوں کہ وہ اپنی اولاد کو اس سماج میں منتقل کر چکے ہوتے ہیں اور اب انھیں اپنی اولاد کی اخلاقی اور روحانی بہتری اور مستقبل میں ان کی اسلامی ثقافت سے وابستگی اسی امر میں نظر آتی ہے کہ وہ اس سماج میں اسلامی اقدار کو فروغ دیں اور اسلامی ثقافت اور کلچر کی ترویج کے لیے اپنے وسائل بروئے کار لائیں یوں اپنے مستقبل کی خاطر وہ اسلام کو اس سماج میں رواج دینے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی نے چونکہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ پاکستان میں گزارا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ مختلف ممالک میں بطور سفیر بھی تعینات رہے ہیں، اس کے علاوہ مختلف ممالک کے اسفار کے دوران میں ابھی انہوں اسلامی اور دیگر ثقافتوں کا گہرا مشاہدہ کیا ہے اس لیے وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ کس طرح ایک ثقافت ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ صرف پہنچ سکتی ہے بلکہ وہاں اپنا آپ منوا بھی سکتی ہے اور اس دوسرے سماج میں اپنی جڑیں مضبوط بھی کر سکتی ہے۔ وہ ثقافت کے اس ارتقا کے بارے میں خاص آگاہی رکھتے ہیں یوں ثقافتی

تبدیلی کے مظاہر ان کی تحریروں میں بھی نظر آتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں اسلامی ثقافت کے رواج پانے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> "جو پاکستانی اپنی عمر کا موثر حصہ پاکستان میں گزارنے کے بعد امریکہ جاتے ہیں وہ اپنی ثقافتی اور روحانی پہچان نہ صرف یہ کہ برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ وہ اس ضمن میں ایک مشنری سپرٹ کے ساتھ سرگرم عمل ہیں، وہ مسجدیں تعمیر کر رہے ہیں، اسلامی مرکز اور اسلامی ادارے بنا رہے ہیں اور یوں اپنے بچوں کو پاکستانی ثقافت سے روشناس کرانے اور ان میں اسلامی روح بیدار رکھنے کیلیے اپنی تمام تر کوششیں بروئے کار لانے میں مشغول ہیں۔"[۱۶]

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بیان کیا گیا ہے قاسمی صاحب نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یورپی معاشرے میں وہ بچہ اسلام کی طرف زیادہ رغبت رکھتا ہے جس کی رہنمائی اس کے والدین کرتے ہیں اگر والدین اس سے روگردانی اختیار کر لیں تو اسی بچے کے بگڑنے کے خطرات بھی بڑھ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے والدین اپنے بچوں کو بہتر مستقبل کی طرف لے جانے کی سعی کرتے ہوئے وہاں ان کو وہ سب کچھ مہیا کرنے کی کوشش میں لگے ہیں جو افراد میں اسلامی شعار کو برقرار رکھنے اور مستقبل کی نسلوں کو اسلامی اقدار کو اختیار کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے وہ وہاں مساجد اور دیگر اسلامی ادارے قائم کر رہے ہیں تاکہ ان کی موجودہ اور آنے والی نسلیں اسلامی تعلیمات سے بہرور ہو کر اسلام کو اپنی زندگیوں میں رائج کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی ثقافت کو اپنا سکیں۔

یورپ میں انگریزی اور اسلامی ثقافتیں ایک دوسرے کے متوازی چلتی نظر آتی ہیں، یہ بات درست ہے کہ وہاں اکثریت انگریزی ثقافت کو اختیار کرنے والوں کی ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہاں اسلامی ثقافت بھی رواج پا رہی ہے۔ اس کی بڑی وجہ وہ لوگ ہیں جن کا ذکر عطاء الحق قاسمی کے مندرجہ بالا بیان میں کیا گیا ہے۔ ان لوگوں کو اپنے مستقبل کی فکر ہے کہ جس مستقبل کی خاطر وہ اپنے آباؤ اجداد کا مسکن چھوڑ کر دیارِ غیر میں آبسے ہیں وہ مستقبل کہیں ان کی آنے والی نسلوں کو آباؤ اجداد کی زریں روایات سے ہی بیگانہ نہ کر دے۔ انہی زریں روایات کو قائم رکھنے اور ان کی ترویج کی خاطر وہ وہاں مسجدیں اور اسلامی مراکز تعمیر کر رہے ہیں یوں اسلامی ثقافت کی ترویج کا باعث بن رہے ہیں اور اپنی آنے والی نسلوں کو اسلامی ثقافت کی روح سے آگاہی دلانے کی سعی کر رہے ہیں۔

پاکستانی مسلمان یورپ و امریکہ میں اپنی کوششیں تو جاری رکھے ہوئے ہی ہیں لیکن ان کی کوششوں کے خاطر خواہ نتائج کے حصول کے لیے بہت محنت درکار ہے اس کی بڑی وجہ وہاں کا ماحول اور اس کے ساتھ ساتھ اس ماحول میں پروان چڑھنے والی نسل ہے۔

اس وقت یورپ و امریکہ میں دو طرح کی مسلمان کمیونٹی آباد ہیں۔ ایک وہ جو ابتدا سے وہاں آباد ہیں یعنی ان کی دوسری یا تیسری نسل اس وقت اس سماج میں پرورش پا رہی ہے۔ دوسرے وہ مسلمان ہیں جو بسلسلہ روزگار وہاں مقیم ہیں۔ یا کچھ سال پہلے وہاں گئے ہیں۔ یعنی وہ کمیونٹی جن کی اولاد کی پیدائش تو پاکستانی معاشرے میں ہوئی لیکن بعد میں وہ وہاں منتقل ہو گئے۔ ان دونوں کمیونٹیوں کے بارے میں دیکھا جائے تو ان کی پہلی وہ نسل جو پاکستانی معاشرے میں پروان چڑھی وہ تو اسلامی روایات اور اقدار کے نہ صرف خود قریب ہے بلکہ وہ اپنے تئیں ان روایات اور اقدار کے احیا کی کوششیں بھی جاری رکھے ہوئے ہیں اور ان روایات اور اقدار کو دوسری نسل میں منتقل بھی کر رہے ہیں لیکن وہ نسل جس کی پیدائش ہی اس امریکی یا یورپی ماحول میں ہوئی ہے وہاں کے ماحول میں پروان چڑھ رہی ہے اس نسل کا اس ماحول کے اثرات سے دامن صاف بچا لینا ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ وہاں کے ماحول کے متبادل اس نئی نسل نے کوئی پاکستانی یا مشرقی ماحول نہیں دیکھا ہوتا کیونکہ اس نئی نسل کی پیدائش اور نشوونما اسی ماحول میں ہوئی ہوتی ہے اس لیے اس ماحول کے اثرات اس پر گہرے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یوں جب والدین کی طرف سے انہیں مشرقی اقدار ملتی ہیں اور باہر سماج میں وہ مغربی اقدار ان کا سامنا کر رہی ہوتی ہیں تو ایک عجیب طرح کی کشمکش جنم لیتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان کی وہ نسل جو پاکستان یا دیگر مشرقی معاشروں میں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی جب وہ امریکہ و یورپ میں منتقل ہوئیں اور وہاں ان کی اولادیں ہوئیں تو وہ پہلی نسل اپنی مشرقی روایات اور اقدار تو مغرب میں پیدا ہونے والی اپنی اولادوں میں کسی نہ کسی حد تک منتقل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں لیکن وہ نسل جس کی پیدائش اور نمو ہی مغربی ماحول میں ہوئی اور جنہوں نے مشرقی معاشرے کو دیکھا تک نہیں وہ مشرقی اقدار اور روایات اپنی آنے والی نسلوں میں منتقل کرنے سے قاصر رہیں گی کیونکہ وہ تو خود ان روایات پر پوری طرح کاربند نہ ہو سکیں اور جب وہ خود ان اقدار کی روح اور اہمیت کو نہ سمجھ سکی ہوں تو آگے کیا منتقل کریں گی۔ یہ ایک بہت بڑا المیہ ہے جو امریکہ اور یورپ میں پروان چڑھنے والی نسلوں کے حوالے سے سامنے آ رہا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اس معاشرے کا مشاہدہ کرتے اور بیان کرتے وقت اس زاویے کو بھی سامنے رکھا ہے۔ وہ یورپی معاشرے میں مسلمانوں کی نئی نسلوں میں پیدا ہونے والی اس سماجی اور اقداری کشمکش کو بہت

اچھی طرح جانتے اور بیان کرتے ہیں۔ وہ امریکہ میں مقیم ان نسلوں کے اقدار کی منتقلی کے حوالے سے مستقبل کے خدشات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

> "جو بچہ امریکہ میں پیدا ہوتا ہے اور وہاں کے ماحول میں جوان ہوتا ہے، اسے اپنے نظریات کے مطابق چلانا نہ صرف یہ کہ ممکن نہیں۔ بلکہ اسے سخت ذہنی بحران سے دوچار کرنا بھی ہے۔........... پہلی نسل تک تو اپنا ثقافتی اور روحانی ورثہ تو پھر بھی کچھ نہ کچھ منتقلہو جائے گا لیکن جس نسل کی پرورش یہ نسل کرے گی جو خود نظریاتی طور پر ڈانواں ڈول ہے، اس کے بارے میں مجھے کسی قسم کا کوئی حسن ظن نہیں اور اس ضمن میں امریکہ میں مقیم پاکستانیوں کی پہلی نسل خود بھی انتہائی پریشان ہے۔"(۱۷)

ایک ایسا معاشرہ میں جس میں ہمہ وقت پیسہ، مال اور جنس کا رواج چل رہا ہو اور جنسی لذت کے حصول کے نت نئے طریقے اور حربے سامنے آرہے ہوں وہاں نوجوان نسل کو اور نسل بھی ایسی جس نے کبھی مشرقی معاشرے کا خود مشاہدہ نہ کیا ہو اس نسل کو اس آگ میں کودنے سے روکنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا کہ وہاں جس بچے کو والدین اسلام کی طرف راغب کریں وہ سچا مسلمان بن کر نکھرتا ہے لیکن اس جیسوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہاں والدین جو مشرق سے حصول زر کی خاطر گئے ہوتے ہیں اس مصروف اور مشینی معاشرے میں دن رات ان کی مصروفیت اس حد تک بڑھی ہوتی ہے کہ وہ خود بھی اسلامی شعائر سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں یوں وہاں کا ماحول ان والدین کو بھی مشینی پرزوں کی طرح بنا کر رکھ دیتا ہے، کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کا حصول جب ان کا مطمع نظر ٹھہرتا ہے تو دین ے رغبت کم ہوتی چلی جاتی ہے اور آخر ان کی اولاد ان کے ہاتھ سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ یہی اولاد جب اس مادر پدر آزاد معاشرے میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو ہر طرف پھیلی جنس اور پیسے کی چکا چوند میں اس حد تک محو ہو جاتی ہے کہ اپنی اقدار اور روایات سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب یہ نسل جو خود اپنی اقدار سے دور ہو رہی ہے وہ ان اقدار کو اگلی نسل میں کیسے منتقل کرے گی اس بارے میں وہاں منتقل ہونے والی نسل جو اچھے مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے وہاں منتقل ہوئی تھی وہ بھی پریشان ہے اسی پریشانی کو عطاء الحق قاسمی نے اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ نہ صرف یورپی معاشرے میں مسلمانوں کی موجودہ صورت حال سے آگاہی رکھتے ہیں بلکہ اس معاشرے میں اسلامی اخلاقی اقدار اور روایات کے مستقبل کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ جہاں

ایک طرف اس امر پر مطمئن نظر آتے ہیں کہ وہاں مسلمان کمیونٹی مساجد اور دیگر اسلامی مراکز کی تعمیر میں سنجیدہ کوششیں کر رہی ہیں جس سے اسلامی اقدار کے احیا میں معاونت مل رہی ہے وہاں وہ اس بات کا خدشہ بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ وہاں پیدا ہونے والی مسلمان نسل کو اگر صحیح معنوں میں اپنی اقدار سے آگاہ نہ کیا گیا اور انھیں اپنی روایات پر کاربند نہ رکھا گیا تو وہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک غلط مثال بھی بن سکتی ہیں۔

ثقافتی، اخلاقی اور روحانی اقدار کا ایک اور زاویہ جو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں سے سامنے آتا ہے وہ بھی خاصا اہم ہے۔ وہ زاویہ ہے مسلمانوں کا دیگر اہلِ کتاب سے ازدواجی تعلقات کا۔ یورپی معاشرے میں بعض ایسے بھی مسلمان لڑکے یا لڑکیاں ہیں جنھوں نے وہاں کے عیسائیوں سے پیار محبت کی پینگیں بڑھائیں اور پھر شادیاں کیں۔ یہ وہ نسل ہے جو اپنے ثقافتی ورثے سے مکمل طور پر نابلد ہے اور نہیں جانتی کہ اسلامی اور عیسائی ثقافت میں کیا فرق ہے اور دونوں کس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہیں یوں ثقافتی لاعلمی کی وجہ سے ثقافتی سطح پر اس نسل کی کوئی پہچان نہیں بن پاتی اور ایک طرف وہ اپنے ثقافتی ورثے سے دور ہوتی چلی جاتی ہے تو دوسری طرف اس نسل کو دوسری ثقافت سے بھی آگاہی نہیں ہو پاتی۔ یہ وہ نسل ہے جو اپنے ثقافتی ورثے کو مسخ کرنے کا باعث بن رہی ہوتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفرناموں کے دوران اس ثقافتی مظہر کو بھی سامنے رکھا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ محض یورپی معاشرے کی چمک دمک سے متاثر ہو کر اپنی ثقافت سے لاعلمی اختیار کرنے والوں کے ہاں ثقافتی اظہار کوئی معنی نہیں رکھتا اور ثقافت سے یہی لاعلمی آگے چل کر انھیں تہذیب و تمدن سے بھی ناآشنا کر دیتی ہے اور یوں وہ اس معاشرے میں اپنی پہچان کھو کر ایسے مشینی پرزے بن جاتے ہیں جنھیں اپنی ذات تک کا عرفان نہیں ہوتا اور ان کا انجام بھی آخر کار مشینی پرزے سے مختلف نہیں ہوتا کہ جب تک حسن، دولت قائم ہے تب تک معاشرہ ان کو قبول کرتا رہتا ہے لیکن جوں ہی یہ چیزیں رخصت ہوتی ہیں معاشرے کے لیے وہ ناقابل برداشت ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنی روایات اور اقدار کو چھوڑ کر جس ثقافتی سماج کا حصہ بنے تھے اس کی بنیاد اقدار کی بجائے دولت اور حسن پر قائم کی گئی تھی اس لیے ان دونوں چیزوں کے بغیر اس سماج میں ان کی نہ کوئی ثقافتی اہمیت باقی رہتی ہے نہ سماجی۔ یوں وہ معاشرے کا ایک متروک طبقہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور اس طبقے میں یہاں تک پہنچنے والے بہت سے لوگ مشرق سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں جو اس معاشرے میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ اپنی ثقافتی پہچان بھی بھلا بیٹھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی ایک مثال بیان کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں۔

"میں اپنے ایک پاکستانی دوست کے اپارٹمنٹ میں بیٹھا تھا۔ میری نظر کھڑکی سے باہر سوئمنگ پول پر پڑی تو بہت سے امریکی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں غسل کے لباس میں نہانے اور ایک دوسرے سے چہلیں کرنے میں مشغول تھے، مجھے ان میں سے ایک لڑکی کے خدوخال مشرقی لگے تو میں نے اپنے دوست سے اس کے بارے میں دریافت کیا، دوست نے بتایا کہ یہ پاکستان کے فلاں سید خاندان کی صاحبزادی ہیں اور جس لڑکے کے ساتھ یہ چہلیں کر رہی ہیں، وہ ایک یہودی ہے اور آئندہ عشرے میں ان کی شادی ہونے والی ہے۔

اسی طرح سجادہ نشینوں کے خاندان کی ایک لڑکی جس کا باپ پاکستانی مسلمان اور ماں امریکن تھی، اپنے عیسائی بوائے فرینڈ کے ساتھ امریکی روزمرہ کے مطابق "اسٹیڈی" جا رہی تھی۔ یہ لڑکی اپنے ثقافتی اور روحانی ورثے سے نہ صرف یہ کہ مکمل طور پر بے بہرہ ہے بلکہ اسے بے معنی بھی سمجھتی ہے۔"(۱۸)

اس اقتباس پر غور کیا جائے تو ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ اس صورتحال میں پڑ کر اپنی ثقافتی اور تہذیبی روایات سے دور ہونے والوں میں عام لوگ ہی نہیں بلکہ مشرق میں موجود اعلیٰ طبقوں کے افراد بھی شامل ہیں۔ جب وہ اپنے ثقافتی دائرے سے باہر قدم رکھتے ہیں تو پھر یہ بھول جاتے ہیں کہ جس معاشرے کا وہ حصہ بننے جا رہے ہیں اس کی ثقافتی اقدار اور مشرقی معاشرے کی ثقافتی اقدار میں کتنا فرق ہے۔ مشرق میں روحانیت کا مرکز بننے والوں اور دوسروں کو رشد و ہدایت کا درس دینے والوں کی اولادیں بھی جب اس یورپی معاشرے میں پہنچتی ہیں تو اپنی ثقافت اور خانقاہی شرف تک کو پسِ پشت ڈال دیتی ہیں اور اس معاشرے کی ظاہری چمک دمک کا شکار ہو جاتی ہیں۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ثقافت سے روگردانی کسی ایک خاص طبقے سے منسوب نہیں کی جا سکتی بلکہ ثقافتی تبدیلی کسی بھی طبقے میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس تبدیلی کے پیدا ہونے میں جو سب سے بڑا عنصر کارفرما ہوتا ہے وہ دوسرا معاشرہ ہے جس میں یہ نسل منتقل ہو رہی ہوتی ہے۔ اس حوالے دیکھا جائے تو انگریزی معاشرے کی جنسی رغبت اور ظاہری چکا چوند اس نئی نسل کو اپنی ثقافتی اقدار سے دور کرنے کا باعث بن جاتی ہیں اور یہ نئی نسل اس دلدل میں اتر کر یوں دھنستی چلی جاتی کہ وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ سجھائی نہیں دیتی۔

انگریزی معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے جیسا کہ قاسمی صاحب کا انداز ہے وہ مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو سامنے لائے ہیں اسی طرح وہاں کے ثقافتی مظاہر اور ان میں تبدیلی اور نئی مسلمان نسل کے دوسری ثقافتوں میں پڑ کر اپنی شاندار ثقافتی روایات اور اخلاقی اقدار سے دور ہونے کا بیان کرتے وقت بھی وہ تصویر کے دونوں رخ دکھاتے چلے جاتے ہیں۔

انگریزی سماج میں بوڑھے لوگوں جن کو ان کی زبان میں سینئر سیٹیزن کہا جاتا ہے ان کی ضرورت محض اس وقت تک ہی ہوتی ہے جب تک وہ معاشرے اور گھر کی آمدنی میں اضافے کے لیے کام کرنے کے اہل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہی معاشرے اور گھر والوں کے ایک فضول قسم کی چیز بن جاتے ہیں جسے وہ اپنے پاس رکھنا یا ان کی خدمت کرنا گوارا نہیں کرتے۔ انہیں "اولڈ پیپلز ہوم" میں داخل کروا دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنی زندگی کے باقی دن گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس امر کی عکاسی عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ ایک جگہ وہ اولڈ پیپلز ہوم سے اکتا جانے والی ایک عورت کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

> "اولڈ پیپلز ہوم کی مینجر کا فون آیا تھا، اس نے بتایا کہ میری ماں وہاں بہت بے چین ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی وہاں رہنا نہیں چاہتی۔ چنانچہ اب وہ اپنا سامان باندھ کر بیٹھی ہے اور کہتی ہے کہ مجھے آ کر لے جاؤ"[۱۹]

ان جملوں سے انگریزی معاشرے میں ماں جیسی عظیم ہستی سے اولاد کی طرف سے کیے گئے سلوک کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ ماں جس نے خود کو مار کر اولاد کو جنا اور پرورش کی اس کا مقدر آخر میں اولڈ پیپلز ہوم بنتا ہے۔ اور جب وہ وہاں بے چین ہو جاتی ہے اور اولاد کے لیے تڑپتی ہے تو اولاد کا رویہ ملاحظہ ہو:

> "تو پھر تم نے کیا جواب دیا؟
>
> "میں نے کہا اسے روک کر رکھو، پھر کسی دن آ کر بات کروں گی۔"[۲۰]

یہ وہ جنریشن گیپ ہے جو آج کے مغربی معاشرے کا ایک اہم مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ اولاد اور ماں باپ کے درمیان پیدا ہونے والی یہ دوری اور اولاد کی ماں باپ سے بے رغبتی پھر ایک نسل تک رکتی نہیں، بلکہ آج اپنے والدین کو اولڈ پیپلز ہوم میں داخل کروانے والے بیس تیس سال بعد خود بھی انہی اولڈ پیپلز ہومز کی زینت بن جاتے ہیں۔

یوں مغربی معاشرہ ان بزرگوں کی قدردانی اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھانے سے قاصر ہو جاتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی اپنی اولاد اور اس معاشرے کی ترقی کے لیے وقف کر رکھی ہوتی ہے۔

انگریزی معاشرے کے مختلف زاویوں کو قاسمی صاحب نے اپنی تحریروں میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ کہیں تو انہوں نے بزرگوں کی ناقدری کے عنصر سے اپنے قارئین کو روشناس کروایا ہے تو کہیں انہوں نے بچوں کے لیے اس معاشرے میں پائے جانے والی سہولتوں سے بھی آگاہ کیا۔ مغربی معاشرے میں سیر سپاٹے کے دوران مکمل لطف اندوز ہونے کے لیے انہوں نے یہ انتظام بھی کررکھا ہوتا ہے کہ سیر و سیاحت کے مقام پر "آیا" موجود ہوتی ہیں جو سیر کے لیے آنے والوں کے بچوں کو سنبھالتی ہیں اور سیر کے لیے آنے والے لوگ بچوں سے بے فکر ہو کر وہاں کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ایسی آیا کا اور وہاں سیر کے دوران میں ان کی خدمات کا انگریزی لفظیات کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں۔

"ان سہولتوں کے ساتھ ہوٹلوں میں وہ سب نخرے بھی موجود ہیں جن سے ہوٹل کے اسٹیٹس اور کمائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً معاوضہ ادا کرکے "بے بی سٹینگ" (BABY SITTING) کی سہولت حاصل کی جاسکتی ہے۔ یعنی بچوں کو آیا کے سپرد کریں اور خود سیر سپاٹے کے لیے نکل جائیں۔"(۲۱)

ایک اچھا سفر نامہ نگار اپنی تحریر میں اس معاشرے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے جس کا ذکر وہ اپنے سفر نامے میں کررہا ہوتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب وہ معاشرے کو گہری نظر سے دیکھنے کا عادی ہو اور معاشرے کا کوئی بھی پہلو اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہنے پائے۔ معاشرے میں پائے جانے والے قدرتی مناظر اور جانور تک اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگیں اور وہ ان کو اپنی تحریروں میں شامل کرکے اپنے قارئین کو بھی اپنے ساتھ ساتھ ان مناظر میں لا کھڑا کرے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں یہ وصف تواتر کے ساتھ ملتا ہے کہ مغربی معاشرت کی عکاسی کرتے ہوئے انہوں نے وہاں کے جانوروں اور قدرتی مناظر تک کو اپنی تحریروں کا حصہ بنایا ہے اور ان کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس مغربی معاشرے میں کھڑے ہو کر وہ ان کی عکاسی بھی مغربی انداز میں انگریزی لفظیات کے استعمال سے کرتے ہیں۔ ایک سفر نامے میں وہ "کوالا" کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"میں یہاں کوالا کو "ننگی آنکھوں" (NAKED EYED) کے ساتھ پہلی دفعہ دیکھتا ہوں، اتنا پیارا اور اتنا معصوم جانور میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"(۲۲)

یہاں قاسمی صاحب نے انگریزی لفظ کا اردو ترجمہ پہلے اور بعد میں انگریزی لفظیات بھی ساتھ لکھی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس منظر کو بیان انگریزی لفظیات کے ذریعے ہی کرنا چاہ رہے ہیں لیکن تحریر میں

شگفتگی لانے کی خاطر انہوں نے NAKED EYED کے لیے ننگی آنکھوں کا لفظ استعمال کیا اور ساتھ ہی انہوں نے مغربی معاشرے میں اس طرح دیکھنے کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں تا کہ تحریر میں شگفتگی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ اصلیت بھی برقرار رہے۔

انگریزی معاشرے میں ایک اور اہم عنصر جس کی طرف ہمیں عطاء الحق قاسمی کی تحریروں سے اشارہ ملتا ہے وہ وہاں کے سماج میں پائی جانے والی ہمدردی کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ہمدردی انسانی حوالے سے سامنے آتا ہے کہ انسان کو بڑھاپے میں "اولڈ ہومز" کی زینت بنانے والے سماج میں بھی فطری طور پر موجود انسانیت کا جذبہ بھی کبھی کبھار دیکھنے میں آ ہی جاتا ہے۔ ہم مصیبت میں دوسروں کی بے لوث اور بے غرض مدد کا عنصر اس معاشرے میں بھی پایا جاتا ہے لیکن اس معاشرے کی نوعیت اور غالب صورت حال کی وجہ سے بعض دفعہ صورت حال اس کے برعکس بھی ہو جاتی ہے۔ اس لیے خدشات بہر حال قائم رہتے ہیں اور انسان کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے کشمکش کا شکار ضرور ہوتا ہے۔ اس کشمکش کے پیچھے دراصل اس معاشرے کے وہ رویے اور رجحانات ہیں جو انسان کو کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچنے دیتے بلکہ انسان بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا رہتا ہے کہیں اس کے ساتھ کچھ ایسا ویسا نہ ہو جائے۔ عطاء الحق قاسمی ایک ایسے ہی واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "جب پاؤں پھسلنے پر میں گرا تھا اور مکمل بے بسی کی حالت میں اپنا دفاع کرنے کے قابل نہیں تھا، وہ نوجوان جنہوں نے آگے بڑھ کر مجھے اٹھایا، وہ میری جیب سے بٹوہ بھی نکال سکتے تھے، اور اپنے اقدام کا جواز پیدا کرنے کے لیے مجھ پر غلیظ الزامات بھی لگا سکتے تھے، مجھے ٹارچر بھی کر سکتے تھے۔"(۲۳)

یہاں ایک لمحے کے لیے رک کر اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں ایسا خدشہ ممکن نہیں کہ ایک مصیبت زدہ شخص جس کی جان کو نقصان پہنچ رہا ہو کوئی اپنے مالی مفاد کی خاطر اس پر ہاتھ صاف کرے۔

یوں یورپی ثقافت میں اس امر کی گنجائش دیکھنے میں مل جاتی ہے کہ مصیبت زدہ اور خاص طور پر غیر ملکی مصیبت زدہ کی مدد کرنے کی بجائے اس کی مصیبت کو اپنے لیے غنیمت جانتے ہوئے فوری فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس اقتباس میں استعمال ہونے والے ایک انگریزی لفظ "ٹارچر" پر غور کیا جائے اور ساتھ بیان کی گئی صورت حال کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ عطاء الحق قاسمی نے یہاں پر لفظ "تشدد" کی بجائے "ٹارچر" کا استعمال بڑا برمحل کیا ہے۔ لفظ تشدد میں جو بربریت پنہاں ہے وہ یہاں ٹارچر میں نہیں اور نہ

ہی وہ بربریت یہاں بیان کی جاسکتی ہے، کیونکہ یہاں مارنے پیٹنے کی جو صورت حال بیان کی جارہی ہے وہ ایسی ہے جو اس مار پیٹ کو جائز اور درست قرار دینے کی طرح کی ہو سکتی ہے، تشدد لفظ جس بربریت کا اظہار کرتا ہے وہ یہاں موزوں نہیں بلکہ ٹارچر کا لفظ موزوں ہے۔ اس کے علاوہ سماجی حوالے سے دیکھا جائے تو سماج میں مختلف قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ٹارچر سیل بھی قائم ہوتے ہیں وہاں ملزم کو مجرم بنانے کے لیے ٹارچر کیا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ گالیاں اور اس طرح کی دیگر مغلظات بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ قاسمی صاحب نے اس بیان میں جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ حقیقی معنوں میں اس لفظ "ٹارچر" کے سماجی اور ثقافتی مفہوم سے ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ٹارچر جسمانی ہی نہیں بلکہ ذہنی اذیت کے لیے بھی کیا جاتا ہے یوں اس منظر نامے میں جسمانی اور ذہنی دونوں طرح کی اذیتیں سامنے آتی ہیں اس لیے ٹارچر کا لفظ زیادہ موزوں اور برمحل ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ اس لفظ "ٹارچر" کا استعمال یوں کرتے ہیں۔

> "صورت حال تو یہ ہے کہ دن میں کئی دفعہ "پنبہ کجا کجا نہم" والا مصرعہ یاد آتا ہے ...... آپ ایک رف سا اندازہ تو ضرور لگا سکتے ہیں کہ ہم جیسے اوریجنل مفکروں کو زمانے والے کن کن طریقوں سے ٹارچر کرتے ہیں اور زندہ لوگوں کے افکار کس طرح مردہ لوگوں کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔"(۴۴)

اس اقتباس میں عطاء الحق قاسمی نے ٹارچر کا لفظ خاص ذہنی اذیت کے معنوں میں لیا ہے۔ کہ کس طرح اوریجنل مفکروں کو ذہنی اذیت دی جاتی ہے۔ یہاں مفکر کا لفظ بھی ذہنی اذیت یا ٹارچر کے ساتھ خاص مناسبت رکھتا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس اقتباس میں ایک انگریزی لفظ "رفRough" بھی استعمال ہوا ہے۔ رف کا لفظ عام طور پر اردو میں رف ہی پڑھا لکھا اور بولا جاتا ہے۔ رف کاغذ، رف کاپی وغیرہ کے الفاظ تو اردو میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ جس چیز کو انسان اپنے کسی کام کو حتمی صورت دینے سے پہلے غلطی کے امکان سے بچنے یا مشق کے لیے استعمال کرتا ہے وہ رف ہوتی ہے۔ اس کو اصل کی جگہ استعمال نہیں کیا جاتا نہ ہی اس کی نوعیت اصل کی سی ہو سکتی ہے بلکہ یہ محض اصل تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے جس میں غلطی کا امکان بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں انہوں نے ایک رف سا اندازہ لگانے کی بات کی ہے کہ صورتحال کو فوری طور پر مکمل سمجھنا تو شاید ممکن نہ ہو ہاں اس کا کچھ اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

رف (Rough) کے علاوہ اس اقتباس میں استعمال ہونے والا انگریزی لفظ "اوریجنل" (Original) اصلی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں لفظ اوریجنل کا استعمال ایک خاص ثقافتی اور

سماجی تناظر میں کیا گیا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اپنے آپ اور مختلف مفکرین کے اور ریجنل ہونے کی بات کی ہے تو اسے سماجی حوالے سے دو زاویوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ قاسمی صاحب ایک طرح کی شاعرانہ تعلی کا استعمال کرتے ہوئے خود اپنی صلاحیتوں اور خوبیوں کو بیان کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ قاسمی اور ان کے دیگر رفقائے کار جو ان کے ہمراہ تھے انھوں نے انگریزی معاشرے کا مشاہدہ خود اپنی نظروں سے کیا تھا۔ انھوں نے دوسروں کی معلومات سے نتائج اخذ کرنے کی بجائے خود بنفسِ نفیس اس معاشرے میں جا کر اس کا مشاہدہ کیا اور اپنے تاثرات بیان کیے یوں وہ اور یجنل مفکر قرار پاتے ہیں جو اس معاشرے کے بارے میں ایسی حقیقی آراء بیان کر رہے ہیں جو اس معاشرے کے بارے میں ان کے اپنے مشاہدات کا نتیجہ قرار دی جاسکتی ہیں۔

یوں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والے بہت سے انگریزی الفاظ ایک خاص سیاسی و سماجی پسِ منظر رکھتے ہیں اور ان کا استعمال انھوں نے اس طرح موزوں اور بر محل کیا ہے کہ ان انگریزی الفاظ کے استعمال کے باوجود ان کی تحریر کی روانی میں کوئی خلل واقع نہیں ہونے پایا۔

انھوں نے اپنی تحریروں میں جو انگریزی معاشرت اور ثقافت کی عکاسی کی ہے اس کو ان انگریزی الفاظ کے استعمال نے اور زیادہ مؤثر بنا دیا ہے۔ انھوں نے انگریزی معاشرت اور انگریزی ثقافت کی عکاسی کرتے وقت اس سماج اور ثقافت کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے جگہوں پر وہ مشرقی اور مغربی سماج کا موازنہ بھی کرتے نظر آتے ہیں۔

ثقافت کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کی تحریروں میں مغربی ثقافت کی عکاسی کے ساتھ ساتھ مشرق کی ثقافتی اقدار کی ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقلی کے حوالے سے مغرب میں پیدا ہونے والی صورتحال کی بھی مختلف زاویوں سے آگہی دلائی گئی ہے۔ یوں انگریزی ثقافت اور سماج کو بیان کرنے میں انھوں اپنے مشاہدے اور تخیل کو بھرپور استعمال کر کے تحریر کو حقیقت کے اس طرح قریب کر دیا ہے کہ قاری خود کو ان کے ساتھ اس مشاہدے میں شریک پاتا ہے۔

انگریزی فنون لطیفہ کی عکاسی:

فنون لطیفہ میں آرٹ کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ آرٹ کا فن کار اپنے تخیل کے ذریعے رنگوں کو صفحہ قرطاس پہ یوں بکھیرتا چلا جاتا ہے کہ فطرت اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی نظر آنے لگتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر معاشرے میں فطرت میں دلچسپی رکھنے والے لوگ موجود ہوتے ہیں اور یہ وہ

افراد ہوتے ہیں جنھیں یہ فن لطیف قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فن کا نکھارنے میں فن کار کی مشق کا خاص عمل دخل ہوتا ہے لیکن اس فن کے لیے بنیادی چیز تخیل انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے اور وہ عمیق مشاہدہ، تخیل کے ساتھ مل کر رنگوں سے ایک نئی دنیا آباد کرنے میں فن کار کی مدد کرتا ہے۔

انگریزی معاشرے میں دیگر فنون لطیفہ کی طرح آرٹ اور مصوری کے فن لطیف نے بھی نمایاں مقام حاصل کیا ہے۔ اس فن لطیف نے یورپی معاشرے میں بھی اپنا آپ منوایا ہے اور وہاں کے مصوروں نے شاہکار پینٹ کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس معاشرے میں ان پینٹنگز کو خریدنے اور ان سے اپنے گھر کے درودیوار کو مزین کرنے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے عجائب خانوں میں آرٹ گیلریاں بھی ملتی ہیں جن میں اس فن لطیف کے شاہکار دنیا بھر سے منگوا کر رکھے جاتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی ایک ایسی ہی آرٹ گیلری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اب ہم نیشنل آرٹ گیلری میں دنیا کے ممتاز مصوروں کی پینٹنگز میں گھرے ہوئے تھے یہاں کلاسیکی مصوروں کی نہایت خوبصورت پینٹنگز دیواروں پر آویزاں تھیں۔ بلاشبہ فن کا اعلیٰ نمونہ تھیں مگر میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ان سے بڑے مصور بھی دنیا میں موجود ہوں گے جنہیں کوئی عالمی مقام حاصل نہ ہو سکا" (۲۵)

عطاء الحق قاسمی کا اپنے مشاہدات کو بیان کرنے کا انداز تجزیاتی ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسے ایک فوٹوگرافر کی طرح ہو بہو بیان نہیں کر دیتے بلکہ ایک مصور کی طرح تخیل کی آمیزش سے پہلے اس میں رنگ بھی بھرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کے نازک پہلوؤں کا تجزیہ بھی پیش کرتے چلے جاتے ہیں یوں قاری مشاہدے اور تجزیے دونوں کا لطف حاصل کرنے لگتا ہے۔ مندرجہ بالا بیان میں دیکھا جائے تو انھوں نے نیشنل آرٹ گیلری میں لگی پینٹنگز کو بہترین قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس اہم نکتے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ خاص طور پر اس انگریزی معاشرے میں صلاحیتوں کو منوانے کے لیے موقع کا ملنا بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بہت سے اعلیٰ درجے کے فن کار ایسے ہوں گے جنھوں نے آرٹ گیلری میں لگی پینٹنگز سے بڑے شاہکار پینٹ کیے ہوں گے لیکن اظہار کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے وہ دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئے اور جنھوں نے موقع حاصل کر لیا ان کی پینٹنگز آرٹ گیلری کی زینت بن کر لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی رہتی ہیں۔

اس اقتباس میں استعمال ہونے والے انگریزی لفظ پینٹنگز کو دیکھا جائے تو اس کا مفہوم بھی خاصا وسیع نظر آتا ہے۔ پینٹنگز کا ماخذ پینٹ Paint ہے جس کا مطلب ایک چیز پر ایک یا مختلف رنگوں یا کسی اور چیز کی تہہ لگانا ہے۔ یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہر معنی میں اس کی اصل ایک ہی رہتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی کے بیان کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں یہ لفظ "پینٹنگز" ان تصویروں کے لیے استعمال ہوا ہے جنھیں مختلف مصوروں نے اپنے ہاتھوں سے رنگوں کی دنیا آباد کرتے تخلیق کیا ہوتا ہے۔ یہ تصویریں ایک فوٹوگرافی کی نہیں جو جیسا ہے ویسا ہی دکھا دے بلکہ یہ مصوروں کی ہیں جنہوں نے مناظر کو رنگوں سے بیان کرتے وقت ان میں اپنا تخیل بھی شامل کیا ہوتا ہے۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی مصور کی پینٹنگز اصل میں اس کی وہ تخلیق ہوتی ہے جس میں وہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنے مشاہدات کو رنگوں کے ذریعے قرطاس پر پینٹ کرتا ہے۔ پینٹ ہونے والے یہ رنگ صرف مشاہدہ کی بنا پر پینٹ نہیں ہوتے بلکہ ان میں تخیل کی کارفرمائی بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی مصور جس انداز میں زیادہ بہتر طور پر اپنے تخیل کو اپنی پینٹنگ میں شامل کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے اتنی ہی وہ پینٹنگ زیادہ بہترین اور اس مصور کے فن کا شاہکار بنتی چلی جاتی ہے۔ یورپ اور دیگر انگریزی معاشرے جب مشینوں کی دوڑ میں شامل نہیں ہوئے تھے اور فنون لطیفہ کا چلن معاشرے میں عام تھا تو بہت بڑے فن کاروں نے بہت سے شاہکار پینٹ کیے تھے اس کے علاوہ ان کاموں میں ان کی دلچسپی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ دیگر ممالک سے پینٹنگز لا کر باقاعدہ آرٹ گیلریاں بنائی گئی تھیں۔ یوں کہا جا سکتا ہے مصوری کا فن لطیف بھی انگریزی معاشرے میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ بلکہ دیکھا جائے تو مجسمہ سازی جو کہ مصوری کا ہی ایک روپ ہے اس کی تو یورپ اور امریکہ میں باقاعدہ صنعت کی سی حیثیت ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے سفرناموں سے انگریزی معاشرے میں پائے جانے والے ان رجحانات سے بھی خاصی واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ ایک جہاں دیدہ شخص ہیں۔ ان کا مشاہدہ اور مطالعہ خاصا وسیع ہے وہ اقوام عالم کی تاریخ پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ آرٹ گیلری میں کھڑے ہو کر بھی انہیں نہ صرف آرٹ کی کلاسیکی روایت یاد آتی ہے بلکہ وہ اس آرٹ گیلری سے باہر کی دنیا کے کئی ایسے مصوروں کا بھی ذکر کرتے ہیں جن کو اس گیلری تک اپنی تخلیقات پہنچانے کا موقع نہ ملا اور ان سے کم صلاحیتوں والے اس اہم گیلری میں جگہ پا کر اپنے فن کی پر وقت داد وصول کرتے ہیں۔

پاکستان اور دیگر ایشیائی ممالک سے یورپ اور مغربی ممالک کا رخ کرنے والوں نے وہاں مختلف پیشے اختیار کیے۔ کچھ نے تو وہاں کے پیشوں میں ہی خود کو بطور ملازم پیش کیا اور اپنی روزی کا سامان کرنے لگے جب بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے وہاں اپنے ذاتی کاروبار شروع کیے۔ ان کاروباری افراد میں بہت سے ایسے لوگ بھی شامل ہیں جنھوں نے وہاں پر اپنے ہم وطنوں کی کثرت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کی ضروریات کا ہی سامان کیا۔ اس کے علاوہ بعض نے اس معاشرے میں رواج پانے والے مختلف رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے مطابق اپنے کاروبار ترتیب دیے۔ عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں جہاں یورپ وامریکہ میں ہونے والے مختلف کاموں اور ذرائع روزگار کا ذکر ملتا ہے وہاں انھوں نے اس امر پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ وہاں پاکستانی صرف دوسروں کے غلام بن کر ہی نہیں رہتے بلکہ بہت سے پاکستانیوں نے وہاں اپنے کاروبار بھی بنائے ہوئے ہیں اور ان میں سے اچھا خاصا کمانے کے ساتھ ساتھ وہاں پاکستانی اور مشرقی ثقافت اور اقدار کو بھی رائج کر رہے ہیں۔ ایسا ہی کاروبار عطاء الحق قاسمی کی نظر سے بھی وہاں گزرا اس کاروبار کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں۔

> "بریڈ فورڈ میں ہم نے ایک ایسی دکان دیکھی کہ بس دل خوش ہو گیا۔ اس دکان کا نام بک سنٹر ہے۔ اور اس کے مالک افتخار قریشی ہیں۔ بک سنٹر یورپ کا سب سے بڑا اردو کتابوں کا مرکز ہے۔ یہاں ہر موضوع کی کتابیں دستیاب ہیں۔ اور یوں ایک لاکھ سے زیادہ اردو کتابیں یہاں موجود ہیں۔ اور یورپ بلکہ امریکہ تک سپلائی ہوتی ہیں۔ یہاں کتابوں کے علاوہ پاکستانی گانوں کی کیسٹ اور پاکستانی ثقافت سے متعلق دوسری اشیا بھی دستیاب ہیں۔"(۲۶)

اس بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی نے انگریزی معاشرے میں اردو کتب کی پذیرائی کو بھی بیان کیا ہے اس کے علاوہ کتب کے ساتھ ساتھ پاکستانی گانوں کی کیسٹیں اور پاکستانی ثقافت سے متعلق دیگر مواد جو وہاں پاکستانی ثقافت کی ترویج کر رہے ہیں ان کا بیان اس بات کا غماز ہے کہ وہاں مقیم پاکستانی اپنے روزگار کے ساتھ ساتھ پاکستانی ثقافت اور کلچر کو بھی بطریق احسن فروغ دے رہے ہیں یوں پاکستانی کلچر اور ثقافت وہاں پہ مقیم پاکستانیوں کی آئندہ نسلوں میں منتقل ہونے کی بھی راہ ہموار ہو رہی ہے۔

اس بیان میں شامل انگریزی الفاظ کو دیکھا جائے تو لفظ "بک سنٹر" (Book Centre) ایک ایسی دکان یا کاروبار کی جگہ کا نام ہے جہاں مختلف کتب فروخت کے لیے رکھی جاتی ہیں۔ اس لفظ کے متبادل ہمارے

ہاں انگریزی الفاظ میں بک ڈپو بھی رائج ہیں جب کہ اردو میں "کتاب گھر" وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ انگریزی معاشرے کے حوالے ے دیکھا جائے تو وہاں اس جگہ کے لیے لفظ "بک سنٹر" ہی زیادہ موزوں ہے اور شاید اسی موزونیت کی وجہ سے ہے اس کے مالک نے اس کا نام "بک سنٹر" رکھا ہے۔ سنٹر کا لفظ انگریزی معاشرے میں ویسے بھی کسی بھی کام کے مرکز کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کہ مسجد یا کسی دینی مرکز کے لیے وہاں "اسلامک سنٹر" کا لفظ استعمال ہوتا ہے یوں ہی کتابوں کے مرکز کے لیے اس معاشرے کے رجحان کو دیکھا جائے تو بک سنٹر کا لفظ زیادہ بہتر ہے بجائے اس کے کہ بک ڈپو کا لفظ استعمال کیا جائے۔

انگریزی سماج میں فنون کے حوالے سے بات کی جائے تو وہاں کلب کلچر کا رواج عام ہے۔ اس فن سے وہ اچھا خاصا کماتے بھی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے وہاں کے اس کلب کلچر کو بھی بڑے ظریفانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کے ہاں اردو نثر میں انگریزی سماج کے اس زاویے کو ایک ایسے فن کے طور پر نمایاں کیا گیا ہے جو اس سماج کا لازمی حصہ بن چکا ہے۔ وہاں کلب کلچر سے کیسے کمایا جا رہا ہے اس کی عکاسی عطاء الحق قاسمی یوں کرتے ہیں:

> "کیا میں ہال پر ایک نظر ڈال سکتا ہوں؟"
>
> "ون ڈالر ففٹی سینٹ"
>
> "محض سیمپل کے طور پر ایک نظر کہ یہ بہت دفعہ دیکھ چکا ہوں، صرف نیویارک تکنیک کا اندازہ لگانا ہے۔"
>
> "مریں! صرف جھانک کر دیکھنا ہے!"
>
> "ون ڈالر ففٹی سینٹ"
>
> "اس سے زیادہ بھی منہ سے پھوٹو گے یا "ون ڈالر ففٹی سینٹ" کی گردان دہراتے جاؤ گے؟" (۲۷)

یہاں قاسمی نے انگریزی سماج کے اس خاص پہلو کو نمایاں کیا ہے جس میں ان کے ہاں اپنا پیسہ اور کاروبار ہی سب کچھ ہوتا ہے اور انہوں نے اس میں اضافے اور اپنے منافع کے لیے بے شمار ہتھکنڈے اپنائے ہوتے ہیں۔ انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ آنے والا کس مقصد کے تحت آ رہا ہے اور اسے کیا چاہیے۔ انہیں صرف اپنے کاروبار کو ترقی دینا ہے اور اس سے زیادہ سے زیادہ کمانا ہے۔

مثبت اقدار اور مثبت امور کے ساتھ ساتھ انگریزی معاشرے میں پائے جانے والے بہت سے منفی امور کی عکاسی بھی قاسمی صاحب کی تحریروں میں ملتی ہے۔انھوں نے انتہائی غیر جانب داری سے مغربی معاشرت کا تجزیہ کیا ہے اور اس کو اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ان کی تحریریں صحیح معنوں میں اس نظام اور اس معاشرت کی عکاس بن کر سامنے آتی ہیں۔انگریزی معاشرے کی سب سے زیادہ چکا چوند اس معاشرے کی عریانی و فحاشی میں ہے۔ عریانی و فحاشی کو اس معاشرے میں ایک طرح کی صنعت کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ وہاں کے باسی تو شاید اس کے عادی ہونے کی وجہ سے اس طرف زیادہ رغبت نہ رکھتے ہوں بلکہ اسے معمول کی کارروائی سمجھتے ہوں لیکن بیرونی معاشروں کے جو باشندے ان معاشروں میں جابستے ہیں وہ اس سے خاصے متاثر ہوتے ہیں۔اس عریانی اور فحاشی سے اس معاشرے کے لوگ خاصا فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کو مختلف معاشروں میں پھیلا کر اپنا مالی مفاد حاصل کرتے ہیں۔اس حوالے سے بھی قاسمی کی بسیط نظر نے اپنے قارئین کو آگاہی دلائی ہے۔سویڈن میں اس عریانی کی صنعت کے فروغ پانے اور ترقی کرنے کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

> "سویڈن ایسے "مثالی نظام" کی ساری آمدنی اسلحہ سازی کے بعد بلیو فلموں کی رہین منت ہے۔بلیو فلموں کے علاوہ سینکڑوں اخبارات و جرائد کی انڈسٹری ہے۔جو دھڑا دھڑ اپنی " مصنوعات " مارکیٹ میں پھینک رہے ہیں۔قحبہ خانہ کی انڈسٹری ہے جہاں جہاں عورتوں کی تذلیل کے لیے انسانیت سوز رویے اپنائے جاتے ہیں، مصنوعی جنسی اعضاء کی انڈسٹری ہے۔ فیکٹریوں میں ربڑ کی عورتیں تیار کی جاتی ہیں۔یہ ایک علاحدہ انڈسٹری ہے۔ عریانی کے لیے راہ ہموار کرنے کے بعد صنعت کار عریاں ملبوسات میں نئے ڈیزائن تیار کر کے مارکیٹ میں پھینکتے ہیں۔"(۲۸)

اس اقتباس سے مغربی معاشرے اور خاص طور پر وہاں کے سرمایہ دار طبقہ کے ان ہتھکنڈوں سے آگاہی ہوتی ہے جو وہ اپنا مالی مفاد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جنسی رغبت انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ فریق مخالف کے لیے جنسی کشش کے بغیر انسان نہیں رہ سکتا۔وہ ہر دور میں اس امر کی طرف خاص طور پر متوجہ رہا ہے کہ جنسی تسکین کا حصول کیسے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ سرمایہ دار نے انسان کی اس فطرت کا نہ صرف مشاہدہ کیا بلکہ اسے اپنے مفاد میں استعمال کرنے کے لیے نت نئے طریقے بھی ایجاد کیے۔ملبوسات کے ڈیزائن اس طرح کے تیار کیے گئے کہ انسان کی جنسی لذت کی خواہش کو بڑھاوا دینے اور

جنسی برانگیختی کا سبب بن سکیں ایک طرف تو ان ملبوسات کے ڈیزائینوں کے ذریعے جنسی طور پر برانگیختہ کیا جاتا ہے تو دوسری طرف اس برانگیختی سے فائدہ اٹھا کر جنسی عمل کی طرف راغب کیا جاتا ہے اور معاشرے میں عورت کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ ایسے غیر فطری طریقے بھی اپنائے جاتے ہیں جو جنسی لذت کے حصول اور جنسی تسکین کا باعث بن سکیں یوں سرمایہ دار اس عمل کے ذریعے دوہرا منافع کماتا ہے۔ انگریزی معاشرے میں اس طرز عمل نے عورت کو محض جنسی لذت کے حصول کا آلہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ وہ جہاں بھی کام کرتی ہے اسے اس صورت حال کا سامنا رہتا ہے۔

قاسمی صاحب نے اپنی تحریروں میں اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے "انڈسٹری" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انڈسٹری (Industry) کا لفظ "صنعت" کے لیے استعمال ہوتا ہے یوں اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا کارخانہ یا ایسی صنعت جہاں سرمایہ دار اپنا سرمایہ لگاتا ہے اور پھر اس سرمائے اور وہاں پر کام کرنے والے مزدوروں کے ذریعے وہ مختلف پیداوار حاصل کر کے انھیں مختلف منڈیوں میں فروخت کرتا ہے یوں وہ منافع حاصل کرتا ہے۔ یعنی سرمایا لگانے سے لے کر پیداوار کے حصول اور اس سے منافع کے حصول کا عمل "انڈسٹری" کے مفہوم میں شامل ہے۔ انڈسٹری کی کئی اقسام ہیں۔ چھوٹے پیمانے پر گھریلو سطح پر مختلف اشیا کی پیداوار اور ان کے ذریعے منافع کے حصول سے لے کر عالمی سطح تک کی انڈسٹریاں شامل ہیں۔ جو سرمایہ دار کو مالی مفاد پہنچانے کے ساتھ ساتھ مختلف مزدوروں کے روزگار کا بھی ذریعہ ہیں۔

عطاء الحق قاسمی نے عریانی و فحاشی کے تمام ذرائع جن میں بلیو فلمیں، عریاں ملبوسات، قحبہ خانہ اور دیگر ایسے ذرائع اس معاشرتی و ثقافتی پس منظر میں ہی "انڈسٹری" قرار دیا ہے کیوں کہ انڈسٹری کی سی صورت حال اس کام میں بھی پیدا ہو چکی ہے اور یہ کام انگریزی معاشرے میں باقاعدہ ایک صنعت کا درجہ اختیار کر چکا ہے جس میں سرمایہ دار سرمایہ کاری بھی کرتے ہیں، ان کے مختلف کارندے مختلف صورتوں میں کام بھی کرتے ہیں اور سرمایہ دار اپنا منافع بھی حاصل کرتا ہے۔

انگریزی معاشرے میں پلاسٹک کی عورتوں اور جنسی اعضا کی تیاری اور عریاں ملبوسات تو صورت ہی انڈسٹری کی اختیار کر چکے ہیں اور ان کی "مصنوعات" کی باقاعدہ منڈیاں بھی ہیں ان کے ساتھ ساتھ وہاں مختلف لڑکیوں اور عورتوں کو بھی جنسی لذت کے عمل میں دوسروں کو استعمال کروا کر منافع کمایا جاتا ہے۔ سرمایہ دار ان لڑکیوں پر سرمایہ کاری کرتا ہے انھیں اس دھندے کے لیے ماحول اور جگہ فراہم کرتا ہے ان کی سودے بازی کا اہتمام کرتا ہے اور حاصل زدہ آمدن میں سے اپنا معقول حصہ بھی وصول کرتا ہے اور ان

لڑکیوں کو بھی مالی فائدہ پہنچاتا ہے یوں یہ کام بھی ایک "انڈسٹری" کی صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ یوں عطاء الحق قاسمی نے اس امر کے لیے "انڈسٹری" کا جو لفظ استعمال کی ہے وہ اپنے اندر وسیع مفہوم رکھنے کے ساتھ ساتھ اس معاشرے کی سماجی اور ثقافتی صورت حال کا مظہر بھی ہے۔

انگریزی معاشرے میں فنون لطیفہ اور دیگر امور کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں بھی صورتحال خاصی گھمبیر دکھائی دیتی ہے۔ یہاں کے ایسے لوگ جو کم آمدنی والے ہیں وہ دوسروں کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں، مثلاً مزدور ہے تو وہ سرمایہ دار کے رحم وکرم پر ہے۔ سرمایہ دار اس کی ذات سے ہر جائز وناجائز فائدہ حاصل کرتا چلا جاتا ہے اور مزدور کوہلو کے بیل کی طرح ایک گھن چکر میں گھومتا چلا جاتا۔ کام کی زیادتی اس حد تک ان لوگوں کے لیے بڑھی ہوتی ہے کہ ان کو اپنی پہچان بھی بھول جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے روزمرہ کے امور کی انجام دہی کے لیے صبح سے شام تک مسلسل کام کرتے چلے جاتے ہیں لیکن کما اتنا بھی نہیں پاتے کہ آسانی سے گزر بسر کر سکیں بلکہ ایک کے بعد ایک امتحان ان کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور وہ ہر امتحان کے لیے پہلے سے بڑھ کر کام کرتے نظر آتے ہیں۔

انگریزی معاشرے میں رہنے والے لوگ اپنی ضروریات کی بجاآوری کے لیے جانوروں کی طرح دن رات کام میں جتے رہتے ہیں۔ قابل افسوس بات یہ ہے کہ کام میں اس حد تک محو ہونے کے باوجود وہ اپنی زندگی کا انداز نہیں بدل پاتے اور جونہی وہ ایک کام کو مکمل کر چکتے ہیں تو دوسرے میں جت جاتے ہیں یہ مسلسل کام کرنے کے بعد ہی کہیں جا کر ان کا گوہر مقصود جو کہ روزمرہ کی اشیا پر مشتمل ہوتا ہے وہ ہاتھ آتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی ان لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنے ایک سفرنامے میں لکھتے ہیں۔

> "یہ لوگ کریڈٹ کارڈوں کے قرضے اتارنے کے لیے گدھوں کی طرح کام کرتے ہیں۔ یہ بھولتے جارہے ہیں کہ انھوں نے انسانوں کے ہاں جنم لیا تھا۔"(۲۹)

یہ اس معاشرے کا ایک بہت بڑا المیہ ہے کہ انسان مشین کا اس حد تک ایک پرزہ بن کر رہ جاتا ہے کہ اس کی اپنی حیثیت جانوروں سے بھی بدتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ انسانیت کی اس سے بڑھ کر اور تذلیل کیا ہوگی کہ انسان انسانیت کے درجے سے گر کر حیوانیت کے درجے تک جا پہنچے لیکن اس کا طرز زندگی پھر بھی تبدیل نہ ہو پائے۔ اور انسان جہاں سے اپنی محنت کا سفر شروع کرے گھوم پھر کر وہیں پر واپس آجائے اور اسے کچھ سجھائی نہ دے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور وہ کون سی پس پردہ کارفرما قوتیں کون سی ہیں جو اس کی محنت کا ثمر کھا رہی ہیں۔

انگریزی معاشرے میں لوگوں کی زندگیاں محض اشیا کی غلام بن کر رہ گئی ہیں۔ اشیا کے حصول کے لیے وہاں تمام امور انجام دیے جاتے ہیں۔ انسان کی قدر و منزلت بھی اشیا کے حوالے سے ہی ہے۔ جس کے پاس جتنی زیادہ اشیا ہیں وہ اتنا ہی زیادہ قابل عزت گردانا جاتا ہے۔ یہ اشیا کے حصول کی دوڑ ہی ہے جس نے افراد معاشرہ خاص طور پر عورت کو ذلت کی چکی میں پیس کر رکھ دیا ہے اور وہ نہ جانے انھی اشیا کے حصول کے لیے کیا کچھ کر گزرتی ہے۔ وہ اشیا کے حصول کے لیے اپنی زندگی کی رعنائیوں کو بھی قربان کرتی چلی جاتی ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

> "زندگی کا محور اشیا کا حصول قرار پاتی ہے۔ اور اس کی خاطر جوان خوبرو لڑکیاں بدشکل بوڑھوں کے ساتھ شادی کرتی ہیں، سڑکوں پر بزنس لو (کاروباری محبت) کی آوازیں لگاتی ہیں، رسالوں کے لیے عریاں تصویریں اترواتی ہیں۔ سٹیج پر سینکڑوں مردوں کے سامنے خلوت کو جلوت بنا دیتی ہیں۔" (۳۰)

یہ تمام امور جب ایک معاشرے میں رواج پاتے ہیں تو اس معاشرے میں دو طرح کے لوگ سامنے آنے لگتے ہیں۔ ایک وہ جو عورت کے وجود کو اپنی جنسی تسکین کی خاطر استعمال کرتے ہیں اور دوسری وہ عورتیں جو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کا ہاتھوں اپنا استحصال کروانے پر مجبور ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے ان دونوں طرح کے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی معاشرہ میں اشیا کی قدر بڑھ جانے سے انسان کی قدر کم ہوتے ہوتے ختم ہونے تک پہنچ گئی ہے اور انسان سمجھ بھی نہیں پارہا کہ وہ اپنی ذات کی نفی کر کے، خود کو مٹا کر جو یہ مادی اشیا حاصل کرنے کی دوڑ میں لگا ہے اس کا مقصد کیا ہے۔ انسان اپنی پہچان بھول گیا ہے۔ وہ دوسروں کے ہاتھوں آلہ کار بن گیا ہے اور محض اشیا کے حصول کی خاطر اس نے اپنا ذہن اور اپنی فکر تک دوسروں کی غلام بنا دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوان لڑکیاں جو خوب صورتی اور دلربائی کا نمونہ ہیں وہ اپنے اس حسن کو بوڑھے امیروں کے سامنے پیش کرنے پر آمادہ ہیں تا کہ اشیا کے حصول کی خاطر کسی دوسرے کا محتاج نہ ہونا پڑے۔ اخباروں رسالوں کے لیے اپنے حسن کی نمائش کی جارہی ہے تا کہ اشیا کا حصول ممکن ہو سکے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی معاشرے میں مادیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور اسی مادیت پرستی نے اخلاقی اور روحانی طور پر اس معاشرے کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ آج وہاں مادیت کے ڈسے لوگ ذہنی تسکین کے متلاشی ہیں لیکن انہیں ذہنی سکون میسر نہیں۔ ہر آنے والا دن ان کے لیے مادیت کے عفریت کو طاقت ور بنانے کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون اور روحانی تسکین سے دوری کا دن ثابت ہو رہا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے اسفار کے دوران میں یورپی معاشرے کے اس مادیت پرستی کے پہلو پر خاص نگاہ ڈالی ہے اور گہرے مشاہدے کے ذریعے انھوں نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ یورپی معاشرے میں انسان کی قدر و منزلت مادی اشیا کے حصول کے حوالے سے ہے۔

وہاں کے فنون اور دیگر روزگاروں کو دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جنسی تسکین کا سامان کرنا وہاں ایک اہم صنعت کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ نام نہاد روشن خیالی اور سیکولرازم کا پرچار کرنے والوں نے عورت کو گھر کی چار دیواری سے حقوق کا لالچ اور خواب دکھا کر نکالا اور اسے ہر جگہ استعمال کیا۔ یوں جنس کا کاروبار ترقی کرتا چلا گیا اور اس کاروبار میں نت نئے انداز اور نئی نئی چیزیں سامنے آتی گئیں۔ آج جنسی کاروبار یورپ میں ایک اہم کاروبار کا درجہ حاصل کر چکا ہے وہاں عورت سے لے کر فیکٹریوں میں پلاسٹک کے جنسی اعضا کی تیاری تک، عورت کی عریانی سے لے کر دوسروں سے مالی مفاد کے حصول کے لیے اپنا آپ ان کے سپرد کر دینے تک ہر جگہ اس جنسی کاروبار نے اپنے آپ کو مضبوط کیا ہوا ہے۔

صنعتی معاشرے میں انسان کی صلاحیتوں کا سب سے زیادہ ضیاع ہوتا ہے۔ ایسے ایسے قابل انسان محض مشینی پرزے بن کر رہ جاتے ہیں جن کو اگر زندگی موقع اور وسائل فراہم کرتی تو وہ معاشرے کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن وسائل سرمایہ دار کے ہاتھ میں جانے سے ترقی کے مواقع بھی اسی کے پاس سمٹ کر رہ گئے اور انسان سرمایہ دار کے غلام بنتے چلے گئے۔ یورپی اور دیگر انگریزی معاشروں میں ہونے والی صنعتی ترقی نے بھی انسان کے ساتھ ایسا ہی کھیل کھیلا کہ وسائل چند ہاتھوں میں رہ گئے اور انسانوں کی اکثریت ان سرمایہ داروں کے لگائے گئے سرمائے اور ان کی مشینوں کے غلام بن کر رہ گئے۔ انگریزی صنعتی معاشرے میں انسانوں کی جگہ مشینوں کی افادیت بڑھی تو انسانوں میں احساس مروت نے دم توڑنا شروع کر دیا اور نتیجہ یہاں تک پہنچ گیا انسان محض مشینوں کے لیے ہی رہ گیا اور انسان کو معاشرہ کا مفید رکن اسی وقت تک مانا جاتا ہے جب تک وہ ان مشینوں کو حرکت دینے کے قابل رہتا ہے اور ان کے ساتھ ایک پرزے کی طرح چلتا رہتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے انسانیت کی اس تذلیل کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے اسفار اور بیرون ممالک میں مختلف فرائض کی بجا آوری کے لیے اپنے وہاں قیام کے دوران انھوں وہاں کی صنعتی ترقی اور اس صنعتی ترقی میں انسان کی اہمیت کا عمیق مشاہدہ کیا تھا۔ انھیں اس بات کا ادراک ہو گیا تھا انگریزی معاشرہ مالی مفادات کے حصول پر قائم ہے اور مشینیں جو کہ مالی مفاد کے حصول کا ایک اہم ذریعہ ہیں ان کی اہمیت اس معاشرے میں انسانوں سے بھی زیادہ ہے۔ ایک جگہ وہ اسی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"انسان کو اس کی ذات میں تنہا اور اداس کر دیا گیا ہے۔ مشینوں میں استعمال کرنے کے لیے پالا پوسا جاتا ہے۔ چنانچہ مغرب میں ترقی انسان نے نہیں مشینوں نے کی ہے۔"(۳۱)

یہ تنہائی اس انسان کا مقدر بنی ہے جس نے اپنا جسم اور اپنا ذہن دونوں مشینوں کے غلام بنا دیے اور مقصد صرف مادیت کا حصول ٹھہرا۔ آج انگریزی معاشرے کے انسان کا سب سے بڑا المیہ ہی اس کی ذات کے عرفان کا مسئلہ ہے۔ انسان کو انسان اور انسانیت کا عرفان ہی اس مشینی معاشرے میں نہیں ہو پا رہا اور ساری عمر مشینوں کو حرکت دینے کے بعد انسان ایک مشینی پرزے کی طرح ہی بے کار ہو جاتا ہے اور اس بیکاری کے دوران وہ انسان جس نے دوسروں کی خاطر ان مشینوں کو حرکت دیتے ہوئے اپنی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں اور توانائیاں قربان کی ہوتی ہیں، تنہائی اس انسان کا مقدر بن جاتی ہے۔ یہی تنہائی انگریزی معاشرے کے انسان کا ایسا بڑا مسئلہ ہے جس کی طرف عطاء الحق قاسمی نے اپنی تحریروں میں اشارہ کیا ہے۔

ب: عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی لفظیات کا فنی تناظر

اب تک کی بحث میں ان نکات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ عطاء الحق قاسمی کی اردو نثر میں انگریزی الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا فکری تناظر کیا ہے اور ان کی تحریروں میں انگریزی معاشرت، انگریزی ثقافت اور انگریزی فنون اور پیشوں کی عکاسی کس طرح ہوئی ہے۔ اب آتے ہیں فنی تناظر کی طرف کہ وہ اپنی تحریروں میں فنی حوالے سے کس مرتبے پر فائز ہیں۔

مصنف کا اسلوب:

اسلوب سے مراد تحریر کا وہ انداز ہے جس کے ذریعے کوئی تخلیق کار اپنی فکر کو ایک خاص فنی مہارت سے صفحہ قرطاس کی زینت بناتا ہے۔ کسی تحریر کا انداز بیان ہی دراصل اس کا اسلوب ہوتا ہے۔ اور یہ اسلوب جس قدر بہترین اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ معنوی انداز میں وسعت کا حامل ہو گا تحریر اس قدر جاندار ہو گی۔

عطاء الحق قاسمی کے اسلوب کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں اسلوب میں ایک رنگارنگی ملتی ہے وہ مختلف چیزوں کے باہمی لطیف تعلق سے اسلوب میں جان پیدا کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ وہ لفظوں کا استعمال اس انداز سے کرتے ہیں کہ ان کے الٹ پھیر سے ہی بہت گہرے معنی پیدا کر لیتے ہیں۔

"تھوڑی دیر میں دو خواتین اپنی موجودگی کا پوری طرح احساس دلاتے ہوئے کمرے
میں داخل ہوئیں، یہ ایک ممتاز گھرانے کی صاحبزادیاں تھیں۔ جب وہ کمرے سے
چلی گئیں تو میں نے حیرت سے اپنے دوست سے کہا: "میں انہیں جانتا ہوں مگر یقین
نہیں آتا یہ وہی ہیں!" دوست کے چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور اس
نے کہا "میں زیادہ اچھی طرح جانتا ہوں اور یقین کرو یہ وہی ہیں!"(۳۲)

اس بیان کو دیکھا جائے تو انھوں نے "جاننے اور یقین" کے دو الفاظ کو بدل بدل کر اس طرح استعمال کیا ہے کہ جملے میں معنوی تہہ داری کی پرتیں کھلنے کے ساتھ ساتھ تحریر میں بھی خوب صورتی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ خوب صورتی اس انداز میں سامنے آتی ہے کہ قاری کے ہونٹوں کو متبسم کرتی چلی جاتی ہے۔ یوں انھوں نے الفاظ کے ہیر پھیر سے اپنی تحریر کو لطافت دینے کے ساتھ ساتھ اس میں معنوی وسعت بھی پیدا کر دی ہے۔ اچھے تخلیق کار کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنوں کو اس انداز میں بیان کر دیتا ہے کہ الفاظ کی کفایت شعاری کے باوجود معنوی سطح متاثر نہیں ہوتی۔ الفاظ کی کفایت شعاری ہی اسلوب کی جان ہوتی ہے۔ قاسمی صاحب کے ہاں یہ فن عروج پر نظر آتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کے اسلوب کے حوالے سے ایک اور بات کہ وہ انگریزی زبان کے الفاظ کو تحریر میں یوں استعمال کرتے ہیں ایک طرح سے ان کی ذومعنیت مطلب نکال لیتے ہیں ذیل کے اقتباس کو دیکھئے:

"میرا شمار فی الحال مستند گنجوں میں نہیں ہوتا، بس یوں سمجھیں کہ ابھی رنگروٹ
بھرتی ہوا ہوں اور آثار بتاتے ہیں کہ ترقی کرتے کرتے بہت جلد "جنرل" کے
عہدے پر پہنچ جاؤں گا۔"(۳۳)

اس اقتباس میں انگریزی کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ "رنگروٹ" اور "جنرل" میں رنگروٹ اس سپاہی کو کہتے ہیں جو فوج میں نیا بھرتی ہوا ہو اور ابھی تربیت کے مراحل طے کر رہا ہو جب کہ جنرل فوج کا اعلیٰ عہدیدار ہوتا ہے گویا رنگروٹ سے جنرل تک کا سفر ایک ارتقائی سفر ہے جس کی پہلی سیڑھی رنگروٹ اور آخری منزل جنرل کا عہدہ ہوتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی اپنے گنجے پن کو بیان کر رہے ہیں کہ وہ ابھی مکمل طور پر گنجے نہیں ہوئے بلکہ ابھی ان کے گنجاپن کی یوں ہی ابتدا ہو رہی ہے جیسے ایک رنگروٹ کی تربیت کے مراحل کی ابتدائی ہوتی ہے۔ گویا گنجوں کی فوج میں وہ ایک رنگروٹ ہی ہیں لیکن ان کے بال جس رفتار سے جھڑتے جا رہے ہیں اس سے ظاہر

ہوتا ہے وہ بہت جلد پورے سر کو گنجا کر بیٹھیں گے اور گنجوں کی فوج میں جنرل کے عہدے تک پہنچ جائیں گے۔

یہاں لفظ "جنرل" بھی خاصا قابل غور ہے اور ذو معنویت رکھتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ قاسمی صاحب نے بھی اسے اپنی تحریر میں واوین میں لکھا ہے۔ رنگروٹ کے حوالے سے دیکھا جائے تو جنرل فوج کا اعلیٰ عہدیدار ہے لیکن جنرل (General) کے حوالے سے دیکھا جائے تو عام کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے یا ایک لمحہ ٹھہر کر تحریر کے شروع کے الفاظ میں "مستند" کو ذہن میں لائیے۔ اب "مستند" اور "عام" کا آپس میں گہرا تعلق ہے یوں قاسمی صاحب نے لفظ جنرل سے ذو معنویت پیدا کی ہے کہ وہ بہت جلد ایسے گنجے ہونے والے ہیں کہ عام گنجوں میں شمار ہونے لگیں۔ یہاں گنجوں کی فوج کے سپہ سالار کی حقیقت حاصل کر لیں گے۔

عطاء الحق قاسمی بعض اوقات اشعار اور مصرعوں کے استعمال سے بھی اپنے اسلوب کو چار چاند لگا لیتے ہیں۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> "نقوی صاحب نے پیار سے اس کی کمر کو سہلایا اور پھر مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے
> "عطا بھائی آپ کیوں پرے کھڑے ہیں، ذرا قریب آئیں۔" حالانکہ مشہور شعر ہے:
>
> حسینوں سے فقط صاحب سلامت دور کی اچھی
> نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی
>
> مگر غالباً نقوی صاحب نے یہ شعر نہیں سنا ہوا تھا!(۳۴)

یوں ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نثر میں شعروں اور مصرعوں کا بر محل استعمال کرنے پر بھی خاصی قدرت رکھتے ہیں۔ نثر میں اشعار یا مصرعوں کا استعمال بہت سے لکھاریوں کے ہاں دیکھنے میں آتا ہے یہ کام جس قدر آسان معلوم ہوتا ہے اس قدر مشکل بھی ہوتا ہے۔ شعر کے الفاظ شعر یا مصرعے کے اندر اندر اپنا ایک مخصوص معنوی نظام رکھتے ہیں اور شاعروں میں ان الفاظ کا استعمال معنوی حوالے سے ایک خاص گہرائی اور گیرائی رکھتا ہے جب انہی الفاظ کو بالکل اسی طرح شاعری کی ہیئت میں ہی نثر میں استعمال کیا جائے تو یہ امر ملحوظ خاطر رہنا ضروری ہے کہ ایک تو وہ نثر کا حصہ بنے معلوم ہوں کیوں نثر میں داخل ہونے کے بعد اگر وہ شاعری ہی معلوم ہوں تو اس سے نثر کا فنی حسن مجروح ہوگا اور نثر اور شاعری دونوں اپنے معیار سے گر جائیں گے۔ دوسرا یہ کہ وہ وہاں نثر کے مفہوم کو واضح کرتے ہوں تاکہ اپنے شاعرانہ معنوی نظم کو، کیوں نثر نگار اپنی

نثر میں شعر کا استعمال اپنی نثر کے مفہوم کو واضح اور عام فہم بنانے کے لیے کر رہا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ وہ شعر یا مصرعہ نثر میں داخل ہو کر نثر نگار کے مقصد کو پورا کرے۔ اگر وہ نثر پڑھتے وئے شعر یا مصرع نثر سے کٹا ہوا معلوم ہو تو یہ امر نثر نگاری کی خوبی کی بجائے اس کی خامی بن جائے گا۔ عطاء الحق قاسمی کی نثر میں مصرعوں اور شعروں کا استعمال یوں ہوا ہے کہ کوئی شعر یا مصرعہ ٹھونسا ہوا معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ تحریر کی روانی میں یوں گھل مل جاتا ہے کہ نثر کا ایک حصہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

بیانیہ انداز:

عطاء الحق قاسمی کی نثر سے بطورِ تخلیق کار ان کا جو پہلا مضبوط تاثر ابھرتا ہے وہ ایک مزاح نگار کا ہے۔ مزاح نگار کا بیانیہ ایسا ہوتا ہے کہ وہ سماج کی ناہمواریوں سے مزاح کے عناصر کشید کرتا ہے۔ اس کے بیانیہ میں مزاح کے ساتھ ساتھ طنز کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ اس طنز کے پیچھے وہ اصلاحی جذبہ ہوتا ہے جو ایک مزاح نگار کو تخلیق پر آمادہ کرتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی اردو نثر کے بیانیہ کو دیکھا جائے تو ان کے ہاں بھی طنز کا عنصر نمایاں ہے۔ ایک ماہر تخلیق کار کی طرح وہ بعض اوقات لطیف طنزیہ انداز میں بھی اسلوب میں خاصی جان پیدا کر لیتے ہیں:

> "مجھے اچھی طرح علم نہیں کہ گونگوں میں سیاست دان ہوتے ہیں کہ نہیں؟ تاہم امکان غالب یہی ہے کہ نہیں ہوں گے۔ کیونکہ وہ اندھیرے میں گفتگو نہیں کر سکتے، ان کی ساری گفتگو روشنی میں ہوتی ہے۔ میں نے کسی گونگے کو اقتدار میں آتے بھی نہیں دیکھا۔ البتہ اکثر لوگ اقتدار میں آنے کے بعد گونگے ہو جاتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے قومی سلامتی کے سودے ہوتے ہیں اور وہ خاموش رہتے ہیں۔"(۳۵)

سیاست دانوں کا اقتدار میں پہنچ کر ملکی سلامتی اور عوامی فلاح سے روگردانی اختیار کرنا اور صرف اپنے ذاتی مفادات کی خاطر کام کرنا اور مراعات حاصل کرنا سیاست کے نام پر ایک بدنما داغ بن چکا ہے۔ یہاں تھوڑی دیر رک کر اگر ہم اپنی سیاست اور سیاسی منظر نامے پر غور کریں تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں سیاست ایک گالی کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہم اپنے روز مرہ کے امور کے دوران بول چال میں دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص جتنا مکار، عیار، دھوکے باز اور دوسروں کو لوٹنے میں مہارت رکھتا ہو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ بہت سیاسی ہے گویا سیاسی ہونا ان منفی سرگرمیوں میں ملوث ہونے کے مترادف ہے۔ عطاء الحق

قاسمی نے سیاست دانوں کے گونگا ہونے پر جو لطیف انداز میں طنز کیا ہے وہ جہاں ایک طرف سیاست اور سیاست دانوں کے عادات وخصائل سے آگاہی دلاتا ہے وہیں دوسری طرف قاسمی کے اسلوب کو بھی تقویت بخشنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

طنز کے علاوہ عطاء الحق قاسمی کے بیانیہ کو تقویت دینے والی اہم چیز صورت واقعہ سے مزاح کے عناصر کشید کرنا ہے۔ عطاء الحق قاسمی صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں۔ کسی شخص کے ذاتی کردار کو وہ بڑی آسانی سے یوں بیان کر جاتے ہیں کہ ان کی تحریر مزاح کا اعلیٰ نمونہ بن کر قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ ایک بس ڈرائیور کی عادات و اطوار کو وہ انگریزی لفظیات استعمال کرتے ہوئے یوں بیان کرتے ہیں۔

> "اس بس سروس کے ڈرائیور ایک سابق فوجی ہیں اور وہ گاڑی بہت ریش(**Rash**) چلاتے ہیں، بلکہ انہوں نے تو دروازے پر یہ عبارت بھی درج کی ہوئی ہے۔
> "بس میں داخل ہونے سے قبل اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں، ممکن ہے یہ سفر آپ کی زندگی کا آخری سفر ہو"۔ [۳۶]

ریش انگریزی میں جلد باز کو کہا جاتا ہے، اسی مناسبت سے انہوں نے یہ لفظ یہاں استعمال کیا ہے اور پھر اس کی مناسبت سے انہوں نے گاڑی کی تیز رفتاری سے پیدا ہونے والے انجام کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ لیکن یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قاسمی صاحب مختلف چیزوں کے آپس میں تعلقات قائم کر کے مزاح پیدا کرنے میں بھی خاص مہارت رکھتے ہیں۔ جیسے ان جملوں میں دیکھا جاسکتا ہے کہ بس ڈرائیور کی طرف سے لکھائی گئی عبارت اپنی تیز رفتاری کے لیے نہیں بلکہ ویسے روزمرہ کے حادثات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تحریر کی گئی تھی لیکن قاسمی صاحب نے اس عبارت کو اس کی تیز رفتاری کے ساتھ ملا کر مزاح پیدا کر دیا ہے جس سے تحریر میں شگفتگی آگئی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریر میں جہاں فکری حوالے سے خاص مقام و مرتبے کی حامل ہیں وہاں فنی حوالے سے بھی ان کی اہمیت مسلمہ ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں جو فنی محاسن استعمال کیے ہیں ذیل میں ان کا جائزہ پیش کیا جائے گا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"محض بالوں کے کمزور پڑنے کی وجہ سے اپنے مستقبل قریب کے بارے میں مختلف قسم کے خدشات کا شکار ہو رہے تھے۔ صبح کنگھی کرتے وقت بال جس طرح پت جھڑ کی طرح گرتے ہیں اس کے کرب کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس سانحہ عظیم سے گزرتے ہیں۔" (۳۷)

یوں ایک مزاح نگار کے طور پر ان کا بیانیہ طنز اور مزاح کے حسین امتزاج سے جنم لیتا ہے۔ وہ دھیمے انداز میں سماج کی ناہمواریوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ سماج میں رونما ہونے والے مختلف واقعات سے وہ مزاح کے عناصر کشید کرتے ہیں۔ ان کے ہاں بیانیہ کی سطح پر خالص مزاح ملتا ہے۔ یہ ایسا مزاح ہے جو ان کے مزاج میں رچا بسا نظر آتا ہے۔ اس بیانیہ میں کسی قسم کا پھکڑ پن سامنے نہیں آتا۔ قاری ان کے بیانیے کی تاثیر سے اس حد تک متاثر ہوتا ہے کہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ کسی بھی سماج کی عکاسی کرتے ہوئے اپنے پُر اثر بیانیے کے زور پر قاری کو اپنے ساتھ لیے چلتے ہیں۔ مؤثر بیانیہ ان کی اردو نثر کو معاصر ادب میں اہم مقام پر فائز کرتا ہے۔

انگریزی لفظیات کا استعمال:

عطاء الحق قاسمی کے اسلوب کی ایک بڑی خوبی انگریزی لفظیات کا بر محل استعمال ہے۔ انھوں نے ایک طویل عرصہ یورپی ممالک میں گزارا جس کی وجہ سے ان کی زبان میں لاشعوری طور پر انگریزی لفظیات شامل ہوتی چلی گئیں۔ انگریزی سماج کی حقیقی عکاسی ان کی اردو نثر کا بنیادی مقصد ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ اپنی زبان میں بھی انگریزی کے الفاظ اس طرح استعمال کرتے جاتے ہیں کہ ایک تو قاری کو وہ الفاظ بے جا، بوجھل اور ٹھونسے ہوئے معلوم نہیں ہوتے تو دوسری طرف ان الفاظ کے ذریعے اس پورے واقعہ کا ثقافتی و سماجی منظر نامہ کھل کر قاری کے سامنے آجاتا ہے۔

انگریزی کے الفاظ کو اردو میں استعمال کرتے وقت عطاء الحق قاسمی نے موزونیت اور عام فہم کے عنصر کو سامنے رکھا ہے اور ایسے انگریزی الفاظ اردو میں استعمال کیے ہیں جو اردو میں مستعمل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص ثقافتی پس منظر بھی رکھتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں انگریزی زبان کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا جب ہم ثقافتی تناظر میں جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قاسمی صاحب کی تحریروں میں ان الفاظ کی شمولیت شعوری نہیں بلکہ ان کے مشاہدے کی رہینِ منت ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اس معاشرت اور ثقافت کو قریب

سے دیکھا، انھوں نے اس معاشرت اور ثقافت کے باسیوں سے براہِ راست گفتگو کی یوں ان کی تحریروں میں انگریزی الفاظ در آئے کیوں کہ انھوں نے جیسے دیکھا اور محسوس کیا ویسے ہی اپنے قارئین کو دکھاتے چلے گئے ہیں۔ وہ جہاں کی کہانی بیان کرتے ہیں وہاں کی معاشرت کے تمام رنگ صفحہ قرطاس پر بکھیر کر رکھ دیتے ہیں۔ یوں جو انگریزی کے الفاظ ان کی تحریروں میں ہمیں ملتے ہیں وہ اپنا ایک معاشرتی اور ثقافتی منظر نامہ رکھتے ہیں جسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ جب ہم اس معاشرتی اور ثقافتی منظر نامے کی طرف بڑھتے ہیں تو ہماری ملاقات انگریزی معاشرت کے ان عناصر سے ہوتی ہے جو اس معاشرے کو بنیاد فراہم کرتے ہیں اس لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان معاشرتی عناصر میں کیا کیا تبدیلیاں واقع ہوئیں اور ان عناصر نے کیا رخ اختیار کیا اسے سمجھنے اور جانچنے کی ضرورت ہے تاکہ انگریزی معاشرت کو سمجھا جا سکے۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے دوران انگریزی لفظیات کو اردو میں استعمال کرکے تحریر کی دلکشی میں خاص اضافہ کیا ہے۔ انگریزی لفظیات کا استعمال کرتے ہوئے۔ وہ مختلف واقعات کے بیان کے دوران اپنے تخیل سے ایسی رنگ آمیزی کرتے ہیں کہ بہت سے لطیف جذبات و احساسات بھی کھل کر سامنے آنے لگتے ہیں ذیل کے اقتباس سے ایک عورت مردم بیزاری کی وجہ ملاحظہ کیجیے:

> "بعض فقیر تو اپنے "سخی" کو اپنے غلط اندازے کی وجہ سے ناراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ لبرٹی مارکیٹ میں فقیروں کی فوج کے ایک "رنگروٹ" نے کار میں بیٹھی ایک خوب صورت خاتون سے امداد کے لیے کہا تو اس مردم بیزار قسم کی خاتون نے سختی سے کہا "بابا معاف کرو" اس پر اس نے ڈرائیور والی سیٹ پر بیٹھے کالے بھجنگ سے شخص کو مخاطب کیا اور کہا "بھاء ڈرائیور تم ہی اپنے اس غریب بھائی کی کچھ مدد کرو۔" اور بھاء ڈرائیور اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا کیونکہ وہ ڈرائیور نہیں اس حسینہ کا شوہر تھا۔ تب اس فقیر پہ کھلا کہ اس کے برابر بیٹھی ہوئی حسینہ اتنی مردم بیزار کیوں تھی؟" (۳۸)

بظاہر تو یہ ایک عام واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ عورت نے فقیر کو خالی ہاتھ لٹایا لیکن اس واقعہ میں انھوں نے عورت کے خاوند جو شکل و صورت سے کوئی خاص خوبصورت نہیں تھا اس کو یوں استعمال کیا ہے کہ گویا عورت ایسے خاوند کے ساتھ رہ رہ کر اس قدر مردم بیزار ہو چکی ہے کہ اب اسے کوئی بھی مرد اچھا نہیں لگتا۔

اس اقتباس میں بھی انھوں نے لفظ "رنگروٹ" استعمال کیا ہے گویا یہ فقیر ایسا ہے جسے ابھی مانگنے اور خاص طور پر شخصیت کی پہچان میں مہارت حاصل نہیں ہوئی وہ ابھی رنگروٹوں کی طرح تربیت کے مراحل طے کر رہا ہے۔ اسی لیے وہ شوہر اور ڈرائیور میں فرق نہ کر سکا اور عورت کے حسن کے مقابلے میں اس کے کالے بھجنگ شوہر کو اس کا ڈرائیور تصور کر بیٹھا یوں عورت کے ساتھ ساتھ وہ اس کے خاوند سے بھیک لینے میں بھی ناکام ہو گیا۔

اس بیان کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلوب کی جان بھی دراصل واقعات کی اصلیت پر ہوتی ہے اور واقعات کی اصلیت کو پانے کے لیے تخلیق کار کا سماجی مشاہدہ وسیع ہونا ضروری ہے۔ بصورت دیگر وہ محض انداز سے چلے گھڑتا چلا جائے گا اور جب وہ تحریر عام قاری کی نظروں کے سامنے سے گزرے گی تو اپنی اہمیت کھو دے گی کیوں کہ وہ سماج سے کٹ کر رہنے والے امور کو بیان کر رہی ہو گی۔ عطاء الحق قاسمی اپنے سماجی مشاہدے کو اپنی تحریر کی زینت بنا کر اپنے اسلوب کو نکھارتے چلے جاتے ہیں۔

انگریزی الفاظ کے استعمال کے حوالے سے دیکھا جائے تو ان کا زیادہ استعمال ان تحریروں میں ہوا ہے جو ان کے سفر یورپ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسی تحریروں میں انھوں نے بہت سے انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ذیل میں انگریزی الفاظ کے استعمال سے طنز ملاحظہ ہو:

> "گزشتہ روز اپنے دوستوں کے ساتھ دھوپ سینکتے ہوئے ایک فلیش سا ہمارے ذہن میں آیا کہ یہ جو دنیا کی مختلف قومیں "پدرم سلطان بود" کا راگ الاپتی رہتی ہیں تو یہ بہت بے جا قسم کا تفاخر ہے کیونکہ جس طرح یونیورسٹیوں میں روٹیشن سے "ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ" کا تقرر ہوتا ہے اسی طرح قدرت بھی "بائی روٹیشن" قوموں کو ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بناتی ہے۔"(۳۹)

اس اقتباس میں "فلیش" انگریزی کا ایسا لفظ ہے جو یہاں ایک اچانک خیال کے مضمون میں استعمال ہے۔ فلیش ویسے بھی کسی اچانک صورت حال کے منکشف ہو جانے کے لیے عام طور پر بولا جاتا ہے۔ دھوپ سنکیتے ہوئے ایک "فلیش" کا ذہن میں آنا گویا کسی امر کی طرف اچانک توجہ چلے جانے کا مفہوم لیے ہوئے ہے۔ اور اس کے ساتھ اگر دھوپ سینکنے کے عمل کو دیکھا جائے تو جو منظر نامہ تشکیل پاتا ہے وہ بہت اہم ہے۔ جس طرح سردیوں میں صبح کے وقت دھوپ جسم کو توانائی اور فرحت بخشتی ہے اس میں انسان کے تخیل کا بیدار ہونا خاص چیز ہے گویا تخلیق کار کے جسم میں ہونے والی اس تازگی نے اسے اچانک ایک امر کی طرف

متوجہ کر دیا ہے قوموں کے وقار اور عظمت کے پیچھے روٹیشن کا ہی عمل دخل ہے۔ جو قدرت کی طرف سے ہوتی ہے اسی روٹیشن کو وہ یونیورسٹیوں میں ہیڈ آف اردو ڈیپارٹمنٹ کے تقرر سے جوڑتے ہیں۔ روٹیشن لفظ چکر کر حصوں میں استعمال ہوتا ہے یہاں قاسمی صاحب نے قوموں کی ترقی کو قدرت کے ہاتھ میں دینے کی بات کی ہے کہ وہ ذات جس طرح اور جس قوم کو چاہتی ہے نوازتی چلی جاتی ہے اور بے نیاز ہے۔ عروج وزوال اس کے ہاتھ میں ہے۔ دوسری طرف وہ اردو ڈیپارٹمنٹ میں ہیڈ کے تقرر کو بھی یہی چکر خیال کرتے ہیں اور دراصل وہ میرٹ کے منافی ہونے والی تقرریوں کو لطیف انداز میں بیان کر رہے ہیں کہ یونیورسٹی کے کار سازوں کی پسند اور ناپسند ان ترقیوں کے لیے خاص اہمیت رکھتی ہے تاکہ شخصی قابلیت جسے روند دیا جاتا ہے۔
انگریزی الفاظ کے استعمال سے اسلوب کو مزین کرنے کی ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

> "بزنس مین کی ۳۲ سالہ خوب صورت کنواری، دونوں کانوں میں پیدائشی نقص، لڑکی کے نام کوٹھی، لڑکے کو کاروبار کے لیے نقد دس لاکھ کی رقم، شریف شہری دیہاتی کنوارے رنڈوے دوسری شادی والے فوری لکھیں............ فیکٹری اونر کی ۲۷ سالہ بیٹی، نظر معمولی کمزور، لڑکی کے نام بنگلہ گاڑی، لڑکے کو کاروبار کے لیے پچیس لاکھ روپے دیں گے............ ایک پارٹی دس لاکھ روپیہ انوسٹ کرنے پر تیار ہے، دوسری "پارٹی" بیس لاکھ روپے کی سرمایہ کاری کی پیش کش کر رہی ہے اور تیسری پارٹی نے پچیس لاکھ کی بولی لگادی ہے۔ اب سب کے ساتھ زمینیں اور فیکٹریاں علیحدہ ہیں۔"(۴۰)

"بزنس مین"، "فیکٹری اونر"، "پارٹی"، "انوسٹ" ایسے انگریزی الفاظ ہیں جو ہمارے ہاں بھی انہی معنوں میں استعمال کیے جاتے ہیں جن معنوں میں ان کا استعمال انگریزی معاشرے میں ہوتا ہے۔ اردو میں ان کے متبادل بالترتیب "تاجر"، "مل مالک"، "گروہ"، اور "سرمایہ کاری" کے الفاظ ہیں جو خود بھی مستعمل ہیں اور اپنے مفہوم کے حوالے سے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں، لیکن ان اردو الفاظ کے ہوتے ہوئے بھی قاسمی نے انگریزی الفاظ کو اس طرح استعمال کیا ہے کہ ان کی تحریر کی روانی بھی متاثر نہیں ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ اس بیان میں ان الفاظ کے استعمال سے ایک خاص تاجرانہ اور امیرانہ رعب بھی پیدا ہوا ہے جو اصل میں وہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔

لڑکی کے رشتے کے لیے دیا جانے والا اس طرح کا اشتہار، اشتہار کم اور تجارتی تشہیر زیادہ معلوم ہو رہا ہے اور تجارت میں چوں کہ بزنس مین، فیکٹری اونر اور انوسٹ منٹ کے الفاظ کا عام استعمال ہو تا ہے اس لیے اس تجارتی منظر نامے کو بحال رکھنے کے لیے انھوں نے ایسے اشتہارات میں انگریزی کا استعمال کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایک طرح سے کسی اخباری اشتہار برائے ضرورت رشتہ کو اپنی تحریر میں نقل کر رہے ہیں اور اس نقل کے دوران اس کی اصل عبادت کو بعینہٖ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ استعمال بھی وہ اس فنی مہارت سے کرتے ہیں جس سے تحریر ضرورت رشتہ کی بجائے ایک خاص کاروباری رنگ لیے سامنے آتی ہے۔ یوں وہ اس تحریر کی اصلیت اپنے قارئین کے سامنے نہیں کرتے ہیں کہ ایسے اشتہار ضرورت سے زیادہ تجارت کے زمرے میں آتے ہیں۔ قاسمی کے اسلوب کا ایک لطیف انداز ملاحظہ ہو:

> "صبح ایک گاہک آیا وہ خود سنگل پسلی کا تھا۔ جب اس نے میری قیمت سنی تو کہنے لگا
> اس بٹیرے کے اتنے پیسے؟ میرا جی چاہا کہ اس کے پیٹ میں ٹڈھ ماروں تاکہ اسے پتہ
> چلے کہ بٹیرے اور بکرے میں کیا فرق ہوتا ہے۔"(۴۱)

اس اقتباس میں لفظ "سنگل پسلی" قابل غور ہے۔ سنگل (Single) انگریزی لفظ ہے جو اکیلا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور عام طور پر اسے لفظ پسلی کے ساتھ استعمال کر کے ایسا شخص قرار لیا جاتا ہے جو بالکل دُبلا پتلا ہو سنگل پسلی کو حقیقی معنوں میں دیکھا جائے تو اس سے مراد وہ شخص ہے جس کی ایک پسلی ہو، اب ظاہر ہے کی ایک پسلی والا شخص ہونا تو ناممکن ہے اس لیے اسے ان حقیقی معنوں میں ہر گز استعمال نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے عام لوگوں کی زبان میں استعمال کیا جائے گا اور سنگل پسلی سے مراد وہ شخص لیا جائے گا جو زیادہ موٹا نہ ہو بلکہ دُبلا پتلا ہو یا دوسرے لفظوں میں سوکھ کر کانٹا بنا نظر آتا ہو۔

عطاء الحق قاسمی جب کوئی انگریزی لفظ استعمال کرتے ہیں تو بیان کے دوران سماجی اور ثقافتی منظر نامے کو بھی خاص طور پر سامنے رکھتے ہیں۔ یہاں وہ بکر امنڈی کا منظر بیان کر رہے ہیں جس میں موٹے اور دبلے پتلے بکروں کا ذکر عام چلتا رہتا ہے اور کمزور بکروں کے لیے بھی سنگل پسلی بکرا یا دیگر بہت سے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں اس منظر نامے میں انھوں نے ایک خریدار کے لیے بھی سنگل پسلی کا لفظ استعمال کیا ہے اور جب قاری ان کی یہ تحریر مکمل پڑھتے ہوئے بکروں اور مختلف خریداروں کے ذکر کے ساتھ چلتے ہوئے اس لفظ سنگل پسلی پر پہنچتا ہے تو یہ لفظ اسے اس منظر نامے میں خاص موزوں لگتا ہے۔ ثقافتی پس منظر کے حوالے سے

ان کے ڈرامے" ہر فن مولا" میں بھی بہت سے انگریزی الفاظ اس ثقافت کی عکاسی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس ڈرامے میں ایک مکالمے میں کرداریوں گفتگو کرتا ہے۔

"تھینک یو فار کمنگ I will let you know later on"(۴۲)

عطاء الحق قاسمی کے ڈراموں میں ڈراما حویلی کو خاص اہمیت حامل حاصل ہے۔ یہ ڈراما اپنے پلاٹ اور کردار نگاری کے باعث اردو کے معروف ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی کئی جگہ انھوں نے انگریزی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو ہم روزمرہ بول چال میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔ ایک جگہ ایک کردار کہتا ہے:

"آپ رونڈ نہ ماریں، آپ پہلے بھی آؤٹ(Out) ہو چکے ہیں۔" (۴۳)

آؤٹ(Out) کا لفظی معنی "باہر ہونا" ہوتے ہیں۔ یہ کرکٹ کی ایک کثیر الاستعمال اصطلاح بن چکی ہے۔ اور اس کا استعمال اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ اب دنیا کی کسی بھی زبان میں کرکٹ کے کھلاڑی کے میدان سے باہر ہو جانے کے لیے آؤٹ ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا متبادل اردو لفظ "باہر ہونا" کرکٹ میں کہیں بھی استعمال نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ قاسمی صاحب نے بھی یہاں باہر ہو جانے کے عمل کے لیے آؤٹ ہی استعمال کیا ہے۔ یہ لفظ اپنے استعمال کی وجہ سے اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اب یہ اردو کا ہی لفظ شمار کیا جا سکتا ہے۔

ڈراما حویلی میں بعض انگریزی الفاظ ایسے بھی استعمال ہوئے جن کے اردو میں نہ صرف متبادل موجود ہیں بلکہ بولے بھی جاتے ہیں۔ لیکن عام بول چال میں اکثر لوگ انگریزی کا لفظ ہی استعمال کر جاتے ہیں۔ یہ الفاظ بھی کثیر الاستعمال ہونے کی وجہ سے اردو زبان میں خاصے رچ بس گئے ہیں۔ اس کی ایک مثال دیکھیے:

"آپ تھوڑی دیر ٹھہرئے میں کپڑے چینج (**Change**) کر کے آتا ہوں۔" (۴۴)

چینج (Change) انگریزی لفظ ہے جس کا متبادل "تبدیل کرنا" اردو میں موجود اور مستعمل ہے۔ لیکن سماج میں اس لفظ کا استعمال اس قدر زیادہ ہو گیا ہے کہ یہ اب عام بول چال میں استعمال ہونے لگا ہے۔ قاسمی کی تحریر چوں کہ سماج کے حقیقی منظر نامے کے قریب ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنے ڈراموں میں مختلف سماجی رویوں کی عکاسی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ڈراموں میں جو زبان استعمال ہوئی ہے وہ بھی حقیقی زبان ہے جو آج کے سماج میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ عام بول چال کی زبان میں انگریزی کے الفاظ کی جس قدر شمولیت

ہے وہ قاسمی صاحب کے ڈراموں کی زبان میں بھی نظر آتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ڈراما لکھتے وقت سماج کے محض واقعات کو ہی مد نظر نہیں رکھا بلکہ سماج کی لسانی صورت حال کا بھی بخوبی احاطہ کیا ہے۔

انگریزی معاشرے میں جنس کے کاروبار کو خاص اہمیت حاصل ہے اور جنسی تسکین کے ساتھ ساتھ جنسی برانگیختی کے ذرائع کو بھی خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کے ماحول میں مختلف ایسے کام اور کاروبار ملتے ہیں جن میں دیگر امور کے ساتھ ساتھ جنسی برانگیختی کا بھی سامان کیا جاتا ہے۔ وہاں جنس ایک کاروباری تشہیر کا بھی ذریعہ ہے اس لیے مختلف ریستورانوں میں اس کا اہتمام بھی خاص طور پر کیا جاتا ہے کہ کھانے کے لیے آنے والے افراد کی جنسی برانگیختی کا بھی سامان کیا جائے اور اس جنسی برانگیختی کی لذت کے حصول کے لیے آنے والوں کی وجہ سے کاروبار میں ترقی لائی جائے۔ عطاء الحق قاسمی ایسے ہی ایک واقعہ کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "ہال کی چاروں طرف تقریباً دس فٹ بلند میزیں دھری تھیں۔ جن پر سیکسی لباس میں ملبوس ہیجڑے "ہیجان انگیز" ناچ سے تماشائیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے میں مشغول تھے۔ سامنے ایک بالکونی ٹائپ چیز تھی جس میں ایک موٹی سی عورت کھڑی منہ سے آگ نکال رہی تھی۔ یہاں ویٹرز کی بجائے کم عمر ویٹر تھے جو ہونٹوں کو سرخی سے مسکائے ہوئے تھے۔"(۴۵)

یہ اس انگریزی معاشرے کا عام چلن ہے جس میں جنس کو کاروبار کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہیجڑوں کا سیکسی لباس میں ہیجان انگیز ناچ کے ذریعے دوسروں کو جذبات کو برانگیختہ کرنا اصل میں ان کو اس لذت کی طرف لے جانے کا راستہ ہے جس میں پڑ کر وہ اپنی دولت اس سرمایہ دار پر لٹاتے چلے جاتے ہیں جس نے سرمایہ لگا کر یہ سارا کھیل کھیلا ہوتا ہے۔ اس صورت میں سرمایہ دار صرف دوسروں کی محنت سے ہی اپنے سرمائے کو نہیں بڑھاتا بلکہ دوسروں کی جمع پونجی بھی براہ راست ہتھیانے کی سعی کرتا اور اس میں کافی حد تک کامیابی حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔

لفظ سیکسی Sexy کے حوالے میں ابتدائی صفحات میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے۔ یہاں ایک اور انگریزی لفظ ویٹر استعمال ہوا ہے۔ ویٹر سے مراد وہ لڑکے، لڑکیاں یا ملازمین ہیں جو ہوٹلوں یا ریستورانوں میں کھانا پیش کرنے کے لیے رکھے ہوتے ہیں۔ اردو میں ان کا متبادل 'بیرا' بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اب کچھ سالوں سے مشرقی معاشرے میں بیرا کی بجائے ویٹر کا استعمال زیادہ کیا جارہا ہے۔

عطاء الحق قاسمی چوں کہ انگریزی معاشرے کا ذکر کر رہے ہیں اس لیے وہاں کے سماجی پس منظر کے ساتھ ان کی تحریر میں بیرا کی بجائے لفظ ویٹر کا استعمال موزوں ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انگریزی معاشرے کی عکاسی کرتے وقت وہاں کے تمام امور کے لیے انگریزی کے ہی الفاظ استعمال کیے جائیں گے کہ اس معاشرے میں ان کو ان الفاظ سے پکارا جاتا ہے اس لیے اردو تحریر میں بھی یہی لگے گا؟ اس سوال کا جواب یقینا نفی میں ہے۔ کیونکہ اردو میں اپنے تاثرات و مشاہدات بیان کرنے والا یقینی طور پر اُس معاشرے کا بیان کرتے وقت بھی اردو ہی استعمال کرے گا لیکن بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کا اردو میں بھی استعمال ویسا اور اس مقصد کے لیے ہو رہا ہوتا ہے جیسا اور جس مقصد کے لیے انگریزی میں ہوتا ہے تو ایسے الفاظ کو انگریزی معاشرے کی عکاسی کرتے وقت بیان کرنے سے نہ صرف تحریر میں جان پیدا ہو جاتی ہے بلکہ قاری الفاظ کی مناسبت سے اس معاشرے کو زیادہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے بعض جگہ انگریزی زبان کے الفاظ اس طرح بھی بیان کیے ہیں اس کے ساتھ اسی جملے میں اس کے اردو مترادف بھی استعمال کیے ہیں یوں ان کی تحریر میں زیادہ نکھار پیدا ہو گیا ہے۔ اس حوالے سے ذیل کا ایک اقتباس دیکھیں۔

> "یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی کوئی چیز گر گئی ہو اور وہ کوئی بہت باریک سی چیز ہو جسے ڈھونڈنے کے لیے ناک فرش پر جما کر ڈھونڈنا پڑا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انھیں کمرے سے SMELL سی آ رہی ہو اور وہ قالین سونگھ رہے ہوں کہ کہیں یہ بو قالین سے تو نہیں آ رہی۔"[۴۶]

اب ان جملوں میں دیکھا جائے تو بُو اور SMELL ایک ہی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں یعنی ایسی بو جو ناگوار گزرے۔ Smell کا لفظ ہم اردو میں بھی انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں جن کے لیے یہ انگریزی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس کے استعمال کی صورت ایسی اختیار کی گئی ہے کہ گویا یہ اردو کا لفظ ہی بن کر رہ گیا ہے۔ کہیں بھی محسوس نہیں ہوتا کہ یہ لفظ اردو میں ٹھونسا گیا ہے۔

Smell کے سماجی تناظر کو دیکھا جائے تو یہ لفظ اس ناگوار بو کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو انسانی طبیعت میں خلل پیدا کرے اور انسان اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں لگ جائے۔ اس ناگوار بو کی نوعیت عام طور پر ہلکی ہوتی ہے۔ ہم اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں کسی چیز میں سے ہلکی ناگوار بو آ رہی ہو تو اس

کے لیے کہا جاتا ہے کہ Smell آ رہی ہے۔ لیکن اگر بو زیادہ تیز ہو اور انسان ناک پہ ہاتھ رکھے بغیر وہاں سے گزر نہ سکتا ہو تو اس کے لیے Smell کا لفظ نہیں بولا جاتا بلکہ بدبُو بولا جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریر کے اس اقتباس سے جو صورت حال سامنے آ رہی ہے اس میں قالین کو سونگھنے کا عمل ہے۔ اب ظاہر ہے بچھے ہوئے قالین میں سے تیز بدبو بلکہ اس قالین کی ہی ہلکی ناگوار بُو آنے کا امکان ہے اس لیے ایسی صورت میں Smell کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں صرف ان تحریروں میں ہی انگریزی زبان کا استعمال نہیں ہوا جو انھوں نے انگریزی معاشروں کے بارے میں لکھی ہیں بلکہ ان کی دیگر بہت سی تحریروں میں بھی بہت سے انگریزی الفاظ کا برمحلا استعمال ملتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انھوں نے ان تحریروں میں بھی انگریزی الفاظ کے سماجی و ثقافتی منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے استعمال کیا ہے۔ مثلاً نذیر ناجی کے بارے میں بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "میں نذیر ناجی کو اگرچہ جنگ جو کالم نگار سمجھتا ہوں۔ یہ ایسا جنگ جو ہے، جو لڑتے وقت بھی ہنستا رہتا ہے وہ فزیشن نہیں سرجن ہے اور آپ جانتے ہیں کہ فزیشنز کے پاس نزلہ زکام کے علاوہ شاید ہی کسی بیماری کے علاج ہو جبکہ سرجری کہیں سے کہیں پہنچ چکی ہے۔"(۴۷)

اس اقتباس کو دیکھا جائے تو اس میں فزیشن اور سرجن کے کے انگریزی زبان کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہ دونوں الفاظ طبی علوم کی ڈگری کے ہیں۔ فزیشن ایسے معالج کو کہا جاتا ہے جو عام بیماریوں کا علاج تو کرتا ہے لیکن سرجری اور دیگر اہم طبی امور سرانجام نہیں دیتا جبکہ سرجن ایسے معالج کو کہا جاتا ہے جو جراحی کے عمل کا بھی ماہر ہوتا ہے۔ ان دونوں الفاظ کو نذیر ناجی کی شخصیت بیان کرنے کے لیے استعمال کرنے کے حوالے سے دیکھا جائے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قاسمی صاحب نے شخصیت کے بیان میں ان کا استعمال خاصا برمحل کیا ہے۔

فزیشن کے کام میں ارتقا کا عنصر اتنا نہیں جتنا کہ سرجن کے کام میں ہے۔ یہ دونوں ہی مسیحائی سے وابستہ ہیں یعنی دونوں کا کام ہی سماج کے دکھوں کا مداوا کرنا ہے لیکن دونوں کا اپنا اپنا ایک مخصوص انداز ہے جس کے ذریعے وہ سماج کے دکھوں کو کم کرنے کی سعی کرتے نظر آتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے نذیر ناجی کو سماج کے دکھوں کا مداوا کرنے والے کالم نگار کے طور پر پیش کرنے کے لیے سرجن کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس

کا سماجی تناظر یہ ہے کہ جس طرح ایک سرجن ہر دور میں نت نئی بیماریوں کے علاج کے لیے سرجری کے بھی نت نئے طریقے سامنے لاتا رہتا ہے اور سرجری کے عمل میں وسعت ہر نئے دن کے ساتھ پیدا ہو رہی ہے اسی طرح نذیر ناجی ایک کالم نگار ہونے کے ناتے سماج کے دکھوں کا مداوا نئے سے نئے انداز میں کرتا رہتا ہے۔ جس طرح ایک سرجن کے کام میں جمود نہیں بلکہ ایک ہی مرض کے لیے ایک ہی عضو کی سرجری کے طریقے ہر دور میں تبدیل ہو کر نئے سے نئے انداز میں سامنے آرہے ہیں اسی طرح نذیر ناجی کے مشاہدے اور تخیل میں بھی جمود نہیں بلکہ وہ ہر بدلتے دن کے ساتھ اپنے قلم کی کاٹ کو تیز کرتے جاتے ہیں۔

بعض اوقات عطاء الحق قاسمی انگریزی زبان کے الفاظ تحریر کے اس قدر رواں انداز میں کر جاتے ہیں کہ تحریر میں انگریزی لفظ نہ صرف یہ کہ بوجھل محسوس نہیں ہوتا بلکہ تحریر کو مزید روانی بھی عطا کرتا چلا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے بارے میں اک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "حریت میں سلیم احمد نے لکھا ہے، "مشرق" میں دو کالم انتظار حسین نے باندھے ہیں نجی محفلوں میں جو کھچائی ہو رہی ہے وہ اس کے علاوہ ہے یعنی بطور 'بونس' ہے، سو قارئین کرام یہ وہ حالات ہیں جن کے تحت ہم مجبور ہو گئے ہیں کہ اپنے استاد مکرم کے پہلو میں جا کھڑے ہوں اور جو "ٹھاپیں" انہیں پڑ رہی ہیں اس میں سے کچھ ہم بھی **SHARE** کریں۔"(۴۸)

اس تحریر میں دیکھا جائے تو انھوں نے اپنے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں کسی تقریب میں ان کی پذیرائی ہو رہی ہے۔ انتظار حسین نے ان کے بارے میں کالم لکھے ہیں جن پر ان کو فخر ہے اس کے علاوہ نجی محفلوں میں بھی ان کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس تذکرے کو وہ "بونس" قرار دیتے ہیں۔ بونس BONUS انگریزی لفظ ہے جس کا معنی وہ اضافی آمدنی ہے جو کسی کام کے صلے میں پہلے جتنی ہی محنت کے عوض کسی کو حاصل ہوتی ہے۔ یہاں گویا وہ انتظار حسین کے کالموں کو اپنی اصل کمائی یا اجرت قرار دے رہے ہیں جو ان کی خدمات کا اعتراف ہے اور ساتھ ہی انہی خدمات پر نجی محفلوں میں ہونے والے ان کے چرچے ان کے لیے اضافی عزت اور شہرت کا باعث بن رہے ہیں اس لیے ان کو بونس قرار دیا جا رہا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں انگریزی زبان کے الفاظ دو طرح سے استعمال ہوئے کہیں تو انھوں نے صرف ایک لفظ استعمال کیا ہے اور وہ لفظ بھی ایسا ہے جو اسی طرح ہی اردو میں بھی استعمال ہوتا ہے اور

دوسری صورت یہ ہے کہ عطاء الحق قاسمی نے انگریزی کے ایک سے زیادہ الفاظ یا کوئی جملہ اس طرح استعمال کیا ہے کہ وہ ان کے مفہوم اور مدعا کو بہتر انداز میں بیان کر گیا ہے۔ اس طرح کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

"ہم نے خود کو تھوڑی دیر کے لیے لیڈی ڈیانا کی جگہ محسوس کیا تو لگا جیسے آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اور وہ بے بسی کے عالم میں دانت کچکچا رہی ہیں بلکہ پہلوان جی کے ہاتھوں سے نکلنے کی کوشش کر رہی ہیں اور ناکامی کی صورت میں پہلوان جی کے ہاتھوں پر کاٹنے کی سوچ رہی ہیں۔ مگر یہ غالباً ہماری **WISH FULL THINKING** ہے کیوں کی تصویر تو بے بس ہوتی ہے۔"(۴۹)

عطاء الحق قاسمی چوں کہ ایک مزاح نگار ہیں۔ ان کی تحریروں میں ظرافت کا عنصر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف واقعات اور مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے بھی مزاح اور ظرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانتے دیتے۔ یہاں وہ لیڈی ڈیانا سے خود کو مشابہ قرار دے کر تصوراتی اور تخیلاتی سطح پر خود کو اس کی جگہ محسوس کر رہے ہیں اور سماجی منظرنامے میں بہترین رنگ بھر رہے ہیں یہاں انھوں نے اپنی خواہشات کو WISH FULL THINKING قرار دیا ہے جس سے مراد شدید خواہش سے بھری سوچ ہے۔ انگریزی کے ان الفاظ کا اردو میں یوں خوبصورت استعمال قاسمی ہی کا خاصا ہے کہ تخیل اور خواہش ایک جگہ ایک ہی جملے میں جمع کر دیا یوں انگریزی الفاظ کا یہ استعمال ان کی خواہش کا غماز بن کر ابھرا۔ اس طرح ایک اور جملے میں انگریزی الفاظ کا استعمال ملاحظہ کریں۔

"کھانے کے دوران میرے دوست نے پوچھا "تمہاری کتنے سال سروس ہو گئی ہے؟"(۵۰)

سروس عام طور پر خدمت کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ ورنہ یہاں جن معنوں میں سروس کا استعمال ہو رہا ہے وہ اصل میں ملازمت کا عرصہ ہے کہ ایک شخص نے کتنا عرصہ ملازمت کر لی ہے۔ اس لفظ سروس (Service) کے سماجی پہلو کو دیکھا جائے تو ایک ملازم اپنی تنخواہ کے عوض جو امور سرانجام دیتا ہے وہ حقیقت میں اس کی خدمات ہوتی ہیں جو معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے وہ انجام دے رہا ہوتا ہے کیونکہ ان خدمات کا کوئی مول نہیں ہوتا یہ کسی صورت نہیں کہا جا سکتا کہ وہ تنخواہ یا اجرت لے کر یہ امور انجام دے رہا ہے کیونکہ سماج میں دیکھا جائے تو جتنی تنخواہ اس کو ملتی ہے اس کی صلاحیتوں کے وہ عشر عشیر بھی نہیں ہوتی۔ کیوں کہ ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے افراد جو کسی خاص صلاحیت کے حامل نہیں ہوتے اور نہ

ہی زیادہ تعلیم یافتہ ہوتے ہیں لیکن باصلاحیت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے سے بہت زیادہ دولت کمار ہے ہوتے ہیں۔ یوں ثابت ہوتا ہے کہ تنخواہ اور ملازمت کے امور کی انجام دہی کا آپس میں کوئی تعلق نہیں بلکہ تنخواہ ان خدمات کا اعتراف ہوتی ہے جو وہ کسی ادارے یا سماج کے لیے انجام دے رہا ہوتا ہے۔اس لیے ملازمت یا نوکری کی بجائے سروس (Service) کا لفظ ایک خاص سماجی منظر نامے اور اعتراف خدمات کی عکاسی لیے ہوئے ہے۔اس کی جگہ ملازمت یا نوکری کے لفظ کا استعمال ان خدمات کی تحقیر کرنے کے مترادف ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریر میں انگریزی الفاظ کے استعمال کے باوجود بوجھل محسوس نہیں ہوتی۔اس کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ انھوں نے جو انگریزی کے الفاظ استعمال کیے ہیں وہ ایک خاص سماجی منظر نامے کو سامنے رکھ کر کیے ہیں ایک جگہ اپنے سفر ناموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "ان سفر ناموں، ڈیروں اور فوجی بیرکوں میں جو کردار ایک ایک کر کے سامنے آتے ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔کبیر خان نے ان کرداروں کو جس طرح "پینٹ" کیا ہے وہ کوئی بڑا تخلیق کار ہی کر سکتا ہے۔"(۵۱)

اس بیان کی روشنی میں دیکھا جائے تو لفظ "بیرک" انگریزی کا وہ لفظ ہے جو اردو میں بھی خاص انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جن معنوں کے لیے انگریزی میں استعمال کیا جاتا ہے۔فوجیوں کے رہنے کے لیے چھاؤنی میں بنائے جانے والے کمرے یا رہائش گاہیں بیرک کہلاتی ہیں۔ آگے بڑھیں تو لفظ "پینٹ" (Paint) کا استعمال بھی نہایت موزوں ہے۔اس لفظ کے بارے میں گزشتہ صفحات میں بھی تفصیل سے بات کی جا چکی ہے۔

پینٹ (Paint) کا لفظ یہاں عطاء الحق قاسمی نے کرداروں کو نکھارنے کے حوالے سے استعمال کیا ہے۔یہ ایک اچھے تخلیق کار کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ کسی کمزور کردار کو بھی اس طرح آگے بڑھاتا ہے کہ اس کی کمزوریاں پوشیدہ ہوتی چلی جاتی ہیں اور اس کی خوبیاں اور صلاحیتیں نکھر کر سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ گویا لفظ پینٹ کا استعمال کمزوریوں کو چھپانے اور خوبیوں کو نکھارنے کے معنوں میں کیا گیا ہے۔اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے رک کر اسی لفظ Paint کے حقیقی معنوں پر غور کریں تو اس کا مفہوم یوں سامنے آتا ہے کہ کسی دیوار، تختے، گھر یا کسی بھی اور چیز پر کسی رنگ وغیرہ کی تہیں اس طرح جما دینا کہ اس میں پائی جانی والی بدصورتی اور خامیاں اس تہہ کے نیچے چھپ جائیں اور اس کا حسن نکھر کر سامنے آجائے۔ گویا پینٹ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے کاریگر یا فن کار کسی کے حسن میں نکھار پیدا کر کے اسے قابل قبول اور خوبصورت شکل میں سامنے

لاتا ہے۔ اب یہاں قاسمی صاحب کی طرف سے اس لفظ پینٹ Paint کے استعمال کو دیکھا جائے تو وہ تخلیق کار کی طرف سے اس کے کرداروں کو پینٹ کرنے کے حوالے سے بات کر رہے ہیں۔ کردار بہت سی شخصی خوبیوں اور خامیوں کا منبع ہوتا ہے اس کو اس طرح نکھار کر پیش کرنا کہ اس کی خوبیاں اور اس کی خامیوں پر غالب آجائیں پینٹ کرنے کے زمرے میں آئے گا یہی کچھ قاسمی صاحب یہاں اس لفظ کے استعمال سے مطلب اور مقصد پورا کرنا چاہتے ہیں۔

انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے وقت وہ معاشرے کے حوالے سے گہرے مشاہدے کو خوب کام میں لاتے ہیں۔ نہ صرف انگریزی معاشرے بلکہ مشرقی معاشرے اور مشرقی سماج کے بیان میں بھی انگریزی کے الفاظ برمحل استعمال کرتے ہیں:

"حکیم صاحب "مالیخولیا" کے پرنٹنگ پریس میں کام کرتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنے سائیکل پر "پریس" کی تختی لگائی ہوئی تھی۔"(۵۲)

اس مختصر اقتباس کو دیکھا جائے تو عطاء الحق قاسمی کے فکر و فن کے حوالے سے کئی گوشوں سے آشنائی ہوتی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ بہت سی چیزوں کے آپس میں تعلق کو بڑے لطیف انداز میں واضح کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ مثلاً اسی جملے میں دیکھیں کہ حکیم صاحب اور "مالیخولیا" بظاہر اس جملے میں حکیم صاحب اور مالیخولیا کا تعلق پہلی نظر میں قاری کو ایک طبیب اور مرض کا تعلق نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں وہ حکیم صاحب کے کردار کے لیے ایسے پرچے کو سامنے لا رہے ہیں جس کا نام ان کی پیشہ ورانہ زندگی سے میل کھاتا ہے۔ مالیخولیا یہاں ایک پرچے کے نام کے طور پر استعمال ہوا ہے نہ کہ مرض کے طور پر۔ اب آتے ہیں انگریزی الفاظ کی طرف تو یہاں لفظ پرنٹنگ پریس اور پریس کا استعمال ہوا ہے۔ پرنٹنگ پریس Printing Press اصل میں اس ادارے کو کہا جاتا ہے جو مختلف اخبارات، جرائد اور کتب طباعت کا کام کرتا ہے۔ اس لیے لفظ "مطبع" بھی استعمال ہوتا رہا ہے جس اخبار کی اشاعت زیادہ تعداد میں ہو وہ اپنا ذاتی یہ ادارہ بھی قائم کر لیتا ہے جو اس کا پرنٹنگ پریس کہلاتا ہے۔ اس انگریزی لفظ کو مختصر کرتے ہوئے عام طور پر "پریس" (Press) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو سماج میں رائج ہے۔ اب اگر انگریزی لفظ پریس press کو اس کے حقیقی معنوں میں دیکھا جائے تو اس کا مطلب تہہ جمانا کے بھی ہیں اور کسی چیز کو دبا دینا بھی پریس کرنا کے زمرے میں آتا ہے لیکن سماج میں پرنٹنگ پریس کو مختصر کر کے جو لفظ پریس رائج کیا گیا ہے یہ جہاں بھی استعمال ہوتا ہے مختصر ہونے کے باوجود پرنٹنگ پریس کے مکمل معنی دیتا ہے۔ صحافی اور رپورٹر جو کسی صحافتی

ادارے سے وابستہ ہوتے ہیں وہ اپنی پہچان کے لیے اپنی گاڑیوں پر Press کی تختی لگاتے ہیں یہاں حکیم صاحب نے گاڑی نہ ہونے پر سائیکل سے ہی یہ کام لیا ہے جو قاسمی کے مشاہدہ کی دلیل ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> "حکیم صاحب کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ مریض کو دوا دینے سے پہلے یہ دوا خود پر آزماتے تھے، جس کے ری ایکشن کی وجہ سے انہیں گوناگوں بیماریاں لاحق ہوگئی تھیں اور یوں وہ سوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے۔"(۵۳)

ری ایکشن (Re-action) کا لفظ "الٹے عمل" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسے عمل کو ظاہر کرتا ہے جس کے نتائج انسان کی خواہشات کے بالکل برعکس سامنے آتے ہیں یہاں تک طبابت کے پیشے میں اس لفظ کے استعمال کا تعلق ہے تو یہ لفظ ری ایکشن سماج میں خاصا مستعمل ہو چکا ہے۔ آج وہ لوگ جو انگریزی سے نابلد ہیں وہ بھی کسی دوا کے الٹے عمل کو "الٹا عمل" یا "متضاد عمل" کہنے کے بجائے ری ایکشن کا لفظ ہی استعمال کرتے ہیں۔ یوں سماجی حوالے سے یہ لفظ اپنا ایک وسیع مفہوم اور منظر نامہ رکھتا ہے۔

ری ایکشن کے عمل سے دوا نہ صرف یہ کہ مرض کو ختم کرنے میں معاون ثابت نہیں ہوتی بلکہ "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کا مصداق بن کر مریض کے لیے پہلے سے زیادہ تکلیف کا باعث بنتی ہے اور عین ممکن ہے کہ اسے پہلے مرض کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سے امراض کا شکار کر دے۔ عام مشاہدے میں یہ بھی آیا کہ کسی دوا کے ری ایکشن نے مریض کی جان ہی لے لی۔ یوں اس لفظ کے استعمال سے قاسمی صاحب نے اردو میں انگریزی کو اس طرح سمویا ہے کہ اس کی سماجی حیثیت متاثر نہیں ہونے دی۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان کے الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ وہ مختلف پیشوں اور فنون کی وضاحت بھی کرتے چلے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال فکری تناظر میں جہاں خاص سیاسی، سماجی اور ثقافتی عکاسی کرتا ہے وہیں فنی حوالے سے بھی ان کی تحریریں خاص اہمیت کی حامل ہیں اور ان کی تحریریں ان فنی محاسن سے مالا مال ہیں جو اچھی نثر کے لیے ضروری ہوتے ہیں، انگریزی الفاظ کے استعمال کے باوجود ان کی تحریروں کا اسلوب شگفتہ اور رواں ہے اور قاری کو کہیں بھی انگریزی الفاظ کے استعمال کے باوجود تحریر میں بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا بلکہ ان کی نثر رواں ہی رہتی ہے۔ مغرب میں دولت اور پیسے کی دوڑ نے انسانوں سے آرام و سکون کی دولت چھین لی ہے، ان کی آرام گاہیں

بھی سکڑ گئی ہیں کیوں کہ اب وہ آرام گاہیں انسان کے آرام کے لیے نہیں بلکہ اس کی ایک ضرورت کو پورا کرنے کے لیے موجود ہیں یوں ان کے ہاں انسان سے زیادہ وقعت چیزوں کی بن چکی ہے۔عطاء الحق قاسمی چو ں کہ ایک مزاح نگار ہیں۔ان کی تحریروں میں ظرافت کا عنصر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ مختلف واقعات اور مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے بھی مزاح اور ظرافت کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہاں وہ لیڈی ڈیانا سے خود کو مشابہ قرار دے کر تصوراتی اور تخیلاتی سطح پر خود کو اس کی جگہ محسوس کر رہے ہیں اور سماجی منظر نامے میں بہترین رنگ بھر رہے ہیں۔عطاء الحق قاسمی کے ڈراموں میں ڈراما حویلی کو خاص اہمیت حامل حاصل ہے۔ یہ ڈراما اپنے پلاٹ اور کردار نگاری کے باعث اردو کے معروف ڈراموں میں شمار ہوتا ہے۔ اس ڈرامے میں بھی کئی جگہ انھوں نے انگریزی کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یہ وہی الفاظ ہیں جو ہم روز مرہ بول چال میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔

محاورات کا استعمال:

فکر اور فن دو ایسی خصوصیات ہیں جن میں عمدگی سے ہی ایک جاندار تخلیق سامنے آتی ہے۔ کسی بھی تخلیق کے لیے فکر کی بلندی، عمدگی اور گہری بصیرت ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ تخلیق فنی حوالے سے بھی خاص اہمیت کی حامل ہو۔ فکر خواہ کیسی ہی بلند اور احسن کیوں نہ ہو اگر تخلیق کار کا قلم اس فکر کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے ہوئے فنی محاسن کو نظر انداز کر دے تو وہ تخلیق اپنا جائز اور اصل مقام و مرتبہ حاصل کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ فنی طور پر کسی تخلیق کو جامع اور احسن بناتے وقت تخلیق کار مختلف تشبیہات، استعارات، محاورات اور دیگر فنی لوازمات کو تحریر میں یوں برتتا ہے کہ اس تحریر کا حسن نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔

محاورہ کسی بھی تحریر کو فنی حوالے سے نکھارنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔عطاء الحق قاسمی نے اپنی اردو نثر میں انگریزی لفظیات کے ساتھ محاورات سے بھی خوب کام لیا ہے۔ محاورات کے استعمال سے ان کی نثر میں خاصی جان پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ معنوی حوالے سے بھی خاصی وسعت پیدا ہوئی ہے۔ قاسمی کے ہاں محاورات کا استعمال دیکھیے:

"پروین شاکر نے تو حد کردی، ایسے نازک جذبات اور احساسات کو مختلف امیجز سے اپنی شاعری میں داخل کیا کہ ہم ایسے چھوئی موئی لوگ تو دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ گئے۔"(۵۴)

"دانتوں میں انگلیاں داب کر رہ جانا" کا محاورہ حیران ہونے اور ششدر رہ جانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ انسان کے سامنے اچانک کوئی ایسا کام یا واقعہ رونما ہو جانا جو بظاہر ناممکن نظر آ رہا ہو۔ ایسی صورت میں انسان کی حیرانی اپنے عروج کو پہنچ جاتی ہے یہاں قاسمی صاحب اس محاورے کے ذریعے پروین شاکر کے فکر و فن کو یوں واضح کر رہے ہیں کہ گویا پروین شاکر نے نازک جذبات، احساسات اور مختلف امیجز کو شاعری میں اس لطیف انداز میں بیان کیا ہے کہ سب کو ششدر کر کے رکھ دیا ہے۔

بعض اوقات وہ اپنی تحریروں میں انگریزی محاورات کا استعمال بھی بڑی خوبصورتی سے کرتے ہیں:

"پٹرول تو جہاں ہم کھڑے ہیں، وہیں سے نکالنا پڑے گا، کیونکہ دور دور تک مجھے پٹرول پمپ تو کوئی نظر نہیں آتا۔ میں نے اس گھمبیر صورت حال میں خوش طبعی کا مظاہرہ اس انگریزی محاورے کو مد نظر رکھتے ہوئے کیا جس کے مطابق اگر ریپ سے بچنا ناممکن ہو جائے تو اسے انجائے کرنا چاہیے۔"(۵۵)

اس اقتباس میں دیکھا جائے تو انھوں نے انگریزی محاورے کو اردو میں اردو ترجمے کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ قاسمی کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے انگریزی کو ٹھونسا نہیں بلکہ جہاں ضرورت محسوس ہوتی وہاں استعمال کیا ہے وہ بھی اس انداز میں کہ تحریر بوجھل نہیں ہوتی ورنہ انھوں نے محاورات کے استعمال میں انگریزی محاورات کے بھی اردو ترجمے کے ساتھ اپنی نثر کا کام چلایا ہے۔ یہاں جو محاورہ وہ استعمال کر رہے ہیں وہ مشکل وقت میں مشکل سے نبٹنے کے حوالے سے انگریزی میں مستعمل ہے یعنی ریپ سے بچنا ممکن ہو تو اسے انجوائے کرنا چاہیے۔ اگر آپ مشکل میں اس طرح پڑ گئے ہیں کہ خلاصی کا کوئی رستہ نظر نہیں آتا تو ظاہر ہے مشکل کے اس کام میں بھی کوئی مسرت خش پہلو ہوں گے انھیں تلاشنے اور لطف اندوز ہونے کی ضرورت ہے۔

انگریزی محاوروں کے ساتھ ساتھ تو عام استعمال کے محاورات سے بھی وہ تحریر کو بہت خوبصورت بناتے ہیں:

"یہ رش کے اوقات نہ تھے لیکن اس وقت بھی کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔"(۵۶)

"کھوے سے کھوا چھلنا" بہت زیادہ رش اور گنجانی کے معنوں میں استعمال ہونے والا عام فہم اور عام استعمال کا محاورہ ہے۔ اسے عطاء الحق قاسمی نے بھی استعمال کر کے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ وہ عوام کی زبان سے اپنی نثر کو مزین کرنے اور اسے عوام کی زبان کے قریب لانے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس محاورے کا استعمال عام طور پر رش کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے اور عطاء الحق قاسمی نے جہاں بھی اس کا استعمال کیا ہے رش اور گنجانی کے معنوں میں ہی کیا ہے ایک اور جگہ اس محاورے کا خوب صورت استعمال دیکھیے:

"جہاں اسمگلڈ کپڑوں کی تازہ ورائٹی کی وجہ سے کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔" (۵۷)

اسمگلڈ انگریزی کا لفظ ہے جو باہر سے منگوائی گئی یا باہر بھیجی گئی ایسی چیزوں کے بارے میں استعمال ہوتا ہے جو ملکی قوانین سے روگردانی اختیار کر کے ناجائز ذرائع استعمال کرتے ہوئے بھیجی یا منگوائی جاتی ہو۔

جب بھی کوئی چیز بیرون ملک سے منگوائی جاتی ہے تو کسٹم والے اس پر ایک خاص شرح کا ٹیکس لاگو کرتے ہیں اس ٹیکس کی وجہ سے اس کی قیمت اندر لاتا ہے تو وہ ٹیکس کی رقم ادا کرنے سے بچ جانے کی وجہ سے اس کی قیمت مارکیٹ سے کم رکھتا ہے۔ اس طرح وہ سرکاری خزانے کو تو نقصان پہنچاتا ہے لیکن خود خوب منافع کماتا ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی لاگت کم آنے کی وجہ سے چیز کی قیمت بھی بازار سے کم ہوتی ہے اور عوام اس کم قیمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی طرف راغب ہوتے ہیں یوں اس کی فروخت بڑھ جانے سے کم قیمت میں بھی زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسمگلنگ کے ذریعے آنے والی چیزوں کے خریدار زیادہ ہوتے ہیں۔ قاسمی صاحب نے اس بیان میں ایک بازار کے ایسے ہی منظر نامے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسمگلنگ کے ذریعے آنے والی چیزیں کم قیمت ہونے کی وجہ سے وہاں لوگوں کا خرید کے لیے رش بہت زیادہ بڑھ چکا ہے جسے قاسمی صاحب "کھوے سے کھوا چھلنا" کے مترادف قرار دیتے رہے ہیں۔

قاسمی صاحب نے اپنی نثر کو جاذب نظر بنانے اور اس میں قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے محاورات کا استعمال جس طرح کیا ہے وہ فن پر ان کی گرفت کا عمدہ ثبوت ہے۔ ان کے ہاں محاورات کے استعمال کے باوجود نثر میں کسی قسم کا جھول پڑتا نظر نہیں آتا بلکہ قاری ان کی نثر کی روانی کے سحر میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا شمار زمانہ حال کے اعلیٰ پائے کے نثر نگاروں میں ہوتا ہے۔ نثر میں روانی کی ایک

بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ایسے محاورات استعمال کرتے ہیں جو عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ عوام الناس میں مقبول بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح کے ایک اور محاورے کو وہ یوں خوبی سے استعمال کرتے ہیں۔

"ہاں بہت زیادہ مگر یہی کچھ دو چار دن، پھر مجھے دیکھ دیکھ کر کڑھیں گے۔ صبح نماز کے وقت سوتا دیکھ کر کہیں گے بے دین۔ رات کو دس بجے کے بعد گھر آؤں گا تو کہیں گے آوارہ۔ نہ دین سے تعلق نہ دنیا کا خیال۔ دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا!"(۵۸)

یہاں "دھوبی کا کتاب گھر کا نہ گھاٹ کا" محاورہ استعمال کرکے انھوں نے نثر کو معنوی حوالے سے خاصی وسعت بخشی ہے۔ محاورے نے تحریر میں ابلاغ کے مسائل بھی پیدا نہیں ہونے دیے بلکہ تحریر میں خاصی روانی پیدا کر دی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کو فنی حوالے سے دیکھا جائے تو وہ محاوراتی انداز بھی اس طرح اختیار کرتے ہیں کہ اُن کی تحریریں سماجی مشاہدے کی عکاس بن کر سامنے آنے لگتی ہیں۔ اپنی کتاب "شر گوشیاں" میں لکھتے ہیں:

"بہر حال جتنے کارڈ مجھ تک پہنچے وہ بھی غنیمت ہیں، ورنہ میرے لیے تو ایک کارڈ بھی کافی تھا کہ مقصد تو دیگ کا ایک دانہ ہی چکھنا تھا!"(۵۹)

ایک دانہ چکھ کر دیگر کے پکنے کا اندازہ لگانا نہ صرف عام قول ہے بلکہ یہ عمل اب بھی سماج میں پوری طرح جاری و ساری ہے۔ اب بھی دیگیں پکانے والے کاریگر دیگ کا ایک دانہ چکھ کریں اس بات کا اندازہ کر لیتے ہیں کہ دیگ مکمل طور پر پک کر تیار ہو چکی ہے یا نہیں۔ یوں ہی وہ اپنے ہاں آنے والے کارڈوں کے بارے میں بیان کر رہے ہیں۔ یہ کارڈ دراصل زلفوں نے خود درخواست کر کے منگوائے تھے کہ انھیں اس بات کا ثبوت حاصل کرنا تھا کہ کیا واقعی کارڈ عریانی کی زد میں آچکے ہیں اور جب انھوں نے دوستوں سے یہ کہا کہ ایسا اگر کوئی کارڈ ہو تو مجھے بھیجے تو پھر ہر ایک نے اکلوتا کارڈ سمجھ کر ان کو بھیج دیا یوں ان کے پاس ایسے فحش کارڈ کثیر تعداد میں جمع ہو گئے اور بعض ایسے بھی تھے جو ان تک پہنچ بھی نہ پائے۔ وہ اس رو کو بیان کر رہے ہیں کہ تمام کارڈوں کا پہنچنا ضروری نہیں تھا چند ایک کے مل جانے سے ہی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے کہ جو جاننا چاہتے تھے وہ حاصل ہو گیا۔

تشبیہات کا استعمال:

تشبیہ کسی بھی تحریر کی جان ہوتی ہے۔ شاعری میں تو ہم دیکھتے ہیں کہ شعراء تشبیہات کے بل بوتے پر ہی بڑے بڑے شاعرانہ شاہکار سامنے لانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تشبیہ میں ایک چیز کو دوسری چیز کی مانند قرار دیا جاتا ہے اور ایسا کرنے کے لیے مشترک اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔ نثر میں تشبیہات کے استعمال سے نہ صرف نثر کا حُسن نکھر کر سامنے آتا ہے بلکہ لکھاری کے مشاہدہ کی وسعت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ تشبیہ کے مناسب اور بر محل استعمال کے لیے تخلیق کار کے پاس وسعت مشاہدہ اور گہری بصارت و بصیرت کا ہونا لازمی ہے تا کہ وہ سماج میں پھیلی مختلف چیزوں کے باہمی تعلق اور ان کی باہمی مشترک خصوصیات سے آگاہی رکھ سکے مشترکہ خصوصیات سے یہ آگاہی ہی کسی تخلیق کار کو موزوں اور بر محل تشبیہات کے استعمال میں معاونت فراہم کرتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ اپنی ذات کو بھی مزاح کا نشانہ بنانے سے نہیں چوکتے اور اپنے بارے میں بھی ایسی ایسی تشبیہات سامنے لاتے ہیں کہ ان کی تحریر ایک لطیف احساس کا تاثر ابھارتی نظر آتی ہیں۔ سر کے بالوں کو پت جھڑ میں درختوں کے پتوں کی طرح جھڑنے سے مشابہت دکھا کر انھوں نے فنی حوالے سے تحریر کو خاصا جاندار اور لطیف بنا کر پیش کیا ہے۔ اسی طرح اس گنجے پن کے حوالے سے ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

> "گنجا ہونے سے ڈر محض اس لیے لگتا ہے کہ سر پر موجود ایک آدھ لٹ کے ناز نخرے بہت اٹھانے پڑتے ہیں، اسے پتا نہیں کہاں سے گھیر گھار کر سر کیا اگلے حصے کی طرف لانا پڑتا ہے لیکن اس کی حیثیت ریت پر بنے ہوئے گھروندے سے زیادہ نہیں ہوتی، چنانچہ ہوا کا ایک جھونکا اسے واپس پہلے والی جگہ پر لے آتا ہے۔"(۶۰)

ریت کے گھروندے کی ہوا کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ ہوا کے چلنے کی دیر ہوتی ہے کہ وہی ریت جو ایک گھروندے کی شکل لیے ہوتی ہے ہموار ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب یہاں قاسمی صاحب نے گنجے سر پر بالوں کی لٹ کو جو ریت کے گھروندے سے تشبیہ دی ہے اس میں صرف اس کی ناپائیداری ہی مقابل نہیں بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ریت کا گھروندہ جب ہوا کی زد میں آتا ہے تو ایک تو وہ گھروندہ ختم ہو جاتا ہے یعنی اس منظر سے مٹ جاتا ہے دوسرا وہ منظر جو پہلے ایک گھروندے کی صورت ابھر رہا ہوتا ہے اب ہوا چلنے کے بعد ہموار ہوتا چلا جاتا ہے۔ بالکل یہی دونوں صورتیں گنجے سر پر پڑی لٹ کی ہوتی ہیں۔ جب تک تو اس لٹ کو ہوا نہیں

لگتی تب تک وہ بہت خوب صورت نظر آرہی ہوتی ہے لیکن جوں ہی وہ ہوا کی زد میں آتی ہے تو نہ صرف یہ کہ خود منظر سے ہٹ جاتی ہے بلکہ اس کے ہٹنے کے بعد بالکل اسی طرح کا ہموار گنج بھی سامنے آنے لگتا ہے جیسا کہ گھروندے پر ہوا چلنے کے بعد منظر ہموار ہو اجاتا ہے۔ یوں ایسی تشبیہات قاسمی صاحب کی وسعت مشاہدہ کو ظاہر کرتی ہے۔

عطا الحق قاسمی اپنی تحریروں کو فنی بالیدگی عطا کرتے ہوئے جب تشبیہات و استعارات میں انگریزی الفاظ کا استعمال کرتے ہیں تو ایک حسین منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ ذیل کا اقتباس دیکھئے:

"وہ فزیشن نہیں سرجن ہے اور آپ جانتے ہیں کہ فزیشن کے پاس نزلہ زکام کے علاوہ شاید ہی کسی بیماری کا علاج ہو۔"(۶۱)

یہاں وہ نذیر ناجی کے بارے میں بیان کر رہے ہیں۔ وہ انہیں فزیشن کی بجائے سرجن سے مشابہ قرار دے رہے ہیں جس کی بڑی وجہ عمل سرجری میں ہونے والی بے پناہ ترقی ہے۔ یہی ترقی انھیں نذیر ناجی کی فکر میں بھی نظر آتیہے۔ یوں مشترک خصوصیات کی بنا پر وہ انگریزی الفاظ کے استعمال سے بھی تحریر میں تشبیہاتی حسن پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہو۔ انگریزی الفاظ کے استعمال کو تشبیہاتی عمل میں استعمال کرنے کا ایک اور حسین منظر ملاحظہ ہو:

"جس کھانے والے کا پیٹ اعلیٰ ظرف ہے وہ اپنے پیٹ کو انکم ٹیکس کی طرح چھپانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔"(۶۲)

انکم ٹیکس (Income Tax) دراصل وہ سرکاری ٹیکس ہوتا ہے جو ایک خاص شرح سے آمدنی کے تجاوز کرنے پر حکومت کو ادا کرنا ہر شہری کا فرض ہوتا ہے کیونکہ حکومتی معاملات کافی حد تک ٹیکسوں اور محصولات پر چلتے ہیں۔

سماجی حوالے سے انکم ٹیکس کا لفظ خاصا مشہور ہے۔ بد عنوان لوگ اس ٹیکس کو اپنے اوپر بوجھ سمجھتے ہیں حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اس ٹیکس کی ادائیگی سے ان کے طرز زندگی میں بہتری ہی آئے گی۔ وہ یہ حقائق نظر انداز کرتے ہوئے اپنی آمدنی کو اس شرح سے کم ظاہر کرتے ہیں جس پر انکم ٹیکس کا اطلاق ہوتا ہے یوں وہ انکم ٹیکس کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی نے جو اعلیٰ ظرف پیٹ کو انکم ٹیکس سے تشبیہ دی ہے اس پر غور کریں تو ان میں خاصی مماثلت نظر آتی ہے کہ اصل چیز کے ہوتے ہوئے بھی اسے ظاہر نہ کرنا اس امر کو قاسمی صاحب نے تشبیہاتی انداز میں خوب صورتی سے بیان کیا ہے۔

قاسمی صاحب کو فن پر اس قدر گرفت ہے کہ انہوں نے صرف انگریزی ممالک کے سفر ناموں میں ہی انگریزی لفظیات کو تشبیہاتی انداز میں استعمال نہیں کیا بلکہ ایشائی ممالک کے اسفار میں بھی ان کے ہاں تشبیہات میں انگریزیلفظیات کا چلن دکھائی دیتاہے۔ ہندوستان کے ایک سفر نامے میں وہ ضمیر جعفری کی زبان سے یوں الفاظ ادا کرواتے ہیں۔

"یار ہم توخاصے امپور ٹنٹ لوگ ہیں۔ایک عالمی کانفرنس میں پاکستان
کی نمائندگی کررہے ہیں۔ جن میں دنیاکے دوسرے چودہ ملک بھی
شریک ہیں"(۶۳)

یہاں لفظ امپور ٹنٹ IMPORTANT انگریزی لفظیات سے استعمال کیا گیااور خود کو ان اہم شخصیات سے تشبیہ دی جارہی ہے جو حکومت کے چہیتے ہوتے ہیں اور جنہیں حکومتیں اپنا نمائندہ بناکر عالمی سطح کی کانفرنسوں میں بھیجتی ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتاہے کہ عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال فکری تناظر میں جہاں خاص سیاسی، سماجی اور ثقافتی عکاسی کرتاہے وہیں فنی حوالے سے بھی ان کی تحریریں خاص اہمیت کی حامل ہیں اور ان کی تحریریں ان فنی محاسن سے مالامال ہیں جو اچھی نثر کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔انگریزی الفاظ کے استعمال کے باوجود ان کی تحریروں کا اسلوب شگفتہ اور رواں ہے اور قاری کو کہیں بھی انگریزی الفاظ کے استعمال کے باوجود تحریر میں بوجھل پن محسوس نہیں ہوتا بلکہ ان کی نثر رواں ہی رہتی ہے۔

اشاریہ انگریزی الفاظ

عطاء الحق قاسمی کی اردو نثر میں استعمال ہونے والے انگریزی الفاظ کی تفصیل یہ ہے

لینڈ شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص ۳۱

دنیاخوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے" ص ۲۷۹

زمین (Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:419)

لینڈ کالفظ انگریزی میں زمین کے لیے استعمال ہوتاہے اور اب پاکستانی سماج میں بھی یہ لفظ زمین کے معنوں میں عام استعمال ہورہاہے۔ لینڈ لارڈ، لینڈ ریکارڈ، لینڈ مافیہ اور دیگر بہت سے دیگر الفاظ اسی سے نموپا کر پاکستانی سماج میں بھی رائج ہوچکے ہیں۔

بائی ائر شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۲

ہوا کے ذریعے(Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition
(P:35

سفر کے متعدد ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہوائی سفر کا ہے اس کے لیے بائی ائر کا استعمال انگریزی اور مشرقی دونوں سماجوں میں عام کیا جاتا ہے۔ تیز ترین ذرائع آمد ورفت کی وجہ سے بائی ائر سفر عام ہونے سے یہ لفظ بھی سماج میں عام استعمال ہو کر ثقافتی اظہار یہ بنتا جارہا ہے۔

اناؤنس		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۳

اعلان کرنا		(Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition
(P:49

اناؤنس اور اعلان دونوں الفاظ سماج میں استعمال ہو رہے ہیں۔ مساجد میں عام طور پر اب بھی اعلان کرنے کے ہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جب کہ دفاتر اور عصری تعلیمی اداروں میں اناؤنس کا لفظ کثرت سے استعمال ہو کر مشرق سماج و تہذیب کا حصہ بن چکا ہے۔

سٹریٹس		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۷

گلیاں		(Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:702)

سٹریٹس رہائشی علاقے میں موجود ایسے چھوٹے بازار کو کہا جاتا ہے جو گزرنے کے لیے رکھا جاتا ہے۔ انگریزی ثقافت میں اس لفظ کے ساتھ بہت سے تاریخی اور ثقافتی حقائق بھی وابستہ ہیں جیسے ڈاؤننگ سٹریٹ وغیرہ، مشرقی سماج میں بھی یہ لفظ عام استعمال ہوتا ہے۔ بعض مخصوص بازاروں کے لیے بھی یہ ایک ثقافتی مظہر کے طور پر استعمال ہوتا ہے جیسے فوڈ سٹریٹ، فلاور سٹریٹس وغیرہ۔

ڈانسنگ پارٹنر		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۹

رقص کا ساتھی		(Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition
(P:199

ڈانس انگریزی ثقافت کا ایک اہم جزو ہے۔ مختلف انداز کے ڈانس اُس سماج میں رائج ہیں۔ گروہی رقص میں لوگ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر رقص کرتے ہیں، یوں وہ ایک دوسرے کے ڈانسنگ پارٹنر یعنی رقص کے ساتھی کہلاتے ہیں۔ مشرقی سماج میں ایسا نہیں ہے لیکن بعض تعلیمی اداروں میں

ہونے والی مخلوط پارٹیوں میں ایسی صورت حال دیکھنے کو ملتی ہے۔ یوں یہ لفظ مغربی سماج کے ایک اہم عنصر کا اظہاریہ بن کر سامنے آتا ہے۔

فلیٹ میٹ   شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۴۶

ایک ہی کمرے میں ساتھ رہنے والا (Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:419)

فلیٹ میٹ کا لفظ انگریزی میں فلیٹ یا کمرے میں ساتھ رہنے والے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سماج میں حصول روز گار کے لیے عام طور پر گھر سے باہر رہنے والے مختلف لوگ آپس میں مل کر فلیٹ کرائے میں لے کر رہتے ہیں۔ یہ روش سماج میں عام ہونے سے فلیٹ میٹ بھی ایک سماجی عنصر کے طور پر رائج ہو چکا ہے۔

آٹو میٹک   شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۴۷

خود کار   Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:74

یہ انگریزی لفظ اپنا خاص سماجی پس منظر رکھتا ہے کہ مغربی معاشرے میں تیز ترین صنعتی ترقی کی بدولت بہت سی خود کار مشینیں ایجاد ہوئیں جن کو انگریزی میں آٹو میٹک کہا گیا۔ یہ لفظ اب مشرقی اور مغربی دونوں معاشروں میں اس قدر رائج ہو چکا ہے کہ سماج کا ایک اہم اظہاریہ بن چکا ہے۔ مشرقی معاشرے میں بھی اس کا استعمال "خود کار" سے زیادہ ہو رہا ہے۔

PEACE   شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۵۵

امن   Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:531

انگریزی لفظ پیس کا اردو متبادل امن ہے۔ اس لفظ سے سماجی ہم آہنگی بہت گہری ہے۔ عالمی امن کے لیے ہونے والی کوششوں نے لفظ پیس کو ہر سماج میں رائج کر دیا ہے۔

بینر   شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۵۶

اطلاعی اشتہار جو کپڑے یا پلاسٹک پہ ہوں جھنڈا، نشان

Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:82

تشہیری ذرائع کی ترقی نے اس لفظ کو بینر ہی کے نام سے مشرقی سماج میں بھی رائج کیا۔ مختلف سماج اور ثقافتی اظہاریوں کے لیے بینرز استعمال کیے جاتے ہیں۔

BABY SISTER شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۵۷

آیا Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:77

بے بی سسٹر یا آیا مشرقی اور مغربی دونوں سماجوں میں ایک اہم عنصر کے طور پر پائی جاتی ہے جو بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ یہ شعبہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ انگریزی سماج میں ایسی عورت کو جو بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ہو بے بی سسٹر یعنی بچے کی بہن کہا جاتا ہے۔ مشرقی معاشرے میں بڑی بہنیں عام طور پر چھوٹے بھائیوں کو لاڈ پیار کر کے بہلاتی ہیں۔ اسی تناظر میں مغرب میں بے بی سسٹر یعنی بچے کی بہن اس کو کہا جاتا ہے۔

مین شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۵۹

آدمی Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:447

مین کا لفظ اپنے ساتھ دیگر بہت سے سماجی و ثقافتی مظہر رکھتا ہے۔ جنٹل مین (شریف آدمی) کنٹری مین (محب وطن) وغیرہ جیسے سماجی و ثقافتی عناصر اس کے استعمال کو عام بناتے ہیں۔

بزنس شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۵۹،۶۸

کاروبار Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:120

کاروبار اور سرمایہ کاری مغربی سماج کو اہم عنصر ہے۔ مغرب کی معیشت کی بنیاد ہی سرمایہ کاری پر ہے۔ بزنس کسی بھی کاروبار کے لیے استعمال ہونے والا لفظ ہے۔ مغربی سماج کے حوالے سے معاشی اور ثقافتی تناظر میں اس لفظ کا استعمال عام ہے۔

آرڈر شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۶۰

حکم Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:509

آرڈر کا لفظ مشرق اور مغرب دونوں سماجوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا استعمال بھی اب متنوع معنوں میں ہونے لگا ہے۔ یوں تو یہ لفظ حکم کے معنوں میں ہے لیکن اب دفتری امور میں اس کا استعمال مختلف تقرر ناموں کے لیے بھی ہونے لگا ہے۔

THRILLING شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۶۳

ہیجان انگیز انداز Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:730

رقص و سرود کی محفلیں مغربی ثقافت کا حصہ ہیں۔ ان محفلوں میں یہ لفظ عام استعمال ہوتا ہے جس سے اس کی ثقافتی اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ اس رقص میں عورت نہایت مختصر لباس میں اپنے جسم کی نمائش کرواتے ہوئے رقص کرتی ہے۔ جس دوران دیکھنے والوں کی شہوت کو بھڑکایا جاتا ہے اور پھر بعد میں ان سے پیسے بٹورے جاتے ہیں۔ مغربی سماج کا یہ ایسا کلچر ہے جو وہاں عام ہے۔ مشرق کی نسبت مغرب میں ہیجان انگیزی کو باقاعدہ صنعت کا درجہ حاصل ہے۔

DATE شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۶۴

تاریخ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:200

DATE کا اردو متبادل تو تاریخ ہی ہے لیکن مغربی سماج کے ساتھ ساتھ اب مشرق میں بھی یہ لفظ جس سماجی روش کے لیے استعمال کیا جارہا ہے وہ پریمی جوڑوں کے ایک دوسرے کو ملنے کے لیے کسی مخصوص دن کسی مخصوص جگہ پر جانا ہے۔ مشرقی سماج میں بھی یہ ڈیٹ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مغرب کی تو ثقافتی اقدار کا یہ حصہ بن چکا ہے۔

منی سکرٹ شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۶۴

چست اور تنگ جامہ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition P:466

مغربی سماج میں ملبوسات میں استعمال ہونے والا عام لباس ہے۔ وہاں کی ثقافت میں بھی اس کو اچھا خیال کیا جاتا ہے کیوں کہ یہ لباس ان کے خیال میں ان کی پہچان بن چکا ہے۔

ٹیچر شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۶۹

استاد Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ٹیچر کا لفظ انگریزی لفظ TEACH کا فاعل ہے۔ یہ لفظ مشرقی سماج میں بھی پڑھانے والے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنوں میں تو ہر وہ شخص آتا ہے جو کسی بھی قسم کی تعلیم دیتا ہے۔ تاہم عطاء الحق قاسمی کیتحریروں میں یہ لفظ عام بول چال میں ایسے لوگوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو کسی فن سے آراستہ کرتے ہیں۔

بائی روڈ		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۷۰

سڑک کے ذریعے Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

بائی روڈ بھی سماج میں سڑک کے ذریعے سفر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی سماج روش ہے۔ بس یا دیگر ذرائع کے ذریعے سفر آج بھی مقبول بلکہ پہلے سے کہیں زیادہ آرام دہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لفظ بھی ہر سماج کی بول چال میں عام ہے۔

کس می		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۷۲

مجھے بوسہ دو Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

رقص کی طرح بوس و کنار بھی مغربی تہذیب و ثقافت میں عام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کسی سے محبت اور اپنائیت کے اظہار کے لیے "کس می" یعنی مجھ سے بوس و کنار ہو کا لفظ عام بولا جاتا ہے۔

بوائے فرینڈ شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۷۲

دوست لڑکا Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

بوائے فرینڈ بھی مغربی تہذیب کی دین ہے۔ مشرق میں بھی یہ لفظ عام استعمال ہو رہا ہے۔ لڑکی کا کسی لڑکے کے ساتھ دوستی قائم کرنا اسے بوائے فرینڈ کہلاتا ہے۔ مغربی ثقافت میں اسے اہم عنصر کی حیثیت حاصل ہے۔

جنریشن گیپ		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۷۷

کسی نسل کا اپنے اسلاف کی روایات کے برعکس ہونا

مغربی ثقافت اور تہذیب اپنے خنجر سے اب آپ ہی خودکشی کر رہی ہے کہ ان کی ہر آنے والی نسل اپنے اسلاف کی روایات سے بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے یوں جنریشن گیپ ان کی بدلتی تہذیبی و ثقافتی اقدار کی نمائندگی کرتا ہے۔

لکی مین		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۸۰

خوش قسمت آدمی Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

خوش قسمت انسان کے لیے مغرب میں بولا جانے والا عام لفظ ہے۔ سماج میں ایسے شخص کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے جس کے پاس دولت و مراتب اعلیٰ ہوں۔ عام طور پر اس کے لیے صرف "لکی" کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

یومسٹ بی کڈنگ شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۸۱

آپ لازمی مذاق کررہے ہیں Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

یہ انگریزی سماج کے ساتھ ساتھ مشرقی سماج میں رواج پاتا لفظ ہے جو کسی کے مذاق کرنے یا چھیڑنے پر بولا جاتا ہے۔

گڈمارننگ شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۸۸،۸۹

صبح بخیر Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

صبح بخیر کہنے کے لیے انگریزی سماج میں یہ لفظ اپنا خاص سماجی تناظر رکھتا ہے۔ مغربی سماج میں لوگ صبح سویرے سیر کے لیے نکلتے ہیں تو ہر ملنے والے کو ان الفاظ میں صبح بخیر کہتے ہیں۔ مشرق میں بھی یہ اب رائج ہو چکا ہے۔

WISH شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۹۴

چاہت Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

چاہت اور محبت کا اظہار جن الفاظ میں ہوتا ہے ان میں سے ہی ایک یہ بھی ہے۔ مغرب میں یہ لفظ خاص ثقافتی پس منظر بھی رکھتا ہے جس میں لوگ ایک دوسرے سے محبت کے اظہار کے لیے WISH کرنا کہتے ہیں۔

HOUSE WIFE شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۰۳

گھریلو عورت Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ہاؤس وائف یا گھریلو عورت ایسی عورت کو کہتے ہیں جو ملازمت پیشہ نہیں ہوتی بلکہ گھر میں بچوں اور گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ مشرقی ثقافت میں ایسی عورتوں کی ٹھوس سماجی خدمات ہیں جب کہ مغربی معاشرے میں ہاؤس وائف کا تصور زیادہ مضبوط نہیں ہے۔

CHOICE شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۰۶

پسند Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

زندگی میں ہر کام کے لیے ہر انسان کی اپنی پسند ہوتی ہے اس کے لیے انگریزی میں چوائس مستعمل ہے۔ اس کا سماجی تناظر اسی حد تک ہے کہ انگریزی سماج میں یہ لفظ اپنی پسندیدگی کے لیے بولا جاتا ہے۔

گڈ نیوز		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۱۱

اچھی خبریں		Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

گڈ نیوز انگریزی سماج میں اچھی خبر کے لیے بولا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس لفظ کا استعمال اچھی خبر اور خوش قسمتی کی خبر کے معنوں میں ہی ہوتا ہے۔

ویٹر		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۲۴

بیرا		Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ویٹر ہوٹلوں میں کھانا پیش کرنے والے کو کہتے ہیں۔ مشرقی سماج میں اسے بیرا بھی کہا جاتا ہے لیکن چوں کہ اب ہوٹل کے کام میں بھی بہت جدت آچکی ہے۔ انداز بدل چکے ہیں۔ اسی جدت اور تبدیلی کی وجہ سے مشرقی سماج میں بھی کھانا پیش کرنے والوں کو بیرا کی بجائے ویٹر کہنے کا رواج عام ہوتا جارہا ہے۔

تھینک یو		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۲۶

آپ کا شکریہ		Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

سوری کی طرح تھینک یو بھی ایسا لفظ ہے جو انگریزی سماج میں تو شکریہ کے لیے استعمال ہوتا ہی ہے لیکن اب مشرقی سماج میں بھی اس کا استعمال انہی معنوں میں عام ہو رہا ہے۔ اور مشرق و مغرب میں سماج کی سطح پر لسانی اشتراک کا سبب بن رہا ہے۔

اولڈ پیپلز ہوم		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۳۰، ۱۵۱، ۱۵۵، ۱۶۷، ۱۶۸

گوروں کے دیس میں، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۲۴۲

بوڑھے لوگوں کے لیے مخصوص گھر (سنٹر)		Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

مغربی سماج اور ثقافت کی اہم علامت اولڈ پیپلز ہوم ہے۔ یہ ایسا سنٹر ہوتا ہے جہاں بوڑھے لوگوں کو داخل کروا دیا جاتا ہے۔ مشرق میں والدین، اولاد کے لیے باعث افتخار ہوتے ہیں اور ان کی خدمت کو وہ سعادت سمجھتے ہیں جبکہ مغرب میں والدین کے بوڑھے ہوتے ہی ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اولڈ پیپلز ہوم میں بھیج دیا جاتا ہے۔ مغربی ثقافت کا یہ ایک منفی زاویہ ہے۔

ایکسپوزی		شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۴۲، ۲۱۷

معاف کرنا،(کسی کو متوجہ کرنے کے لیے بھی) Gem Practical Dictionary, 21st Century Edit

کسی کو متوجہ کرنے کے لیے بولا جانے والا یہ انگریزی لفظ مشرقی سماج میں بھی عام ہو چکا ہے۔ سماجی حوالے سے دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اس کا استعمال عام ہو رہا ہے۔

وسل شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۷۴

سیٹی Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

وسل سیٹی کو کہا جاتا ہے۔ مغرب کی طرح ہمارے ہاں بھی سماجی سطح پر انہی معنوں میں یہ بولا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیٹی بھی مستعمل ہے۔

انڈر شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۵۰

ماتحت Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ماتحت کے لیے بولا جانے والا لفظ مغربی سماج میں پائے جانے والے مختلف عہدوں کے حوالے سے تفریق کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ ہمارے سماج میں ماتحت کا لفظ بھی انہی معنوں میں مستعمل ہے جب کہ انڈر کا لفظ بھی بولا جاتا ہے۔

پینٹنگ شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۵۸

رنگوں سے مزین کرنا Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

پینٹنگ کا لفظ انگریزی کی طرح اردو میں بھی مستعمل ہوتا جا رہا ہے۔ سماج میں اس کا استعمال عام ہے۔ کسی چیز یا منظر کو رنگوں سے مزین کرنے کو کہا جاتا ہے۔ سماج میں اب یہ لفظ عام طور پر ان کاموں کے لیے استعمال ہونے لگا ہے جن میں رنگ کا عمل دخل ہو۔ لیکن یہ مخصوص طور پر کاغذ یا دیوار پر رنگوں سے تزئین و آرائش کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

KNOCK شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۶۴

دستک Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

دستک دینا اسلامی اقدار میں سے ایک اہم قدر ہے کہ کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے دروازہ پر دستک دے کر اجازت طلب کی جائے۔ یوں یہ اسلامی اور مشرقی تہذیب کا اہم عنصر ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے

Knock کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور ہمارے سماج میں بھی یہ لفظ استعمال کیا جا رہا ہے۔

گرل فرینڈ شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۶۹

دوست لڑکی Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

بوائے فرینڈ کی طرح گرل فرینڈ بھی انگریزی کلچر کا اہم جزو ہے۔ وہاں لڑکے لڑکی کے لیے ایک دوسرے کو دوست بنانا معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ دوست لڑکی کے لیے گرل فرینڈ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

ویکنڈ شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۷۲

ہفتے کا اختتامی یوم Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ویکنڈ کا اصل سماجی تناظر تو ملازمت پیشہ لوگوں کے حوالے سے سامنے آتا ہے۔ ہفتے کے چھ دن کام کرنے کے بعد چھٹی والے دن کو ویکنڈ کہا جاتا ہے کیوں کہ اس دن کام سے فراغت ہوتی ہے اور اگلے دن نیا ہفتہ شروع ہو جاتا ہے۔

سیکس شاپ شوق آوارگی، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۱۸۱

جماع کے مراکز Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

مغرب میں سیکس ان کی تہذیب کا حصہ بنتا جا رہا ہے۔ اس سماج میں جماع کے مراکز عام ہونے کی وجہ سے ان مراکز کو سیکس شاپ کا نام دیا جاتا ہے۔ ان شاپس پر جماع سے متعلقہ مختلف اشیا دستیاب ہوتی ہیں۔

آرڈر آف دی ڈے دنیا خوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۲۷

دن کا حکم Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

انگریزی سماج میں بولا جانے والا یہ لفظ اس حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ دن کو وہ حکم جسے آرڈر آف دی ڈے کہا جاتا ہے اس کا پورا ہونا لازم ٹھہرتا ہے۔

سوشل اینیمل دنیا خوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۳۳

سماجی حیوان Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

عام طور پر اس سے انسان مراد لیا جاتا ہے۔ انگریزی معاشرے میں سماجیات کو خاص اہمیت حاصل ہونے کی وجہ سے اس دن لفظ کی سماجی حیثیت بھی دوچند ہو جاتی ہے۔ یہ لفظ انسان کے لیے انگریزی کے ساتھ ساتھ مشرقی سماج میں بھی بولا جاتا ہے۔

فارمل　　دنیا خوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۳۴

رسمی　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

فارمل سے مراد رسمی ہے۔ یہ لفظ انگریزی اور پنجابی دونوں سماجوں میں عام استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں رسمی امور جو سماج میں پائے جاتے ہیں وہ سب آ جاتے ہیں یوں یہ لفظ سماجی حوالے سے خاصا وسیع مفہوم رکھتا ہے۔

اپر　　دنیا خوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۳۴

اوپر، اعلیٰ　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

سماج میں طبقاتی تفریق کو رواج دیتا یہ لفظ انگریزی سماج میں عام استعمال ہونے کے ساتھ ساتھ پنجابی سماج میں بھی بولا اور لکھا پڑھا جاتا ہے۔ اس لفظ کے ساتھ سماجی سطح پر ہونے والی طبقاتی تفریق میل کھاتی ہے۔ یہ لفظ اعلیٰ طبقے کے لیے بولا جاتا ہے۔

مڈل　　دنیا خوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۳۴

وسطی　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

یہ بھی سماج طبقاتی تفریق کو بیان کرتا لفظ ہے۔ یہ سماج میں ایسے طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو نا تو اعلیٰ طبقے سے ہوتے ہیں اور نہ ہی نچلے طبقے سے بلکہ وسطی طبقے میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ یوں سماجی حوالے سے بھی یہ لفظ اپنا مقام رکھتا ہے۔

گریٹ　　دنیا خوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۴۰

عظیم　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

اس لفظ کی سماجی اور ثقافتی حیثیت میں خاصی وسعت پائی جاتی ہے۔ یہ لفظ ہر عظیم شخصیت اور عظیم کام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یوں یہ لفظ بھی سماجی مراتب قائم کرنے کے حوالے سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔

لون　　دنیا خوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۵۵

قرضہ　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

لون کا لفظ قرضے کے متبادل کے طور پر اب انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی مستعمل ہو چکا ہے اور سماج میں بھی یہ خاص اہمیت حاصل کر چکا ہے۔ خاص طور پر بنکوں اور کمپنیوں سے لیے جانے والے قرضے کے لیے عام شخص بھی لون ہی کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

فریش　　　دنیاخوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۵۶

تروتازہ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

اشیائے خوردونوش کی تازگی سے لے کر انسان کے چہرے کی تروتازگی ہر چیز کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جاتاہے۔اس لفظ کا استعمال انگریزی اردو کے ساتھ اب پنجابی سماج میں بھی روزمرہ کی گفتگو میں بڑھتا جارہاہے۔

لانگ مارچ　　　دنیاخوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۸۶

بہت سے لوگوں کا اکٹھے چلنا Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

لانگ مارچ کی پاکستانی سماج میں اہمیت پچھلے چند سالوں میں بہت زیادہ ہوچکی ہے اور سماج میں یہ لفظ لوگوں کے لیے عام فہم ہوچکاہے۔ سیاسی مقاصد کے لیے کیے گئے لانگ مارچ ہی اس کا سماجی منظر نامہ واضح کرتے ہیں۔

ان ٹائم　　　دنیاخوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۷۸

وقت پر Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ملازمت پیشہ افراد اس کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔وقت پر ڈیوٹی پر پہنچنا ان کے لیے بہت بڑا کام ہوتاہے۔ان ٹائم پہنچنے کا لفظ ہمیں ایسے ملازمت پیشہ لوگوں کی طرف سے عام سننے کو ملتاہے۔

SEXY　　　دنیاخوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۳۹۴

ہیجان انگیز　　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

انگریزی سماج میں اس لفظ کا استعمال اس لیے عام ہے کہ ان کے سماج اور تہذیب وثقافت میں سیکس ایک بنیادی عنصر کے طور پر موجود ہے اور سیکس ان کے ہاں کوئی ایسا کام نہیں جو اس طرح قابل مذمت ٹھہرے جیسا کہ مشرق میں ہے۔ سماجی منظر نامے میں اس لفظ کا استعمال بھی مغرب اور مشرق کے سماج کو سمجھنے میں بہت مدد دیتاہے۔

باتھ روم　　　دنیاخوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۴۱۲

گوروں کے دیس میں، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۴۳۵

غسل خانہ　　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

باتھ روم کا اردو متبادل غسل خانہ ہے۔ معنوی حوالے سے دیکھا جائے تو دونوں الفاظ کا استعمال اپنے اپنے سماجی تناظر میں درست ہے۔ غسل بمعنی نہانا اور باتھ بھی بمعنی نہانا کے ہیں جب کہ خانہ اور روم کمرے کو کہا جاتا ہے۔ اردو میں پچھلے کچھ سالوں سے غسل خانے کی بجائے باتھ روم کا لفظ ہی استعمال ہو رہا ہے۔

انجوائے دنیا خوب صورت ہے، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۴۱۳

لطف اٹھانا Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

انگریزی میں انجوائے کرنا کسی بھی خوشی یا سرمستی کے موقع سے لطف اندوز ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں کثرت سے استعمال ہو رہا ہے۔ پنجابی سماج میں اس لفظ کا استعمال اس قدر عام ہو چکا ہے کہ اب لطف اندوز ہونے کے لفظ کا استعمال کم اور انجوائے کا زیادہ ہوتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ انگریزی سماج میں اس لفظ کا استعمال کثیر النوع ہونا ہے۔ انگریزی میں ہر لطف اندوز واقعے پر یہی لفظ بولا جاتا ہے۔ اب سماج میں ان گنت خوشی اور مسرت کے مواقعے ہوتے ہیں اس لیے اس لفظ کا سماجی تناظر خاصا وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

سینئر گوروں کے دیس میں، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۴۳۹

اعلیٰ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

سینئر کا لفظ کسی بھی برتر شخص کے لیے بولا جاتا ہے خاص طور پر وہ شخص جو عہدے کے لحاظ سے دوسروں سے ممتاز ہو۔ ثقافتی حوالے سے دیکھا جائے تو سماج میں پائی جانے والی طبقاتی تفریق کے حوالے سے بھی یہ لفظ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ سینئر طبقے سے مراد اونچے یا اعلیٰ طبقے کے لوگ لیے جاتے ہیں۔

گن مین دلی دور است، مشمولہ "سفر نامے"، ص:۶۴۸

محافظ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

مشرقی اور مغربی دونوں سماجوں میں ذاتی محافظ کا تصور شروع سے چلا آ رہا ہے۔ عام طور پر سیاست دانوں، مذہبی رہنماؤں اور دیگر ایسے لوگ گن مین رکھتے ہیں جنہیں اپنی جان خطرے میں محسوس ہوتی ہے۔ بعض لوگ محض رعب اور دبدبے کی خاطر بھی گن مین رکھ لیتے ہیں۔ موجودہ عہد میں دیکھا جائے تو گن مین رکھنا بھی ایک رواج بنتا جا رہا ہے۔ جو اس لفظ کو بھی سماجی اہمیت عطا کرتا ہے۔

چیک ٹو چیک بلبلے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۴۰

گال سے گال ملانا Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

چیک ٹو چیک ڈانس انگریزی ثقافت کا حصہ ہے۔ وہاں اکٹھ کے موقعوں پر جب کوئی شوخی و سر مستی کی کیفیت کسی پارٹی کی صورت میں ہوتی ہے تو لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر انتہائی قربت کے لمحات میں ایک دوسرے کے گال سے گال ملا کر رقص اور بوس و کنار کرتے ہیں۔ اردو میں اس لفظ کا زیادہ استعمال نہیں ملتا۔

چیف گیسٹ بلبلے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۴۹

مہمان خصوصی Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

سماجی اور ثقافتی حوالے سے تقریبات کی اپنی اہمیت ہے۔ ہر تقریب میں ایک یا چند اشخاص خصوصی دعوت پر بلائے جاتے ہیں جنہیں مہمان خصوصی یا چیف گیسٹ کہا جاتا ہے۔ اردو میں یہ دونوں لفظ ہی مستعمل ہیں۔ چیف گیسٹ مشرق اور مغرب دونوں سماجوں اور ثقافتوں میں خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

کزن بلبلے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۶۲

چچازاد، ماموں زاد وغیرہ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

کزن کا رشتہ بھی انگریزی اور مشرقی سماج میں خاص ثقافتی تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ لفظ اردو کے چچازاد ماموں زاد، خالہ زاد، تایازاد وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مشرق میں چوں کہ خاندانی نظام ہے اس لیے ہر رشتے کے لیے الگ الگ نام ہیں لیکن مغرب میں خاندانی نظام نہ ہونے کی وجہ سے رشتوں کی پہچان بھی ختم ہو چکی ہے جس کی وجہ سے تمام ایسے رشتوں کے لیے ایک لفظ کزن ہی بول دیا جاتا ہے۔ مشرقی سماج میں بھی یہ لفظ اب رائج ہوتا جا رہا ہے۔

ہیرو بلبلے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۸۷

قابل تقلید، بہادر، شجاع Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ہیرو کا لفظ اپنا خاص سماجی اور ثقافتی منظر نامہ رکھتا ہے۔ پہلے پہل جنگوں میں عظیم کارنامے انجام دینے والوں کے لیے اس لفظ کا استعمال کیا جاتا تھا۔ پھر قومی سطح پر قوم کے لیے بہتری کا کام کرنے والے ہیرو قرار پائے جب سے فلم انڈسٹری نے عروج پایا فلم کا مرکزی کردار بھی ہیرو قرار دیا جانے لگا۔ یوں یہ لفظ سماجی اور ثقافتی حوالے سے رائج ہوتا چلا گیا۔ ہیرو کے ہر استعمال کے پیچھے اصل میں وہ چند اہم خصوصیات شامل ہوتی

ہیں جو کسی بھی شخص کو ہیرو بناتی ہیں۔ اس لفظ کا استعمال انگریزی، اردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں عام ہوتا ہے۔

میرج ہال بلبلے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۹۰

شادی ہال Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

شادی بیاہ ہر ثقافت کا اہم عنصر ہوتے ہیں۔ جدید دور میں بدلتے وقت کے تقاضوں کے مطابق گھر میں شادی کی رسومات اور دیگر امور انجام دینے کی بجائے کسی ایسے کھلے ہال کا استعمال کیا جاتا ہے جو خاص اسی مقصد کے لیے تیار کیے جاتے ہیں۔ یہ ہال میرج ہال کہلاتے ہیں۔ میرج ہال میں بارات کے ٹھہرانے، رسومات، رخصتی سمیت دیگر تمام ثقافتی اور سماجی امور پایہ تکمیل تک پہنچتے ہیں۔ اردو میں شادی ہال اور میرج ہال دونوں الفاظ کا استعمال عام ملتا ہے۔ بعض لوگ مختصر طور پر صرف ہال بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہ ہال ثقافتی حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

سینٹ بلبلے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۹۷

صوفی Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

سینٹ ایسے صوفی منش انسان کو کہا جاتا ہے، مغرب و مشرق دونوں ثقافتوں میں یہ لوگ ثقافت کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ مشرقی ثقافت میں تو یہ اہم ثقافتی عنصر قرار دیے جاسکتے ہیں جو مختلف درباروں سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ میلوں ٹھیلوں میں بھی اپنی مخصوص وضع میں نظر آتے ہیں۔ مغرب میں ایسے اللہ لوک لوگوں کو سینٹ کہا جاتا ہے۔

فراڈ ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۱۲۱

دھوکا Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

دھوکا دہی جدید عہد میں مغربی اور مشرقی دونوں سماجوں میں رائج ہو چکی ہے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کے لیے دوسروں کو دھوکا دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسی دھوکا دہی کو فراڈ بھی کہا جاتا ہے۔ مشرق و مغرب دونوں سماج میں فراڈ کا لفظ خاصا مستعمل ہے۔ اس کی وسعت بھی بہت زیادہ ہے عام دھوکا دہی سے لے کر ملکی اور عالمی سطح تک کی دغابازی اس کے زمرے میں آتی ہے۔

میرج بیورو ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۱۲۷

رشتے کروانے کے مراکز Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

میرج ہال کی طرح میرج بیورو بھی سماجی اور ثقافتی حوالے سے خاص اہمیت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ یہ وہ ادارے ہوتے ہیں جو رشتے طے کرواتے ہیں، موجودہ عہد میں جہاں انسان کی مصروفیات بڑھی ہیں وہاں بہت سے مسائل بھی بڑھے ہیں۔ اچھے رشتوں کی تلاش عہد جدید کا اہم مسئلہ بن چکا ہے۔ میرج بیورو سے مختلف لوگ اس حوالے سے رابطہ کرتے ہیں جن کے پاس مختلف لڑکے اور لڑکیوں کے رشتوں کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ یہ دونوں خاندانوں میں رابطہ کرواتے ہیں اور دیکھ بھال کے بعد رشتے طے کیے جاتے ہیں، یوں سماجی بندھن قائم کرنے کے حوالے سے ان میرج بیوروز کی خاص خدمات ہیں۔ پنجابی میں رشتے کروانے والوں کو "وچولے" بھی کہا جاتا ہے۔

پریس ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۱۳۳

مطبع Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

پریس کا لفظی معنی تو دبا دینا کے ہوتے ہیں لیکن اصطلاح میں یہ لفظ چھاپا خانہ یا مطبع کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ جدید عہد میں صحافت سے یہ لفظ مخصوص ہو گیا ہے۔ صحافت کا سماج اور ثقافت میں گہرا عمل دخل ہونے کی وجہ سے یہ لفظ بھی خاص سماجی اور ثقافتی اہمیت کا حامل ہے۔ اردو میں بھی یہ لفظ اسی املا اور تلفظ کے ساتھ انھی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

کلینک ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۱۴۵

دواخانہ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

بیماری کی صورت میں علاج معالجہ کی سہولیات اور طریقہ کار بھی خاص سماجی مظہر ہے۔ مختلف ممالک میں مختلف طریقہ ہائے علاج مستعمل ہیں۔ کلینک ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں علاج کیا جاتا ہے۔ علاج کی نوعیت کے اعتبار سے کلینک کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ دیسی طریقہ علاج کا کلینک جدید طریقہ علاج سے مختلف ہو گا، جس سماج میں جو طریقہ علاج رائج ہو گا کلینک کا لفظ بھی انھی معنوں میں استعمال ہو گا۔ عام طور پر اس کے متبادل کے طور پر دواخانہ، شفاخانہ، مطب اور دیگر کئی متبادلات بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔

بلیک منی ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۱۷۲

غیر قانونی رقم Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

اس کے لیے کالا دھن کے الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ایسی رقم یا دولت جو حکومتی ٹیکسوں اور محصولات سے بچانے کے لیے چھپا کر رکھی جائے بلیک منی کہلاتی ہے۔ مشرق و مغرب کے سرمایہ دار اپنی تجوریاں بھرنے کے لیے وسیع پیمانے پر بلیک منی ذخیرہ کرتے ہیں اور پھر اس سے آگے مزید یہ کالا دھن پیدا کرتے ہیں۔ مغربی سماج کے ساتھ ساتھ مشرقی سماج میں بھی یہ کام بہت بڑھتا جارہا ہے۔ یہ ایسی رقم ہوتی ہے جو یا تو اکٹھی ناجائز ذرائع سے کی گئی ہوتی ہے یا پھر اس کو ٹیکسوں سے بچانے کے لیے سامنے نہیں لایا جاتا۔

ٹرائی ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۱۸۲

کوشش Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ٹرائی کے لفظی معنی کوشش کے ہیں۔اردو اور انگریزی دونوں میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔اس کا استعمال اردو میں اس کے متبادل کوشش کی بجائے پچھلے چند سالوں سے بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ بات بات پر کوشش کرنے کا بولنے کی بجائے ٹرائی کرنا بولا جاتا ہے۔

پراپرٹی ڈیلر ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۰۴

جائیداد کا کاروبار کرنے والے Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

پراپرٹی ڈیلر سماج کا اہم طبقہ ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو جائیداد کی خرید و فروخت میں لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور معاوضے کے طور پر اپنا کمیشن حاصل کرتے ہیں۔ یہ سماج کا ایک اہم طبقہ ہوتا ہے۔

لش گرین ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۰۵

سرسبز و شاداب Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

لش گرین کا لفظ اردو اور بعض اوقات تو پنجابی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ سرسبز و شاداب جگہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ایسی جگہ جہاں ہریالی ہی ہریالی ہو۔

پے منٹ ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۰۵

ادائیگی Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

پے منٹ کا لفظ انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو اور پنجابی میں بھی مستعمل ہو چکا ہے۔ عام ادائیگی کے ساتھ ساتھ تنخواہ تک کے لیے بھی یہی لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مشرقی اور مغربی دونوں سماج میں اس لفظ کا استعمال کثرت سے ہونے کی وجہ سے یہ لفظ خاص سماجی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

گیسٹ روم　　　　　　سفرنامے ۴۴۵

مہمان خانہ　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

گیسٹ روم (GUEST ROOM) کا مطلب اردو میں مہمان خانہ لیا جاتا ہے۔ وہ کمرا جس میں مہمان کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ ایک اور بات جو یہاں بیان کرنے کے قابل ہے کہ ثقافتی اختلاف کی وجہ سے مغرب اور مشرق میں مہمان کا تصور بھی الگ الگ ہے، مشرق میں مہمان کو اللہ تعالیٰ کی رحمت اور میزبانوں کے لیے باعث برکت خیال کیا جاتا ہے۔ اسی لیے قریبی رشتہ داروں کی مہمان نوازی کے لیے پورا گھر حاضر ہوتا ہے کوئی باقاعدہ مہمان خانہ نہیں اور جو مہمان، مہمان خانہ میں ٹھہرائے جانے ہوتے ہیں ان کے لیے بھی مہمان خانے خاصے وسیع ہوتے ہیں تاکہ مہمان کو کوئی تکلیف پیش نہ آئے۔ مشرق میں مہمان کے ٹھہرنے کے اوقات بھی عام طور پر کئی دنوں پر بھی محیط ہوسکتے ہیں کیوں کہ یہ مشرقی معاشرت اور سماج کا حصہ ہے جب کہ مغرب میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں کی زندگی یہاں کی نسبت زیادہ مصروف ہے اور وہاں مہمانوں کا ٹھہرنا اسی قدر ہی اہمیت رکھتا ہے گویا کہ مسافر نے سرائے میں رات بسر کی اور آگے چل دیا اس لیے ان کے "گیسٹ روم" بھی اسی مختصر وقت کو گزارنے کے تصور کو سامنے رکھتے ہوئے تعمیر کیے جاتے ہیں۔

انکل　　ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۳۵

چچا　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

کزن کی طرح انکل کا لفظ بھی مشرقی اور انگریزی سماج کے حوالے سے خاص انفرادیت رکھتا ہے۔ جس طرح مغرب میں مختلف رشتوں کے لیے کزن بولا جاتا ہے جب کہ اردو میں ان سب رشتوں کا اپنا اپنا لفظ موجود ہے اسی طرح خاندانی نظام کی اہمیت نہ ہونے کی وجہ سے مغرب میں چچا، ماموں، خالو، تایا حتیٰ کہ کسی انجان شخص کے لیے بھی انکل کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

آنٹی　　ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۳۵

چچی　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

انکل کی طرح آنٹی کا لفظ مغرب میں کسی خاص رشتے کی بجائے ممانی، چچی، خالہ اور انجان عورت سب کے لیے بولا جاتا ہے اس کی بڑی وجہ بھی مغرب میں خاندانی نظام نہ ہونے کی وجہ سے رشتوں کی پہچان کا نہ ہونا ہے۔

پارٹی　　ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۳۶

اکٹھ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

پارٹی کا لفظ اپنے اندر خاص سماجی اور ثقافتی تناظر رکھتا ہے۔ سماج میں مختلف لوگوں کا ایسا اکٹھ جو کسی خاص مقصد کے لیے ہو پارٹی کہلاتا ہے۔ یہ لفظ بھی متنوع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عام اکٹھ سے لے کر ایوان اقتدار تک موجود مختلف سیاسی پارٹیاں سبھی اس لفظ کے اندر سما جاتی ہیں۔ قاسمی کی تحریروں میں پارٹی کا لفظ سماج کے باشندوں کے ایسے اکٹھ کے طور پر استعمال ہوا جو چند لمحات اکٹھے گزارنے کے لیے کسی جگہ جمع ہوتے ہیں اور ساتھ مل بیٹھتے ہیں۔

سوشلسٹ ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۴۰

سماجی Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ایسے شخص یا گروہ کے لیے سوشلسٹ کا لفظ بولا جاتا ہے جو سماجی حوالے سے خاصا سرگرم ہو اور اس کے قول و فعل سے سماج کی بہتری کے بارے میں ہی بات اور عمل ہو۔ اس کا مطمع نظر ہر حوالے سے سماجی بہتری ہو۔ مغرب میں یہ لفظ خاصا مستعمل ہے کیوں کہ وہاں سماجی بہتری کے لیے مختلف لوگ اور ادارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ مغرب میں بھی ایسے لوگ اور ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان کے لیے سماجی کارکن کے الفاظ بھی استعمال کیے جاتے ہیں۔ سوشلسٹ کا لفظ بھی اردو میں مستعمل ہے۔

اکاؤنٹ ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۴۱، ۲۸۵، ۲۸۹

عطایئے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۳۵۳

کھاتہ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

اکاؤنٹ کا معنی کھاتا کے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسا کھاتہ جو بینک میں اسے اکاؤنٹ یا بینک اکاؤنٹ کہا جاتا ہے۔ جدید دور میں اس لفظ میں خاصی وسعت آچکی ہے۔ موبائل اکاؤنٹ اور دیگر کئی طرح کے اکاؤنٹ سامنے آنے سے سماج میں اس لفظ کا استعمال اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کا متبادل اردو لفظ کھاتہ بہت کم استعمال ہوتا ہے۔

برتھ ڈے ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۴۷

جنم دن Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

برتھ ڈے جنم دن کو کہتے ہیں۔ مغرب میں دوستوں کی سطح پر اور گھر میں یہ باقاعدہ اہم سماجی اور ثقافتی عمل بن چکا ہے کہ کسی کے جنم دن کے موقعے پر ہر سال کیک کاٹا جاتا ہے اور، پارٹی ہوتی ہے، جس کا جنم دن

ہوتا ہے اسے تحائف دیے جاتے ہیں۔یوں اس دن کو یادگار بنایا جاتا ہے۔مغرب کی نقالی میں پاکستانی سماج میں بھی یہ روش عام ہوتی جارہی ہے۔لوگ اپنے بچوں کی برتھ ڈے کی تقریب پر جوش انداز میں منعقد کرتے ہیں۔

ایڈوانس　　پیشگی　　ہنسنارونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۴۷

وہ رقم جو کسی بھی کام کی اجرت یا خریداری کے لیے پیشگی کے طور پر ادا کی جاتی ہے ایڈوانس کہلاتی ہے۔اس رقم کی سماجی حیثیت اس حوالے سے خاصی اہم ہے کہ ایڈوانس کی رقم ملنے پر مزدور کو اپنی مزدوری ملنے کا یقین ہو جاتا ہے۔اس کے علاوہ سماج میں یہ ایڈوانس کی رقم بہت سے سماجی معاملات کو سدھارنے کا کام دیتی ہے۔

ریٹ　　ہنسنارونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۵۳

نرخ　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ریٹ کے معنی نرخ کے ہوتے ہیں۔اردو میں یہ لفظ اب اس حد تک مستعمل ہو چکا ہے کہ اردو کا ہی شمار کیا جانے لگا ہے۔اس کا متبادل نرخ اردو میں اب کم استعمال ہوتا ہے۔ریٹ کا لفظ اردو کے علاوہ پنجابی میں بھی انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

سمائل　　ہنسنارونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۶۳

مسکراہٹ　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

سمائل کا معنی مسکراہٹ ہے۔ثقافتی حوالے سے دیکھا جائے تو سماج میں اس کی بہت اہمیت ہے۔کسی بھی سماج میں موجود مختلف لوگوں کے درمیان جھگڑوں کے خاتمے کے لیے ایک سمائل جتنی کارگر ثابت ہوتی ہے اتنا کوئی اور ہنر کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔اس کے علاوہ مغربی سماج میں لڑکی کا کسی کو دیکھ کر سمائل دینا محبت کا لطیف اشارہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔

نارمل　　ہنسنارونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۷۸، ۳۱۳، ۲۸۲، ۳۳۷

عطایئے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۳۶۸

عام انداز　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

نارمل کے معنی عام یا معمولی کے ہیں۔ وہ کام جنس کو عام یا معمول کے انداز میں اس طرح ہو کہ اس میں کوئی انوکھا پن یا غیر معمولی پن نہ پایا جائے وہ نارمل کہلاتا ہے۔ اردو میں بھی یہ لفظ کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔

میم ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۸۱

گوری عورت Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

"میم" انگریزی کا ایسا لفظ ہے جو مختلف جگہوں پر مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں یہ لفظ میڈم سے ہے۔ اس لفظ کا استعمال متنوع ہے۔ اس لفظ کے استعمال کے جتنے بھی طریقے ہیں ان سب میں ایک بات مشترک ہے کہ یہ لفظ ایسی عورت کے لیے بولا جاتا ہے جو جاذب نظر اور پرکشش ہو۔ عطاء الحق قاسمی نے مغربی عورتوں کے لیے "میمیں" کا لفظ بھی ان کی اسی خاصیت کو سامنے رکھتے ہوئے استعمال کیا ہے۔ اور تحریر میں "میم" کا لفظ پڑھتے ہی قاری کا ذہن اس منظر نامے میں پہنچ جاتا ہے جہاں مغربی عورت مختصر لباس پہنے دعوتِ نظارہ دیتی نظر آتی ہے، یوں اس لفظ کا اپنا ثقافتی منظر نامہ اس لفظ کے استعمال سے تحریر کو زیادہ پر اثر بناتا ہے۔

میرٹ ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۲۹۶

اہلیت Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

لفظ میرٹ Merit اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ عام طور پر میرٹ کا معنی اہلیت ہے کہ کسی کام کے لیے جو کم سے کم اہلیت درکار ہو اس پر پورا اترنا میرٹ کہلاتا ہے۔ میرٹ کو قابلیت کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے کہ کوئی شخص کسی کام کے لیے کتنا قابل اور اہل ہے۔ اسی طرح بعض اوقات یہی میرٹ سنیارٹی کا درجہ بھی لے لیتا ہے کہ اگر کسی نظام میں ترقی کی بنیاد عرصہ ملازمت میں سنیارٹی ہو تو وہاں میرٹ دیگر شخصی خوبیوں کی بجائے اس کی سنیارٹی ہی گردانا جائے گا، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ میرٹ کا تعین جن اصول و ضوابط کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے ان اصولوں پر پورا اترنا ہی دراصل میرٹ پر پورا اترنا ہے اور ان اصول و ضوابط کو پورا کرنا کسی بھی نظام میں شامل ہر شخص کے لیے ضروری ہے۔ مغرب میں میرٹ کا لفظ اسی سماجی پس منظر میں استعمال کیا جاتا ہے کہ جس ملازمت یا کسی بھی کام کے لیے جو بھی اصول و ضوابط بنا دیے جاتے ہیں اور جو اہلیت کا معیار مقرر کر دیا جاتا ہے ہر شخص کو اس کی پیروی کرنا ہوتی ہے بصورت دیگر اس نظام سے ان کو نکال باہر کیا جاتا ہے اور ان کی جگہ دوسرے اہل افراد اس نظام کا حصہ بن جاتے

ہیں۔ میرٹ کی اس بالادستی سے اس معاشرے میں افرادی قوت کے مسائل پیدا نہیں ہوتے اور ہر شخص اپنے کام سے غرض رکھتا اور اپنے درجے سے اگلے درجے میں ترقی کے لیے خود کو اہل بنانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے یوں نظام میں بہتری کے آثار پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ نظام سماج میں اپنی ساکھ مضبوط کرتا چلا جاتا ہے۔

پرابلم　　ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۳۲۷، شر۔ گوشیاں ۵۱

مسئلہ　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

پرابلم کا لفظی معنی تو مسئلہ ہے لیکن اردو میں یہ لفظ تکلیف سمیت کئی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مغرب میں بھی اس کا استعمال خاصا متنوع ہے۔ اردو میں یہ لفظ اب اسی تلفظ کے ساتھ رائج ہو رہا ہے۔ بہت سے مواقع پر پرابلم کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

ایکسیڈنٹ　　ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۳۱۹

حادثہ　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

ایکسیڈنٹ کا لفظی معنی تو فوری اور اچانک ہونے والا کوئی بھی واقع ہے لیکن سماجی و ثقافتی تناظر میں دیکھیں تو یہ لفظ اب ٹریفک حادثات سے مخصوص ہو کر رہ گیا ہے۔ اب ایکسیڈنٹ کا لفظ جہاں بھی بولا یا پڑھا جاتا ہے فوری طور پر کسی ٹریفک حادثے کی طرف انسان کا ذہن جاتا ہے۔ اگرچہ یہ لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے لیکن یہ اپنے معنی وسیع کرنے کی بجائے محدود کر چکا ہے۔

واک　　ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۳۲۱

چلنا۔ سیر کرنا　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

واک کے لفظی معنی تو چلنا کے ہیں۔ مشرق و مغرب دونوں میں یہ لفظ خاصے وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ چلنا۔ سیر کرنا سب اسی واک کے اندر آتے ہیں۔ واک کے دوران مختلف لوگوں خاص طور پر بزرگوں کا ایک دوسرے سے ملنا اور احوال دریافت کرنا سماجی اور ثقافتی حوالے سے اس لفظ کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔

وزٹ　　عطائیے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۳۴۱

دورہ　　Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

وزٹ کا لفظ بھی سیر کرنا، دورہ کرنا کے معنوں میں اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کا سماجی و ثقافتی تناظر اس حوالے سے سامنے آتا ہے کہ سماج میں مختلف خاندان بھی ایک دوسرے کو ملنے کے لیے ایک دوسرے کے ہاں جاتے ہیں جو کہ وزٹ کے زمرے میں ہی آتا ہے۔

کلاس فیلوز عطایئے، مشمولہ "مجموعہ"، ص:۳۵۳

ہم جماعت Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

سماجی اور ثقافتی حوالے سے کلاس فیلو کا لفظ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ایک ہی کلاس میں پڑھنے والے مختلف لوگ آپس میں ایک کنبے کی مانند ہوتے ہیں۔ ان کے اطوار و اخلاق کافی حد تک ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں ایک بہتر سماج کی تشکیل میں وہ اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔ ان تمام خوبیوں کی وجہ سے ہی زندگی کے کسی موڑ پر کوئی کلاس فیلوز ملیں تو وہ ایک دوسرے کے لیے خاص اپنائیت رکھتے ہیں۔

سوری شر۔ گوشیاں، ص:۲۹

معذرت Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

انسان خطا کا پتلا ہے، جانے انجانے میں اس سے کوئی نہ کوئی خطا سرزد ہو جاتی ہے۔ اگر انسان اپنی خطا کا احساس کرتے ہوئے دوسرے شخص سے معذرت کرلے تو سماجی بہتری کی راہ ہموار ہو سکتی ہے۔ سماج میں بسنے والے مختلف لوگ معذرت کے لیے انگریزی لفظ سوری Sorry استعمال کرتے ہیں جو معذرت کے معنوں میں ہی استعمال ہوتا ہے۔

سروس شر۔ گوشیاں، ص:۳۱

خدمت Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

سروس کا لفظ اپنے اندر سماجی حوالے سے خاص معنویت رکھتا ہے۔ اس لفظ کے لفظی معنی خدمت کے ہیں۔ ہمارے ہاں جس کو ملازمت کہا جاتا ہے مغربی معاشرے میں اسے ہی خدمت کا درجہ دیتے ہوئے سروس کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

Change ہر فن مولا، ص:۱۹

بدل Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

چینج کا لفظ اردو میں بدل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں بڑے کرنسی نوٹ کے بدلے چھوٹے کرنسی نوٹ لینے کو "کھلے پیسے" لینا بھی کہا جاتا ہے، پنجابی میں اس عمل کے لیے لفظ "بھان" بھی

استعمال ہوتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ گزشتہ کچھ سالوں سے چینج کا لفظ کرنسی نوٹوں کی تبدیلی کے لیے پنجابی اور اردو دونوں میں ہی استعمال کیا جا رہا ہے۔ یہاں قاسمی صاحب نے چینج کا لفظ بھی کرنسی کی تبدیلی کے لیے استعمال کیا ہے اور یہ اس مغربی معاشرے کا مقبول عام لفظ ہے۔

Angle ہر فن مولا، ص:۱۹

زاویہ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

اینگل کا لفظ زاویے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن یہ زاویہ صرف کسی مثلث کا مستطیل کا ہی نہیں بلکہ کسی بھی کام یا بات کے کسی بھی پہلو کے لیے بھی اینگل کا لفظ بولا جاتا ہے۔ مغرب کے ساتھ ساتھ مشرقی سماج میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ سماج کے مختلف پہلوؤں سے ہونے والے تجزیوں کے دوران اس لفظ کا استعمال عام ملتا ہے۔

Impress ہر فن مولا، ص:۲۳

متاثر کرنا Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

Impress کا لفظ مغرب کے ساتھ ساتھ مشرقی سماج میں بھی خاصا مستعمل ہے۔ اس کا متبادل اردو لفظ متاثر کرنا یا متاثر ہونا بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی کو کسی بھی خوبی سے اپنے سے کم تر ثابت کرنے کی کوشش Impress کرنے کے زمرے میں آتی ہے۔ سماج میں یہ رویہ خاصا توانا ہو چکا ہے۔ ہر کوئی دوسرے کو اپنے طرزِ عمل اور اپنی عادات و افکار سے Impress کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

سرٹیفیکیٹ ہر فن مولا، ص:۴۵

تصدیق نامہ Gem Practical Dictionary, 21st Century Edition

سرٹیفیکیٹ کی مختلف اقسام کے سماج میں کئی طرح کے استعمالات کی وجہ سے اس لفظ کا استعمال بھی سماج میں خاصا بڑھ چکا ہے۔ اردو میں بھی تصدیق نامہ کی بجائے اب زیادہ تر سرٹیفیکیٹ ہی استعمال ہوتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں انگریزی کے ان الفاظ کا استعمال دیکھا جائے تو انہوں نے ان الفاظ کا خاص سماجی اور ثقافتی تناظر میں استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں انگریزی کے ان لفظوں کا استعمال زیادہ ملتا ہے جو عام طور پر اردو میں بھی مستعمل ہیں۔ یہ ایسے الفاظ ہیں جن کے اردو متبادلات موجود ہونے کے باوجود اردو میں ان کا استعمال اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ یہ اب اردو کے ہی شمار کیے جاتے ہیں۔ زندہ زبانوں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے دیگر بہت سی زبانوں کے بہت سے الفاظ اپنے

دامن میں سموتی چلی جاتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ الفاظ اس زبان کے قواعد کے مطابق یوں ڈھلتے چلے جاتے ہیں کہ ایک وقت آتا ہے کہ وہ اسی زبان کے الفاظ قرار دے دیے جاتے ہیں۔ اردو میں ان الفاظ کا استعمال بھی اردو کے اسی ارتقائی عمل کا حصہ ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے ان انگریزی الفاظ کا استعمال کر کے اپنے اسلوب میں جان ڈال دی ہے اور تحریر کی زبان کو پڑھے لکھے سماج کی زبان کے قریب کر دیا ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریر میں حقیقت بیانی کا وصف پیدا ہوا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، مشمولہ، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص۴۳۵

۲۔ ایضاً، ص۴۳۸

۳۔ ایضاً، ص۴۳۹

۴۔ ایضاً، ص۴۳۹

۵۔ ایضاً، ص۵٦۸

٦۔ ایضاً، ص۴۴۲

۷۔ ایضاً، ص۴۳۴

۸۔ ایضاً، ص۵۰٦

۹۔ ایضاً، ص۵۵۱

۱۰۔ عطاء الحق قاسمی، شر گوشیاں، نستعلیق مطبوعات، لاہور ستمبر ۲۰۱۲ء، ص۱۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص۱۳۱

۱۲۔ ایضاً، ص۵۲۴

۱۳۔ ایضاً، ص۳۴۴

۱۴۔ عطاء الحق قاسمی، دھوتی، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۴۱

۱۵۔ عطاء الحق قاسمی، شر گوشیاں، نستعلیق مطبوعات، لاہور ستمبر ۲۰۱۲ء، ص۳۷

۱٦۔ ایضاً، ص۱۳۸

۱۷۔ ایضاً، ص۱۳۸

۱۸۔ ایضاً، ص۱۳۸

۱۹۔ عطاء الحق قاسمی، شوق آوارگی، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۱۲، ص۱٦۲

۲۰۔ ایضاً، ص۱٦۷

۲۱۔ عطاء الحق قاسمی، دنیا خوبصورت ہے، مشمولہ، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص۳۰۷

۲۲۔ ایضاًص۳۲۸

۲۳۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۱۱۹

۲۴۔ ایضاً، ص۱۲۲

۲۵۔ ایضاً، ص۴۷۶

۲۶۔ ایضاً، ص۵۱۲

۲۷۔ عطاء الحق قاسمی، شوق آوارگی، لاہور، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۱۲، ص۳۹

۲۸۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، مشمولہ، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء ص۵۳۴

۲۹۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۴۴۰

۳۰۔ ایضاً، ۴۶۳

۳۱۔ ایضاً، ۴۶۳

۳۲۔ عطاء الحق قاسمی، شر گوشیاں، نستعلیق مطبوعات، ستمبر، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۳۰

۳۳۔ ایضاً، ص۲۲

۳۴۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۱۶۹

۳۵۔ ایضاً، ص۱۳۶

۳۶۔ عطاء الحق قاسمی، روزنِ دیوار سے، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۱۳، ص۸۲

۳۷۔ عطاء الحق قاسمی، شر گوشیاں، نستعلیق مطبوعات، ستمبر، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۱۲

۳۸۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص۲۱۶

۳۹۔ ایضاً، ص۱۲۱

۴۰۔ ایضاً، ص۸۲

۴۱۔ ایضاً، ص۱۳۰

۴۲۔ عطاء الحق قاسمی، ہر فن مولا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۴۶۱

۴۳۔ عطاء الحق قاسمی، حویلی، ڈراما، سی ڈی

۴۴۔ ایضاً

۴۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۵۳۳

۴۶۔ عطاء الحق قاسمی، شر گوشیاں، نستعلیق مطبوعات، ستمبر، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۵

۴۷۔ ایضاً، ص ۵۸

۴۸۔ ایضاً، ص ۷۷

۴۹۔ ایضاً، ص ۸۴

۵۰۔ ایضاً، ص ۳۱

۵۱۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۵۲۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳۳

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۳۳

۵۴۔ عطاء الحق قاسمی، شر گوشیاں، نستعلیق مطبوعات، ستمبر، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۹

۵۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۲

۵۶۔ عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، مشمولہ، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۴۱۳

۵۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا منع ہے، مشمولہ مجموعہ، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۴ء، ص ۲۴۶

۵۸۔ عطاء الحق قاسمی، شوق آوار گی، لاہور، نستعلیق مطبوعات، لاہور، ۲۰۱۲، ص ۴۸

۵۹۔ عطاء الحق قاسمی، شر گوشیاں، نستعلیق مطبوعات، ستمبر، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۱۲۲

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۳

۶۱۔ ایضاً، ص ۵۸

۶۲۔ ایضاً، ص ۲۰۵

۶۳۔ عطاء الحق قاسمی، دلی دور است، مشمولہ، سفر نامے، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص ۷۱۴

باب چہارم:

عطاء الحق قاسمی کی نثر میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کے متبادل اردو لفظیات کا تقابل

ا۔ پنجابی لفظیات کے متبادل اردو لفظیات کا تقابل

اردو زبان میں ارتقائی مدارج تحت کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے الفاظ دیگر زبانوں کے بھی شامل ہوتے گئے یوں اردو کا دامن خاصا وسیع ہوتا گیا۔ اردو میں دیگر زبانوں کے الفاظ کی شمولیت دوزاویوں سے دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک تو ایسے الفاظ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو میں شامل ہوتے گئے اور اہلِ زبان نے انہیں اردو زبان کا ہی حصہ بنا دیا۔ ایسے الفاظ اردو میں شامل ہو کر اردو کے قواعد کے سانچے میں ڈھل گئے اور انگریزی، پنجابی یا کسی بھی اور زبان کے الفاظ ہونے کے باوجود وہ اردو میں شامل ہو کر اردو ہی کے الفاظ بن گئے۔ ایسے الفاظ نہ صرف مختلف تخلیق کاروں کی تحریروں میں شامل ہوتے ہیں بلکہ وہ الفاظ ہماری روزمرہ کی اردو بول چال کا حصہ بھی ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کے الفاظ ایسے ہیں جو کسی تخلیق کار کے ذاتی ذہنی میلا نیا اس کے ماحول کے زیر اثر اس کی اردو تحریروں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ایسے الفاظ اردو کا حصہ تو نہیں بنے ہوتے لیکن تخلیق کار نے اپنی تحریروں میں ان کو استعمال کیا ہوتا ہے۔ ایسے الفاظ کا تحریروں میں استعمال اس ماحول کی وجہ سے ہوتا ہے جس کے بارے میں وہ تحریر لکھی جارہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں لکھے گئے برطانیہ یا یورپی ممالک کے سفرناموں میں ہمیں انگریزی الفاظ کا استعمال کثرت سے ملتا ہے کیونکہ تخلیق کار وہاں کے ماحول میں وہاں کے لوگوں کی جس طرح ترجمانی کر رہا ہوتا ہے اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ وہاں کے لوگوں کے خیالات، احساسات اور نظریات اس انداز میں تحریر کرے کہ ان کی زبان متاثر نہ ہونے پائے۔

دیگر زبانوں کے الفاظ کے اس طرح شامل ہونے یا کرنے کی صورت میں ایک اور بات قابلِ تحقیق ٹھہرتی ہے کہ تخلیق کار نے دوسری زبان کا جو لفظ اپنی تحریر میں استعمال کیا ہے وہ کس تناظر اور کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ ایک لفظ کے ایک زیادہ معنی بھی ہوتے ہیں۔ تخلیق کار جب کسی دوسری زبان کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اس کے پاس اس کا کوئی معقول جواز ہوتا ہے اور کوئی مخصوص معنی ہوتے ہیں جن معنوں میں وہ اس لفظ یا الفاظ کو اپنی تحریر میں شامل کر رہا ہوتا ہے۔ اس بات کی تحقیق کے لیے ان الفاظ کے مختلف معنوں کا آپس میں تقابلی جائزہ لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے اس باب میں عطاء الحق

قاسمی کی نثر میں استعمال ہونے والے پنجابی اور انگریزی لفظیات کے اردو متبادلات کا تقابلی جائزہ لے کر اس امر کی وضاحت کی جائے گی کی قاسمی نے یہ لفظ کن معنوں میں استعمال کیا ہے۔

عطاءالحق قاسمی کی نثر میں پنجابی زبان کے الفاظ بہت زیادہ استعمال ہوئے۔ پنجابی زبان کے الفاظ کا زیادہ استعمال ان کی ان نثری تحریروں میں ملتا ہے جو انہوں نے ظریفانہ مضامینیا کالموں کی شکل میں تحریر کی ہیں ۔ یہ تحریریں جہاں ایک طرف پنجابی معاشرت اور ثقافت کی نمائندگی کرتی ہیں وہیں اردو کی ان تحریروں میں پنجابی زبان کے الفاظ کی شمولیت تحریروں کو معنوی اور صوتی حوالے سے بھی ایک نکھار عطا کرتی ہے۔ ذیل میں ان کی نثر سے پنجابی زبان کے الفاظ والی تحریروں کی مثالیں پیش کرنے کے ساتھ ان پنجابی الفاظ کے مختلف معنوں کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔ عطاءالحق قاسمی پنجاب میں شادی بیاہ کی رسومات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "میرے دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا کہ اس میں دلہن وغیرہ کے لیے قیمتی پارچہ جات ہیں جو دلہن والوں کو دکھا کر دلہا واپس اپنے گھر لے جائے گا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان کپڑوں کو "وری" کے کپڑے کہا جاتا ہے۔"(۱)

"وری" اس تحریر میں پنجابی لفظ استعمال ہوا ہے جب ہم اس لفظ کے اردو متبادل پر غور کرتے ہیں تو:

"(وری سوئی بھتا) بیاہ کے موقع پر دلہا دلہن کے گھر کپڑے وغیرہ خرید کرنا۔(م:)۔(۲)

کے معنی اس لفظ کے سامنے آتے ہیں۔ عطاءالحق قاسمی نے شادی بیاہ کی اس رسم میں ان کپڑوں اور دیگر سامان کو پنجابی الفاظ میں ہی بیان کر کے اس میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے۔ اردو میں اس کے بری کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

شادی بیاہ کے موقع پر نوٹ پھینکنا ایک عام دستور بن چکا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

> "اگر کسی بارات میں ایسا نہ ہو تو یہ بچے چند قدم ساتھ چلنے کے بعد " اوئے اوئے " کرنا شروع کر دیتے ہیں جس کا مطلب یہاں باراتیوں کی " ناک کٹ جانا" سمجھا جاتا ہے "(۳)

"اوئے اوئے کرنا" اردو میں درج ذیل معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

"۱۔ بے عزتی سے بلانا، ۲۔ لڑائی جھگڑے کی بات کرنا۔"(۴)

یہاں ان دونوں معنوں کا تقابل کیا جائے تو قاسمی صاحب نے جس صورت حال کی منظر کشی کی ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ ان کے ہاں اس تحریر میں یہ لفظ "بے عزتی سے بلانا" کے معنوں میں استعمال ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بچے پیسے نہ ملنے کی وجہ سے بارات والوں کو شرمسار کرتے ہیں جس کی وجہ سے قاسمی صاحب کے الفاظ میں "ناک کٹ جاتی" ہے یعنی بے عزتی ہو جاتی ہے۔

پنجاب کے خاص طور پر دیہاتی علاقوں میں عورت کا کام گھر سنبھالنا اور امور خانہ داری انجام دینا ہوتا ہے۔ گھر کے تمام کام اس کے ذمے ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں قاسمی لکھتے ہیں:

> "اسے گھر کی رانی سمجھتے ہیں اور پوری عزت دیتے ہیں، تاہم اس رانی کے فرائض میں جھاڑو دینا، برتن صاف کرنا، پوتڑے دھونا، کھانا پکانا، جھاڑ پونچھ کرنا اور شوہر، نیز اس کے ماں باپ، بہن بھائی، رشتے دار اور دوستوں کے نخرے اٹھانا ہے"(۵)

"پوتڑا" پنجابی لفظ ہے جس کے معنییوں بیان کیے جاتے ہیں کہ:

"نہالچہ۔ بچوں کے چوتڑوں کے نیچے رکھنے والا کپڑا (تاکہ پیشاب سے بستر خراب نہ ہو۔ نیپ کن، ۲، ننھے بچے کے لپیٹنے کا کپڑا۔ (ننھی چادر)"(۶)

قاسمی کے ہاں یہ لفظ اپنے انہی حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ پنجاب کی عورت اپنے گھر، خاوند اور بچوں کی ہر طرح سے دیکھ بھال کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اسے بچے کے گیلا ہونے یا پاخانہ کرنے کی صورت میں اسے صاف کرنے کے لیے الگ سے کسی آیا کی خدمات حاصل نہیں ہوتیں جس کی وجہ سے وہ پوتڑے دھونے سمیت تمام امور خود ہی انجام دیتی ہے۔

پنجابی معاشرت میں کسی عزیز رشتہ دار کے فوت ہو جانے پر غم کے اظہار کے طریقوں کو بیان کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں:

> "گھر کے قریب پہنچتے ہی ان کی آہ وزاری بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہے حتیٰ کہ وہ گھر کی دہلیز پر قدم رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک کہرام مچ جاتا ہے۔ اس موقع پر وہ باری باری مرنے والے کے قریبی لواحقین کو جپھا ڈال کر رونے جیسی آوازیں نکالتی ہیں۔" (۷)

جپھا ڈالنے کے اردو متبادل یوں بیان کیے گئے ہیں:

"جپھا: جپھے کی طرح چمٹنا۔ ۲۔ کشتییا پیار سے کسی کو گلے لگانے کی حالت یا فعل (
پانا۔مارنا) = کلاوا۔ بڑی جپھی۔ ۳۔ بغلگیری، پہلو"(۸)

جپھا ڈالنا کے جو معنی بیان کیے گئے ان کا تقابل کیا جائے تو عطاء الحق قاسمی نے جو صورت حال بیان کی ہے اس میں اس لفظ کا پنجابی متبادل "پیار سے گلے لگانے کی حالت" ہے۔ انہی معنوں میں یہ لفظ ان کے ہاں استعمال ہوا۔

پنجاب میں رشتے ناتوں کے اپنے نام ہوتے ہیں۔ ایک لفظ بہت سے معنوں اور بعض اوقات متضاد معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک لفظ "شریک" ہے۔ جس کا تذکرہ قاسمی صاحب یوں کرتے ہیں۔

"میں نے ہمراہی سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور کیا گفتگو کر رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ یہ کھانے کی گھٹیا کوالٹی پر بڑبڑا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ شوربہ پانی کی طرح پتلا تھا........ نیز یہ کہ یہ برادری کے لوگ ہیں اور انہیں "شریک" کہا جاتا ہے"(۹)

شریک بمعنی:

"شریک: (مذ۔ع) = بمعنی حصہ دار ا۔ دشمن (ش:) ۲۔ ساتھی۔ بھیال۔ بھرابھائی۔ حصہ دار (کرنا۔ہونا) ۳۔ رشتہ دار۔ ۴۔ قریبی۔ ۵۔ ہمسایہیک جدی۔ ورثا۔ (م:) کُڑم۔"(۱۰)

یہاں شریک برادری والوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے اور اس میں بھی وہ برادری والے جو دل میں ایک دوسرے کے خلاف بغض رکھتے ہیں۔

پنجابی ملبوسات میں دھوتی ایک اہم لباس ہے۔ دیہات میں آج بھی اس کا چلن عام ہے۔ قاسمی صاحب نے اس کی عکاسیوں کی ہے۔

"دوسرے طبقے کے لوگوں میں دھوتی ایک بہت مقبول لباس ہے۔ یہ ایک ان سلے کپڑے پر مشتمل ہوتا ہے جسے لوگ اپنی کمر کے گرد باندھ لیتے ہیں" (۱۱)

دھوتی لباس کا ہی ایک حصہ ہوتی ہے۔ لغت میں اس کے معنییوں بیان کیے گئے ہیں کہ:

"دھوتی: (ص/مث)۔ ا۔ ہندوؤں کے نیچے باندھنے والا ایک کپڑا۔ پانچ سے چھ گز تک لمبی ہوتی ہے۔ یہ عام طور پر مرد باندھتے ہیں جو کہ سوا گز چوڑا ہوتا ہے۔" (۱۲)

ان تمام معنوں میں دھوتی ایک لباس کے حصے کے طور پر ہی سامنے آتی ہے۔ ہندوؤں میں اس کے باندھنے کا رواج عام ہے۔ قاسمی کے ہاں بھیبہ لفظ اپنے اصلی معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔

لاہور والوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ پتنگ بازی اور پتنگ لوٹنے کو عمل کو بڑے لطیف انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہاں کے لوگوں کو پتنگیں لوٹنے کو بہت شوق ہے۔ وہ بیسیوں فٹ بلند چھتوں کی پتلی اور کمزور سی منڈیر پر "ڈھانگا" لیے کھڑے رہتے ہیں" (۱۳)

ڈھانگا ایک لمبا سا ڈنڈا ہوتا ہے جس سے پتنگ لوٹی جاتی ہے اس کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً

"ڈھانگا: (مذ)۔ ا۔ کیکر کی پھلیاں وغیرہ جھاڑنے والا لمبا بانس۔ ۲۔ کھونڈی والیبا لوہے کی خمدار شکل لگی ہوئی۔ ۳۔ لمبا بانس جس کے سرے پر داتری لگی ہوتی ہے۔ ڈھانگو = ڈھانگوا۔ فوجی بھرتی والوں کی لمبی سوٹی جس سے قد ماپتے ہیں۔ ۴۔ لمبی اور پتلی لکڑی" (۱۴)

قاسمی نے اس پنجابی لفظ کو اوپر دیے گئے معنوں میں سے پہلے معانی کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کہ پتنگ لوٹنے والوں کے پاس بھی ایسا ڈنڈا ہوتا ہے جیسا کہ کیکر کی پھلیاں وغیرہ جھاڑنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

رمضان کے مہینے میں مسلمانوں کے ہاں صورت حال خاصی بدل جاتی ہے۔ جہاں ایک طرف لوگ عبادات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں وہیں بہت سے غریب غرباء مانگنے کے لیے بھی نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اس صورت حال کو بیان کرتے ہوئے عطاء الحق قاسمی پنجابی لفظیات کا استعمال یوں کرتے ہیں۔

"ہاتھوں میں چمٹا پکڑے گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آجاتے ہیں اور خوب اودھم مچاتے ہیں۔ جن کے پاس ڈھول نہیں ہوتا وہ کوئی ٹین وغیرہ کھڑکاتے ہیں۔" (۱۵)

ٹین کھڑکانا پنجاب کے گلی محلوں میں ایک عام رواج ہے۔ بچے بھی مستی میں آکر اسے بجاتے رہتے ہیں۔ ٹین اصل میں دیہات کا ایک ڈبہ ہوتا ہے جس کے معنی:

"ٹین (انگ۔**Tin**۔مذ)۔ایک دھات لوہے کی پتلی جستی چادر۔۲۔پیپا یعنی کنستر۔
۳۔ٹینڈ۔پال۔(پ:)۔"(۱۶)

ٹین کھڑکانا خاص طور پر رمضان کے مہینوں میں عام ہوتا ہے۔مانگنے والے اور بچے دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے ٹین کھڑکاتے ہیں۔ قاسمی کی تحریروں میں پنجابی معاشرت کی عکاسی بھی پنجابی الفاظ میں ملتی ہے۔بیٹھنے کا انداز ملاحظہ ہو:

"یہاں میں نے سینکڑوں لوگوں کو بھرے ہوئے ایک ہال میں دیکھا کہ سٹیج پر دو شخص چوکڑی مار کر بیٹھے تھے"(۱۷)

چوکڑی مارنا

"چوکڑی مارنا:(مار بیٹھنا)(مار کے بیٹھنا)۔ٹانگوں کو سنگوڑ کر اور ایک دوسرے پر رکھ کر بیٹھنا"(۱۸)

مقامی لوگوں کو ان کے اپنے القاب و آداب اور علاقائی نسبت کے حوالے سے پکارنے کا چلن بھی قاسمی کے ہاں نظر آتا ہے۔لاہور والوں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"لاہوریئے صبح شام یہ بئیر پیتے ہیں، چنانچہ صبح سے شام تک اونگھتے رہتے ہیں۔اس بئیر کو مقامی زبان میں لسی کہا جاتا ہے"(۱۹)

لاہوریئے

"لاہوری (ص)۔لہوری = لہوریا۔لاہور کا رہنے والا۔لاہور کا سے متعلق"(۲۰)

ظاہری نمود و نمائش نے معاشرے کے ہر طبقے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا۔ قاسمی کے ہاں اس امر کی عکاسی کے لیے پنجابی کے الفاظ اور ان کے اردو متبادل دیکھئے۔

"دراصل ان شعرا نے جالندھری اور لکھنوی وغیرہ کے الفاظ یونہی شو،شا کے لیے اپنے ساتھ ٹانکے ہوتے ہیں"(۲۱)

شو،شا

"شوشا: دھج وج۔دُھوم دھام۔(انگ) تماشہ وغیرہ" (۲۲)

چوٹیاں پنجابی اور اردو دونوں میں استعمال ہونے والا عام لفظ ہے۔لیکن پنجابی میں یہ مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ قاسمی نے پنجابی کے معنوں میں اس لفظ کو یوں استعمال کیا ہے۔

"اس میں عموماً خواتین ہی شاپنگ کے لیے آتی ہیں جن میں سے بیشتر نے یہاں کی روایت کے مطابق چوٹیاں کی ہوتی ہیں۔"(۲۳)

چوٹیاں

"چوٹیاں: بچوں کے بڑے بال"(۲۴)

یہاں چوٹیاں انہی بالوں کے گچھے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قاسمی کی تحریروں میں عام بول چال میں بھی پنجابی لفظیات ملتی ہیں۔

"اہل محلہ اپنے محلے میں کسی دوسرے محلے کے عاشق کے داخلے کو پسند نہیں کرتے۔
اس سلسلے میں ان کا یہ کہنا ہے کہ" اسیں مر گئے آں؟"(۲۵)

اسیں مر گئے آں؟

"اسّیں: (ضمیر)۔ ہم = اسّاں۔"(۲۶)

اس جملے میں اسیں کو ہم کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اور یہی اردو میں اس پنجابی لفظ کے معنی ہیں۔ قاسمی کے ہاں تحریر میں پنجابی کی لفظیات کا چلن یوں ہوا ہے گویا وہ کسی سے عام انداز میں باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اسی عام انداز میں انہوں نے بہت سی پنجابی لفظیات استعمال کی ہیں۔

"سیانوں سے سنا ہے کہ اکثر و بیشتر خاصی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔"(۲۷)

سیانوں

"سیانا] سیاناں[ا۔ عقل مند۔ دانش مند۔ دانا۔ بدھواں۔ سمجھدار۔ گیانی ۲۔ جوان۔
۳۔ ہوشیار ۔ چوکس۔ چتر۔ چالاک۔ عقل مند۔ ۴۔ پھرتیلا = کھچرا۔ فریبی۔ چھلیا۔
جگتی ۵۔ کرسی۔ کنجوس ۶۔ بزرگ۔ عمر رسیدہ۔"(۲۸)

پنجابی معاشرے میں پائے جانے والے طبقاتی رویوں کے بارے میں قاسمی نے بڑی خوب صورتی سے پنجابی لفظیات استعمال کی ہیں۔ ان لفظیات کا استعمال اور ان کے اردو متبادلات دیکھیے:

"تم گوری چمڑے والے ہو اگر تم بھی "دیسی" ہوتے تو تمہیں ان کی میزبانی کا صحیح انداز ہوتا۔"(۲۹)

دیسی

"دیسی(ص): ا۔ دیس کا بنا ہوا۔ ۲۔ اپنے دیس سے متعلق۔ ۳۔ ستھانک۔(مذ)۔ ا۔ اپنے دیس کا رہنے والا۔ ۲۔ ایک راگ۔ ۳۔ حصار کے وہ سنار جو باریک کام جانتے ہیں۔(باگڑی کے متضاد)۔"[۳۰]

معاشرے کے لوگ ایک دوسرے کو جس انداز میں طنز کا نشانہ بناتے ہیں قاسمی نے انہی کے الفاظ میں اس طنز کو بڑی خوب صورتی سے اپنی تحریر میں سمویا ہے۔

"پاکستان میں ایک بہت لذیذ پھل پایا جاتا ہے جسے آم کہتے ہیں اسے لالی پاپ کی طرح چوسا جاتا ہے اور چوسنے سے پہلے اسے "پولا" کرتے ہیں۔.....میں نے ایک صاحب کو دیکھا کہ وہ ہر وقت خواتین کے جھمگھٹے میں رہتے ہیں۔ میں نے ایک لاہوریئے سے پوچھا کہ یہ صاحب کیا کرتے ہیں؟اس نے جواب دیا:"کچھ نہیں صرف آم پولا کرتے ہیں"[۳۱]

آم پولا کرنا، آم کو چوسنے کے لیے نرم کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے اس کے علاوہ عام طور پر کسی کی چاپلوسی کرنا اور خوشامد کرنا کے معنوں میں لیا جاتا ہے اور عطاء الحق قاسمی نے بھی یہاں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

اسی طرح مختلف جگہوں کے پنجابی ناموں کے بارے میں قاسمی کا شعور ملاحظہ ہو؛

"دکاندار تیار شدہ کھانوں کو بڑے بڑے دیگچوں میں عین سڑک کے کنارے اپنی دکان کے تھڑے پر سجا دیتا ہے"[۳۲]

تھڑے

" تھڑا:(سندھی: تھلا بمعنی ٹیلا اور چبوترہ۔مذ)= تھڑھا۔چبوترہ۔چونترا= تھلہ "[۳۳]

بزرگ اور عقل مند شخص کے لیے پنجابی میں بہت سے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ عقل مند اور چالاک شخص کے لیے کائیاں کا لفظ بہت مستعمل ہے۔ قاسمی کی تحریروں میں بھی یہ پنجابی لفظ ملتا ہے۔

"جو دوست مجھے اس لیڈر کے پاس لے گیا وہ خود بھی بہت کائیاں تھا اور لیڈروں پر اپنے تعلقات کا رعب جما کر ان سے کام نکلواتا تھا"[۳۴]

کائیاں

"کائیاں:(ص)= جو بڑا سیانا ہوشیار اور تجربہ کار ہو۔ اور کانپ نہ کھائے "[۳۵]

معاشرے کا وہ طبقہ جو تصوف کی طرف مائل ہوتا ہے وہ اور بعض ایسے لوگ جنہوں نے ان صوفیا کا لبادہ اوڑھ رکھا ہوتا ہے ان سب کے لیے عام طور پر " اللہ لوک " کا لفظ پنجابی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کا قاسمی کے ہاں استعمال بڑی خوب صورتی سے ہوا ہے۔

"ان کے چہرے پر جو سکون نظر آتا ہے وہ اپنے ہاں صرف کسی بڑے "سینٹ" ہی کے چہرے پر دکھائی دے سکتا ہے۔ سینٹ کو یہاں "اللہ لوک" کہتے ہیں"(۳۶)

اللہ لوک

"اللہ لوک:(ص) ا۔ اولیاء اللہ۔ ۲۔ جنات ۳۔ فقیر۔ ۴۔ سیدھا سادھا"(۳۷)

جانوروں کی عمر کا حساب ان کے دانتوں سے لگانا پنجابی لوگوں کی خاص مہارت ہے اور اسی بنا پر انہوں نے مختلف جانوروں کے نام رکھے ہوتے ہیں۔ یہ نام ان کی عمر کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس بارے میں قاسمی کے ہاں اس کا بیان بھی پنجابی لفظیات میں ہی ہوا ہے۔

"مجھے ان تین دنوں میں تین لفظ بہت سننے کو ملے، دوندا، چوگا، کھیرا۔"(۳۸)

چوگا

"چوگا:(ص / مذ) ا۔ چوکا۔ چار ۲۔ نوخیز بیل۔ چار دانتوں والے مویشی کا بچہ۔ جانور۔ جو چار دانتوں یا چار سال کا ہو۔ (ص)۔ چار دانتوں والا مویشی۔"(۳۹)

کھیرا

"کھیرا (ص)۔ بھورے رنگ کا یا کتھا کے رنگ کا (مویشی) (مذ) کتھا کے رنگ کا کبوتر، گھوڑا یا بگلا۔"(۴۰)

معاشرے میں پائے جانے والے لوگ جن کا کام محض وقت گزاری ہوتا ہے ان کا کوئی خاص عمل دخل نہیں ہوتا کسی کام میں بلکہ وہ دوسروں کے کاموں میں محض اپنی تفنن طبع کے لیے شامل ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا بیان پنجابی لفظیات میں قاسمی نے بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

"میں نے ایک دوست سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے ہنستے ہوئے کہا: "کوئی خاص وجہ نہیں یہ سب ٹھرکی لوگ ہیں۔ صرف چسکے لینا چاہتے ہیں۔"(۴۱)

ٹھرکی

"ٹھرکی:(مذ/ص)ا۔ جس کو کوئی ٹھرک ہے۔۲۔ حرصی ۔بوالہوس۔ ۳۔ کیمیا گری کا کام کرنے والا۔ ۴۔ جھکھڑ حسن پرست۔"(۴۲)

پنجابی معاشرے کی رسومات کی پنجابی لفظیات میں عکاسی یوں کی گئی ہے:

"بارات کی آمد کے بعد بارہ بجے سے لے کر ایک بجے تک دولہے کے دوستوں نے بھنگڑا ڈالنا ہوتا ہے۔"(۴۳)

بھنگڑا ایک پنجابی رقص جس میں عام طور پر ڈھول کی تاپ پر رقص کیا جاتا ہے۔ دیہی پنجاب میں یہ بہت مقبول ہے۔ ہر خوشی کے موقع پر اس کا عام رواج ہے۔

اسی طرح دوسروں سے الگ انداز رکھنے والے کے لیے انہوں پنجابی اور انگریزی لفظ کو ملا کر وکھری ٹائپ کا لفظ استعمال کیا ہے۔

"وکھری ٹائپ کا محب وطن"(۴۴)

وکھری ٹائپ

"وکھو وکھرا]وکھو وکھی](مف۔ ص)=اڈاڈ=وکھرا وکھرا=جدا جدا"(۴۵)

یہاں بمعنی الگ انداز سے یا نرالے انداز سے۔

انگریز کو آج بھی پنجابی معاشرے میں گورے کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ قاسمی صاحب نے بھی ان کے لیے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔

"میں نے ایک گورے چٹے اور صحت مند شخص کو دیکھا وہ گوالمنڈی کے باہر دھرے بنچوں پر بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔"(۴۶)

گورے چٹے

"گوراچٹا(ص)۔ا۔ سفید۔ گورا۔ خوبصورت۔ سوہنا"(۴۷)

دودھ سے دہی بنانے کے لیے رات کو دودھ میں جو لسی یا کوئی اور چیز ملائی جاتی ہے پنجابی میں جاگ لگانا کہتے ہیں۔ اس لفظ کا استعمال یوں کیا گیا ہے۔

"بٹ صاحب دہی کے بہت شوقین ہیں چنانچہ انہوں نے رات سونے سے پہلے نہر کو" جاگ" لگا دی تھی۔"(۴۸)

"جاگ" لگانا

"جاگ:(مذ)ا۔ جمن۔پنیر جامن۔دہی جمانے کی لاگ۔ چھاچھ وغیرہ جس سے دودھ جمایا جائے(لانا)= سمین ۲۔کسی شے کی خاصیتیا اہمیت بڑھانے والا جوہر = مثلاً جب عشق جاگ جائے تو وہ اپنی پہچان کرلیتا ہے.... جاگ لاؤ نا: دودھ کو گرم کر کے دہی بنانے کے لیے کھٹائی (= جامن) لگانا۔(۴۹)

معذور افراد کے لیے پنجابی لفظیات ان کے گہرے سماجی شعور کی عکاسی کرتی ہیں۔ مختلف اقسام کی معذوری رکھنے والوں کے لیے پنجابی لفظیات کا استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"تمہارے ملنے والوں میں لولے، لنگڑے کانے قسم کے ہی لوگ ہوتے ہیں۔"(۵۰)

لُولے

"لُولا (مذ)۔ا۔ لنگڑا۔ جس کا ایک عضو ٹانگ نہ ہو۔ لنجا۔لنگ۔ لولھا=لُوہلا۔ ٹانگوں سے بیکار۔ ۲۔ لجا ٹنڈا" (۵۱)

لنگڑے

"لنگڑا (ص)(مذ)= لنگا۔ لولھا۔ جس کی ایک ٹانگ نہ ہو یا کام نہ دے۔روگی ٹانگ والا جس کا ایک پاؤں نقص دار، ناکارہ یا ٹوٹا ہوا ہو۔ ۳۔ آم کی ایک قسم"(۵۲)

کانے

"کانا:(ص۔مذ)=ا۔ایک آنکھ والا۔=کان=کاناں۔ ۲۔ جس میں کان یعنی ٹیڑھ ہو، ۳۔ جس شے کو کیڑا یا سنڈی لگی ہو۔ داغی۔ کیڑوں سے کھایا ہوا۔ سڑا ہوا۔ ۴۔ بغیر گٹھ کے۔ ۵۔ عیب دار۔ نقص والا۔ ۶۔ کوں"(۵۳)

بھنگڑا کی طرح لڈی بھی پنجابی رقص کی ایک اہم قسم ہے۔اس کا استعمال انہوں نے ایک اور مزاحیہ بیانیہ کے لیے بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

"بھابھی میں نے تو سنا تھا بھائی جان بیمار ہیں، مگر یہ تو لڈیاں ڈال رہے ہیں"(۵۴)

لڈیاں ڈالنا

"لڈی پاؤ نا۔ لڈی کی کھیل کھیلنا۔ ۲۔ خوشی منانا۔ نچنا ٹپنا۔ ۳۔ اودھم مچانا۔ کھپ پانا۔(۵۵)

جھگڑے اور تنازع کے لیے پنجابی میں ٹنٹا کا لفظ بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ قاسمی نے بھی اس لفظ کو بڑی خوبصورتی سے تنازع کے معنوں میں استعمال کیا ہے:

"اپنی ڈیٹ آف برتھ یکم فروری ۱۹۴۳ء کی بجائے یکم فروری ۱۹۴۷ء کروالیں تاکہ یہ ٹنٹا ہی ختم ہو۔"(۵۶)

ٹنٹا

"ٹنٹا: (مذ) ٹانٹا۔ جھگڑا۔ بکھیڑا۔ لڑائی۔ فتنہ۔ فساد"(۵۷)

نتھی کرنا پنجابی کا ایک اور معروف لفظ ہے جو جوڑنے اور ساتھ لگانے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال وہ یوں کرتے ہیں

"کتاب کے ساتھ مصنف کی ڈیٹ آف برتھ کا مسئلہ نتھی کر دیا جائے تو کوئی شخص تاریخ نویسی کر کے تاریخ دان نہیں کہلا سکتا۔"(۵۸)

"نتھی" کرنا

"نتھی (ص)۔ ساتھ جوڑے ہوئے = نال ٹانکے ہوئے"(۵۹)

بھاری جثہ، کمزور جثہ ایسے پنجابی الفاظ ہیں جو ہماری روزمرہ گفتگو کا حصہ ہیں۔ قاسمی نے پنجابی معاشرت کی عکاسی بھی انہی الفاظ سے کی ہے۔

"اس جثے کے مسلح شخص کی موجودگی میں کم از کم ڈاکوؤں کا کوئی خوف میرے دل میں نہیں تھا۔"(۶۰)

جثے

"جثہ: (مذ) جسم۔ سریر۔ دیہ تن۔ بدن۔ وجُود"(۶۱)

اسی طرح ایک خاص پنجابی لفظ "چوکھا" بھی ان کی تحریروں میں کئی جگہوں پر ملتا ہے۔ یہی لفظ محاورے اور ضرب الامثال بھی استعمال ہوا۔ اس کا استعمال اور اردو متبادلات ملاحظہ ہوں:

"ان کی رسائی ڈاک کے ایک لفافے یا رجسٹریشن فیس کی ادائیگی سے ممکن ہو جاتی ہے اور ہینگ پھٹکڑی لگے بغیر بھی رنگ چوکھا آتا ہے۔"(۶۲)

چوکھا

"چوکھا: (س: چوک ش۔ ص) ۱۔ کھرا۔ اچھا۔ صاف ستھرا۔ نرمل۔ اصلی خالص۔ ۲۔ خاصا۔ کافی زیادہ کثرت کثیر کتنا۔ زائد۔ بہت۔ اصل مقدار سے زیادہ ۳۔ چنُدواں"(۶۳)

دوٹکیاں کی نوکری کے بارے میں انہوں نے بڑی خوبصورتی سے اس لفظ عکاسی کی ہے۔

"خوش حال زندگی گزارنے کے اتنے سنہرے مواقع دوٹکیاں کی نوکری میں کہاں دستیاب ہوتے ہیں۔"(۶۴)

دو ٹکیاں

"ٹکا: (م: مذ) ا= ٹکا= ادھیانی= ٹغا۔ دو پیسے کا سکہ۔ ۲۔ دو پیسے۔ ۳۔ معمولی رقم۔ ۴۔
دھن دولت۔ ۵۔ سوا سیر کے برابر ایک وزن جو گڑھوال میں رائج ہے۔ (ک:)،۶۔
بنگلہ دیش کا روپیہ۔ ۷۔ منگنی بیاہ پر رسم"(۶۵)

پہلے ہم قاسمی کی تحریروں میں پنجابی میں مختلف جانوروں کی عمروں کے بارے میں بیان کر چکے ہیں۔ جانوروں کی اقسام میں سے ایک اور قسم پنجابی لفظیات کے ساتھ ملاحظہ ہو:

"مختلف کونوں سے کھیر اہے۔ آنڈ واہے، دانت ٹوٹا ہے وغیرہ کی آوازیں آ رہی تھیں۔"(۶۶)

آنڈوا

"آنڈو: (ص)۔ جو خصی نہ کیا گیا ہو۔ سالم"(۶۷)

مزاحیہ تحریروں کے لیے اردو میں کئی عنوان استعمال کیے جاتے ہیں لیکن پنجابی میں مزاح اور مذاق کو مخول بھی کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے اس لفظ کا استعمال انہوں نے یوں کیا ہے:

"انگریزی اخباروں کے چند اداریہ نگار ہیں جن کی تحریریں بظاہر سنجیدگی کے زمرے میں آتی ہیں لیکن درحقیقت وہ "مخولیا" تحریریں ہیں۔"(۶۸)

مخولیا

"مخول (مذ)۔ مسخری۔ چہل۔ مذاق۔ ٹھٹھا۔ ظرافت ۲۔ نکتہ چینی۔ غلطیاں نکالنا۔
ہنسی مذاق والی بات"۔(۶۹)

کھنگورا مارنا نہ صرف پنجابی کا عام استعمال ہونے والا لفظ ہے بلکہ یہ عمل بھی سماج میں عام پایا جاتا ہے۔ قاسمی نے یہ پنجابی لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے جن کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔

"وہ سامنے سے اپنے دشمن کو آتا دیکھ لے تو پہلے کھنگورا مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔"(۷۰)

کھنگورامارنا

"کھنگھارنا(لازم) ا۔ کھانسی کرنا۔ کھنکارنا۔گلا صاف کرنا بلغم نکالنا۔
کھنگھورنا= کھنگھنا ۲۔ دوسرے کو محتاط کرنے کے لیے گلے میں خرخراہٹ جیسی
آوازپیدا کرنا۔"(۷۱)

مشکل کام کو سر کرنے کے لیے اور مختلف تکلیفیں اٹھانے کے لیے پاپڑ بیلنا یا پاپڑ ویلنا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ بہت زیادہ جتن کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور انہی معنوں میں قاسمی کے ہاں بھی استعمال ہوا ہے۔

"عادل مشہور ہونا کوئی آسان کام نہیں۔اس کے لیے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔"(۷۲)

پاپڑ بیلنا

"پاپڑ بیلنا(ویلنا): ا۔ دکھ جھاگنا۔ مصیبت جھیلنا۔ ۲۔ مکر کرنا۔ ۳۔ بہت زیادہ جتن کرنا یا محنت کرنا(تا کہ کوئی کام تکمیل کو پہنچ جائے)۔ ۴۔ دولت حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی چالیں چلنا۔"(۷۳)

پانی یا کسی بھی اور مشروب کو بغیر وقفے کے ایک ہی سانس میں پی جانے کے عمل کو ڈیک لگا کر پینا کہتے ہیں۔اس معنی میں اس لفظ کا استعمال قاسمی صاحب کے ہاں یوں ہوا ہے۔

"استاد نے بھرے ہوئے سگریٹ کا سوٹا لگایا اور گلاس "ڈیک" لگا کر خالی کر دیا۔"(۷۴)

ڈیک

"ڈِیک:(مث)= جھینک۔ ایک ہی سانس سے نگلنا۔ا۔ ایک ہی سانس میں کچھ پی
جانے کا فعل۔ چاپی۔(لانا) ۲۔ اڈیک۔(پو:)۔ ۳۔ چیک۔ چیخ "(۷۵)

صبح سیر کے دوران مختلف بزرگوں کی ایک دوسرے سے کی جانے والی مختلف حرکتوں کو بھی انہوں نے ان پنجابی الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"بزرگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی اور دوسروں کی عمر کا خیال کیے بغیر ایک دوسرے کو
"لانگڑیاں " بھی دیتے ہیں۔"(۷۶)

لانگڑیاں دینا

"لانگڑیاں مارنا= دولتیاں مارنا۔ ٹھڈے کی طرح ٹانگ اٹھا کر مارنا۔ یونہی ٹانگیں چلاتے رہنا۔"(۷۷)

پنجابی محاورے بھی پنجابی لفظیات میں انہوں نے بڑی خوبصورتی سے استعمال کیے ہیں۔ ایک محاورے کا پنجابی لفظیات میں استعمال ملاحظہ ہو:

"اوہو یہ تو سونے پہ سہاگہ ہوا، میرا مطلب ہے ایک کریلا اور دوجا نیم چڑھا" (۷۸)

ایک کریلا دوجا نیم چڑھا

"اک کریلا، دُوجا] دوجے [نِمّ تے چڑھیا۔ کسی کام کی زیادتی ہونا یا کسی مصیبت میں اضافہ ہونا" (۷۹)

اندازے سے کوئی بات کرنے کے لیے یا کسی سوال کا اندازے سے جواب دینے کے لیے پنجابی میں تکا لگانا کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قاسمی کے ہاں اس کا استعمال یوں ہوا ہے۔

"یار تم عجیب آدمی ہو تم تو مجھے میرے وہموں سے نکالنا چاہتے تھے کہ نجومی ایسے ہی تکے لگاتے ہیں۔" (۸۰)

تکے لگانا

"تکا مارنا: اٹکل پچُّو، اندازہ کرنا" (۸۱)

کسی کو زدوکوب کرنے کے لیے استعمال ہونے والا پنجابی لفظ "چھینٹی لگانا" یوں استعمال کرتے ہیں۔

"عامل کو بلایا جاتا ہے جو مار مار کر لڑکی کا بھرکس نکال دیتا ہے اور کہتا جاتا ہے کہ یہ "چھینٹی" دراصل جن کو لگائی جا رہی ہے۔" (۸۲)

چھینٹی لگانا

"چھینٹی لگانا = چھینٹنا: (متعدی) ا۔ پھنڈنا ۲۔ مارنا۔ مار پیٹ، زدوکوب۔ ۲۔ کسی چیز کو ایک دوسرے میں ملانا۔ مثلاً انڈے کے اجزاء کو خوب ملانے کے لیے چھینٹنا۔ یکجان کرنا۔ ملانا۔ حل کرنا۔ ۳۔ تاش کے پتوں کو اوپر نیچے کرنا۔" (۸۳)

ٹکے کی عزت نہ ہونا کا استعمال ملاحظہ ہو:

"جناب کی جو "بیزتی" ہوئی ہے اور صاحب کے رویئے سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ شہر میں آپ کی ٹکے کی عزت نہیں۔" (۸۴)

ٹکے کی عزت یا ٹکے کی عزت نہ ہونا = ذرا بھی عزت نہ ہونا۔ دو پیسے کے برابر اہمیت نہ ہونا۔ بیزتی = بے عزتی۔ عزت نہ رہنا۔ رسوا ہونا۔ انہی معنوں میں قاسمی کی نثر میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔

مرد کے لیے پنجابی میں "جنا" کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لفظ کا استعمال اور مختلف معنی دیکھیے۔

"یہ جو جنا آپ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے اس نے مخالفوں کے تین چار بندے لا دیئے ہیں۔" (۸۵)

جنا

"جنا: (مذ) ۱=جنا۔ پُرش۔ شخص=جن ۲۔ ات پتی۔ پیدائش "(۸۶)

والدین کی اولاد کے لیے محبت اور اپنی بے بضاعتی کی عکاسی قاسمی کی نثر میں یوں ملتی ہے۔

"ہم صبح سے رات تک انہی کے لیے تو محنت کرتے ہیں ورنہ ہم، بڈھے بڈھی نے تو دو وقت کی روٹی ہی کھانی ہے"(۸۷)

بڈھا

"بڈھا: (ص) ۱۔ پرانا۔ ۲۔ بزرگ۔ ۳۔ بہت بڑی عمر کا۔ بردھ۔ بوڑھا (ص / مذ)۔ ۱۔ بوڑھا آدمی۔ ۲۔ دریا وغیرہ کے بہنے کی پرانی گزرگاہ یا جگہ۔ ۳۔ کم گہرے پانی والی جگہ=بُڈھ"(۸۸)

بڈھی

"بڈھی: (مث)۔ ۱۔ بڑی عمر کی عورت۔ بزرگ عورت۔ ۲۔ کوئی زنانی۔ ۳۔ چناب دریا کی غیر آباد راہ۔ (شد:) ۴۔ بڈھی مائی=مائی بڈھی"۔ (۸۹)

ہڈ پیر سلامت ہونا ایک عام پنجابی لفظ ہے اس کا استعمال وہ ان معنوں میں کرتے ہیں

"جب تک والدین کے ہڈ پیر سلامت ہوتے ہیں وہ اپنی روزی خود کماتے ہیں"(۹۰)

ہڈ پیر سلامت ہونا سے مراد اعضائے بدن کا درست انداز میں کام کرتے رہنا ہے۔ یعنی مغرب میں جب تک والدین کی صحت قائم رہتی ہے وہ اپنی روزی خود کمانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں لیکن جب صحت جواب دے جائے تو اولاد ان کو سنبھالنے کی بجائے سوشل سیکیورٹی والوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور پنجابی لفظ ٹھکوانا کا استعمال انکے ہاں یوں ملتا ہے۔

"رکشہ ڈرائیور سڑک کے کنارے بیٹھے موچی سے اپنے جوتے میں کیل ٹھکوا کر اسے ایک روپے کا میلا کچیلا نوٹ دے رہا تھا۔"(۹۱)

ٹھکوا کر

"ٹھک: (امر) ٹھکنا سے۔ کسی چیز کو ٹھونکنا۔ ٹھکوانا"(۹۲)

پرانی گاڑی کے لیے استعمال ہونے والے پنجابی لفظ ملاحظ ہوں:

"رکشے کے پیچھے ایک ۷۶ ماڈل کی کھٹارا کرولا آ کھڑی ہوئی تھی۔"(۹۳)

کھٹارا ایسی گاڑی کو کہا جاتا ہے جو کافی پرانی ہو چکی ہو ظاہری حالت سے ہی ٹوٹی پھوٹی نظر آ رہی ہو۔ عطاء الحق قاسمی نے بھی گاڑی کی اس حالت کو دیکھتے ہوئے اسے کھٹارا کہا ہے۔

سڑک میں پڑے ہوئے گڑھوں کو انگریزی میں جمپ کہا جاتا ہے پنجابی میں گڑھے کے لیے ٹویا کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب نے بھیپی لفظ استعمال کیا ہے۔

"دو قدم چلنے کے بعد اس نے پوری بے دردی سے رکشہ ایک ٹوئے پر سے گزارا جس سے میرا انجر پنجر ہل کر رہ گیا۔"(۹۴)

ٹوئے

"ٹوئے (مذ۔ جمع)، ٹویا: (مذ) =ٹووا=ٹوآ=ٹوئیا۔ گڑھا۔ ۲۔ کھڈ۔ کھائی ۳۔ گہری جگہ۔ کھاتہ۔ نشیب ۴۔ چھید۔ درز ۵۔ چھنبھ۔ ۶۔ دھوکا ۷۔ چبّ۔ ڈونگھ"(۹۵)

بات کا بتنگڑ بنانا ایک عام محاورہ ہے جس میں پنجابی لفظ بتنگڑ استعمال کیا جاتا ہے۔ قاسمی کے ہاں اس کا استعمال اس انداز میں ہوا ہے۔

"آپ ہر جلسے میں اپنی درد کمر کا ذکر نہ کیا کریں کہ حاضرین میں کچھ بدگمان قسم کے لوگ بھی ہوتے ہیں، وہ بات کا بتنگڑ بنا سکتے ہیں۔"(۹۶)

بتنگڑ

"بات دا بتنگڑ بنا: چھوٹی سی بات کا گلاں] پہاڑ [بنانا"(۹۷)

فضول بات کرنے کے عمل کو پنجابی میں بونگیاں مارنا کہا جاتا ہے۔ قاسمی کے ہاں بھیہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"جواباً ہاتھ ملانے والا بھی اس کی طرف دیکھتا ہے اور دل میں کہتا ہے کہ بونگی مار کر اب میری طرف کیا دیکھ رہے ہو"(۹۸)

بونگی مارنا

"بونگیاں مارنا= جھلیاں جھلیاں کرنا۔ بے وقوفی کی باتیں کرنا۔"(۹۹)

کسی چیز کے رک جانے یا دوسروں کو روک دینے کے بارے میں پنجابی میں ڈک دینا یا ڈکا لگا دینا استعمال ہوتے ہیں۔ قاسمی کی نثر میں بھیہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

"زندگی میں آج تک سینکڑوں مضمون لکھے ہیں مگر پروین شاکر کے بارے میں لکھتے ہوئے ذہن کو کچھ " ڈکا"
سالگ گیا ہے۔"(۱۰۰)

ڈکا لگانا

"ڈکا لانا: روک لگانا۔ رکاوٹ ڈالنا" (۱۰۱)

تعظیم اور عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے اردو اور پنجابی میں بہت سے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ قاسمی نے ایک منفرد لفظ ان معنوں میں استعمال کیا ہے۔

"تاہم اس وقت بزرگوں کی "ہتھ جوڑی" کرانے کے لیے یہ سطور نہیں لکھ رہا، بلکہ اس وقت تو میرے ہدف پیرومرشد ضمیر جعفری ہیں۔"(۱۰۲)

ہتھ جوڑی

"ہتھ جوڑنا (متعدی)۔ عزت یا منت کے لیے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں سیدھی رکھ کر جوڑنا یا ملانا۔ ۲۔ منت کرنا۔ معافی مانگنا۔ ۳۔ انکساری سے ہاتھ باندھنا۔ ۴۔ رشتہ کی سانجھ ہو جانا، رشتہ جوڑنا"(۱۰۳)

جمائی لینا اور اکتا جانا کے لیے استعمال ہونے والی پنجابی لفظیات کا چلن قاسمی کے ہاں یوں ملتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"کچھ جو بے حد شگفتہ نگار ہوتے ہیں ان سے گفتگو کریں تو پندرہ بیس منٹوں میں اباسیاں آنے لگتی ہیں۔"(۱۰۴)

اباسیاں

"اباسیاں (جمع)، اُباسی (س)۔ اُش واش۔ (مث)۔ جمائی۔ جو کہ تھکاوٹ اور بے اچیچی ظاہر کرتی ہے۔ پاسک۔ جماہی۔ واڑہ۔"(۱۰۵)

بحث سے پنجابی لفظ بحثیا یوں بنایا گیا ہے۔

"سوال کرنے والوں میں کولمبیا کے وکٹر کا بھی کوئی جواب نہیں تھا، یہ حلقہ ارباب ذوق کا کوئی پیشہ ور "بحثیا" لگتا تھا۔"(۱۰۶)

بحثیا

"بحث: ا۔ کسی بات پر ایک سے زیادہ لوگوں کی خیال آرائی۔ ۲۔ جھگڑا۔ تکرار۔ ۳،

وکیل وغیرہ کا مقدمہ کو دلائل سے کھنڈن منڈن کرنے کی حالت۔ بحثیا (مذ)۔ بحث کرنے والا۔ "(۱۰۷)

پاپی پیٹ ایک عام پنجابی ترکیب ہے، قاسمی کے ہاں بھی اس کا بڑی خوب صورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ یوں لکھتے ہیں۔

"اس کے بعد پیٹ شروع ہوتا ہے اور ختم ہونے میں نہیں آتا، یہ وہ پیٹ ہے جسے "پاپی پیٹ" کہا جا سکتا ہے۔"(۱۰۸)

پاپی پیٹ

"پاپی: (مف / ص)۔ ا۔ پاپ کرنے والا گنہگار۔ ۲۔ اپرادھی۔ ظالم۔ ا۔ ۲۴۵ پاپی پیٹ بمعنی وہ پیٹ جو حرام پہ پلتا ہو۔"(۱۰۹)

چونڈا کا لفظ انہی معنوں میں پنجابی میں استعمال کیا جاتا ہے جن میں چوٹیاں بھی ہوتا ہے۔ قاسمی صاحب کے ہاں ایک جگہ اس لفظ کا یوں استعمال کیا گیا ہے۔

"پہلوان جی چہرے مہرے سے " پھوپھی خدا بخش " قسم کی چیز لگتے ہیں۔ سر کے بالوں کا انہوں نے "چونڈا" بنایا ہوا ہے "۔ (۱۱۰)

چونڈا

"چونڈا: (مذ) ا۔ = چُونڈا۔ جُوڑا۔ زنانی کے سر کے بال جو اکٹھے کر کے سر پر باندھے ہوں"۔ (۱۱۱)

پرنے کا لفظ پنجابی میں کلمہ اور مہمل دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مہمل صورت میں اس کا استعمال مرنے پرنے وغیرہ جیسے الفاظ میں ہوتا ہے جب کہ عام طور پر پرنا سر پہ رکھنے والے کپڑے کو کہتے ہیں۔ قاسمی نے بھی اسی معنی میں اس کا استعمال کیا ہے۔

"میں نے گاڑی کا ایکسیلیٹر پورے زور سے دبایا لیکن سر اور کانوں کو "پرنے" سے اچھی طرح لپیٹ کر رکھنے والے کو چوان کے لیے یہ نحیف سا الارم کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔"(۱۱۲)

پرنے

"پرنا، پرنی: دھجی، صافی۔ رُومال" (۱۱۳)

ایک اور پنجابی لفظ شوشا ان کے ہاں یوں استعمال ہوا ہے۔

"ان میں سے کم از کم کھانے والے معاملے کی تردید ہو جاتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے ڈائننگ وغیرہ کا محض "شوشا" کھڑا کیا ہے۔"(۱۱۴)

شوشا کے معنی جھگڑے کے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر اس کو الگ الگ پڑھا جائے تو نمود و نمائش کے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ نمود و نمائش کے معنوں میں ہی استعمال ہوا ہے۔

ٹھرکی کے معنوں اور استعمال پر ہم پہلے بات کر آئے ہیں۔ ٹھرک کا استعمال بھی قاسمی کی تحریروں میں ملتا ہے۔

"اس نے کبھی مجھ سے اشارتاً بھی تذکرہ نہیں کیا اسے لکھنے لکھانے کا ٹھرک ہے۔ نہ ہی میں نے پوچھا کیونکہ انسان اگر ادیب ہے تو اسے اپنے چہرے سے بھی ادیب لگنا چاہیے"۔(۱۱۵)

ٹھرک

"ٹھرک: (مذ) ۱۔ عادت۔ لت۔ شوق۔ عشق ۲۔ لپکا۔ حرص ۳۔ علت۔ وادی ۴۔ جھس ۵۔ جھوٹی چاہ ۶۔ سرڑ، جنون ۷۔ ایسا میلان جو مرض کی طرح چپک جائے (خصوصاً نفسانی) ۸۔ خالی باتوں سے لطف اندوز ہونا ۹۔ شہوت کا حظ"(۱۱۶)

ادی بچدی جیسے الفاظ دیہاتی معاشرے میں عام بولے جاتے ہیں۔ قاسمی کی اردو نثر میں بھی ایسے پنجابی الفاظ جن معنوں میں استعمال ہوئے وہ کچھ یوں ہیں۔

"ادھے پہلوان سے ایسی ادی بچدی کہانیاں سن سن کر ہم بھی آہستہ آہستہ اس کے رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔"(۱۱۷)

اڈی بچڈی کہانیاں

"ادی بچدی = ادھا بچدھا: (ص)۔ تقریباً آدھا۔ ادھورا = ادھ بچدھ۔ معمولی، کچھ۔ تھوڑا بہت"(۱۱۸)

ٹکر لینا، مقابلے پہ اتر آنا جیسے کاموں کے لیے متھا لگانا کا لفظ بڑے بہترین انداز میں قاسمی کے ہاں استعمال ہوا۔ اس کا استعمال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اگر تم نے مجھ سے متھا لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ میں گوالمنڈی میں رہتا ہوں،
میرے ساتھ بھائی ہیں اور ان میں سے ایک کشمیری ہے۔"(۱۱۹)

متھا لگانا

"منہ متھا لانا۔ ٹکر لینا۔ مقابلہ میں آنا۔"(۱۲۰)

معذوری کی ایک صورت کا بیانیوں کیا گیا ہے۔

"خدا جانے ملک و قوم کی ترقی کے لیے ہم دونوں ہاتھ استعمال کیوں نہیں کرتے،
ہمیں ٹنڈا کہلانے کا اتنا شوق کیوں ہے"(۱۲۱)

ٹُنڈا

"ٹنڈا: (ص) ا۔ بغیر شاخوں کے درخت۔ ۲۔ بغیر ہاتھ کے۔ کٹے ہاتھ۔ ہاتھ کٹا۔ لنجا۔ ٹوٹے ہوئے بازو والا۔ جس کا ہاتھ مارا جائے = ٹنڈ۔ ۳۔ بغیر سر کے دھڑ ۴۔ ٹنڈ الاٹ۔ ۵۔ مڑا ہوا۔ زار و نزار، خستہ، بد حال۔"(۱۲۲)

بعض اوقات وہ انگریزی زبان کے الفاظ میں کچھ تصرف کر کے اسے پنجابی میں بھی ڈھال لیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک استعمال ملاحظ ہو:

"غلام مصطفےٰ کھر پر را کی ایجنٹی کا الزام تھا"(۱۲۳)

ایجنٹی

"ایجنٹ: (انگ۔ مذ) = اجنٹ۔ پرتنیدھ۔ نمائندہ۔ ایجنٹی کرنا۔ نمائندگی کرنا۔ کسی کے لیے کام کرنا"(۱۲۴)

ان الفاظ کے علاوہ اور بھی بہت سے پنجابی الفاظ ان کی تحریروں میں استعمال ہوئے ہیں جو متنی حوالوں اور اردو متبادلات کے ساتھ ذیل میں دیے جاتے ہیں

"یہ سب لفظی ڈھکوسلے ہیں اور غریب غرباء کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ فرسودہ اور بے معنی فلسفے بھی میرے جیسے لوگوں نے گھڑے ہیں"(۱۲۵)

ڈھکوسلے

"ڈھکوسلہ =

ڈھکونسلہ: (مذ) ا۔ ڈھکونج۔ ۲۔ پکھنڈ۔ سٹنٹ۔ ۳۔ گپ"(۱۲۶)

"وہ رات کو منعقد ہونے والے انتخابی جلسوں میں اپنے مخالف امیدوار کو "تڑیاں" بھی لگاتے ہیں۔"(۱۲۷)

تڑیاں لگانا

"تڑھی]تڑی[:(مث)ا۔دھونس۔پھوکارعب (جمع تڑیا)۔۲جھپٹ ۳۔ورغلانہ۔سبز باغ دکھا کر دھوکا دینا= دھنیسنی ۴۔جھڑک۔جھاڑ،گھرکی= جھاڑنا"(۱۲۸)

"سیاست میں بھی جتنا گند ہے اس کی وجہ یہ نظریاتی گروپ ہی ہیں۔" لوٹے" بھی نظریاتی ہیں اور ان کو" لوٹا" کہنے والے "لوٹے" بھی نظریاتی گروپوں کے کارکن ہیں۔"(۱۲۹)

لوٹا عام طور پر گھر میں استعمال ہونے والا ایک برتن نما ہوتا ہے۔لیکنیہاں لوٹا ایسے سیاسی لیڈر اور کارکن کو کہا جارہا ہے جو اپنے مفاد کی خاطر پارٹیاں بدلتا رہتا ہے۔

"ان دنوں بیچاری چونی اٹھنیوں کی بڑی مٹی پلید ہو رہی ہے۔"(۱۳۰)

چونیاں اٹھنیاں

"چُونیّ:(مث)= چوانی= پولی۔چار آنے کا سکہ"(۱۳۱)

اٹھنی:(مث)= اٹھانی۔آٹھ آنے کا سکہ"(۱۳۲)

"عام حالات میں یہ فقیر دو قدم بھی چلے تو پاؤں بھاری ہو جاتا ہے اور اڑیل ٹٹو کی طرح آگے بڑھنے سے انکار کر دیتا ہے۔"(۱۳۳)

اڑیل

"اڑیل:(ص)۔اڑی کرنے والا۔۲۔نہ چلنے والا گھوڑا ۳۔ہٹھی۔ضدی" (۱۳۴)

"یہ دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ خدا جانے نئی بیوی اسے کب" پیکے"بھیج دے"(۱۳۵)

پیکے

پیکے:(مذ)والدین کا ٹبر یا گھر= باپ کا گھر،میکے (۱۳۶)

"کارکن اس سارے معاملے میں میری رائے پوچھتا ہے اور میں "پتر وہور چوپو" کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہوں"(۱۳۷)

ہور چوپو

"ہور(ضمیر)۔کوئی دوسرا= دیگر ۲۔اس سے بڑھ کر (۱۳۸)

کسی کام میں نقصان یا بے عزتی کی صورت میں کہا جاتا ہے کہ جب یہ کام آپ کے مطلب کا ہی نہیں تھا تو فضول میں اس میں پڑے۔"

"اوئے فریڈرک تیرا ککھ نہ رہوے"۔(۱۳۹)

کھ نہ رہوے

"کھ نہ رہے (تیرا): (مذ)=ایک گالی۔ ایک بد ارسیس۔ مطلب کچھ بھی باقی نہ رہے"(۱۴۰)

"ایک میں اور ایک وہ تھے جو ایمسٹرڈیم میں فی الحال "چھڑے" تھے "(۱۴۱)

چھڑے

"چھڑا: (ص / مذ) ا۔ ان ویاہیا۔ ناکتخدا۔ کنوارا ۲۔ جس کا کوئی ساتھی کوئی ٹبر نہیں۔ ۳۔ اکیلا۔ تن ۴۔ رنڈاوا۔ ۵۔ خالی خولی۔ نِرا۔ نرول۔ صرف اکیلا۔ سادہ (۱۴۲)

"اس اثنا میں میرے ہم وطن نے معانقے کے دو "پھیرے" مکمل کر لیے تھے "(۱۴۳)

پھیرے

"پھیرا دینا: ا۔ گھمانا۔ چو گرد چلانا= آلے دوالے چلانا۔ ۲۔ گھوڑے کو دم کڈھانے کے لیے پھیرنا" (۱۴۴)

"میری طرف دیکھا بھی مگر میں یملا بن گیا"(۱۴۵)

یملا

"یملا / یمبھلا (ص)۔ ا۔ ان بولا۔ وہ جو بات سمجھے مگر جواب نہ دے۔ ۲۔ گھُنّا۔ بات کو سمجھ کر انجان بننے والا۔ اندرونی طور پر چست اور چالاک مگر باہر سے سیدھا سادھا۔ خچر ۳۔ املا۔ چملا۔ جو مستی میں کملا بنا رہے۔ حالت مستی میں نادان ہونا۔"(۱۴۶)

"جو ملبوسات نظر آ رہے تھے وہ سب پہلے ہی سے میرے ہنڈائے ہوئے تھے"(۱۴۷)

ہنڈائے ہوئے

"ہنڈھنا (لازم)= ہنڈنا۔ ا۔ کثرت استعمال سے گھسنا۔ مثلاً کپڑے وغیرہ۔

۲۔ پائیدار۔ دیرپا۔ برقرار۔ شکار ڈھونڈنا۔ سوّر کا شکار کرنا۔ چھپے ہوئے سوّر کو باہر نکالنا۔ ۳۔ برتنا۔ ہنڈ جانا۔"(۱۴۸)

"میں نے اسے یوں بناٹھنا پایا تو کہا بھولے آج تو بڑی "ٹوریں" نکالی ہیں"(۱۴۹)

ٹوریں

"ٹور: (مث) خرام۔ چال۔ قدم۔ رفتار۔ نقل و حرکت= تور۔ ۲۔ لیکھن۔ کلک

۳۔ بلّی ۴۔ عادت۔ اطوار۔ رویہ"(۱۵۰)

"بھا، جی وہ سب تو میری بہن بیٹیوں جیسی ہیں۔"(۱۵۱)

بھا

"بھا: (مذ) = بہا۔ بھائی۔ (پیار کا لفظ)۔ بھرا کا مخفف"(۱۵۲)

"اس پر وہ اتنے زور سے گردن ہلانے کا عادی تھا کہ بسا اوقات منکا ٹوٹنے کا خطرہ پیدا ہو جاتا تھا"(۱۵۳)

منکا ٹوٹنا

منکا ٹٹنا: مر جانا(۱۵۴)

یہ وہ پنجابی لفظیات اور ان کے اردو متبادلات ہیں جو عطاء الحق قاسمی کی نثر میں استعمال ہوئے ہیں۔ جن کے ذریعے انہوں نے پنجابی سماج، سیاست، کلچر اور ثقافت کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

انگریزی لفظیات کے متبادل اردو لفظیات کا تقابل

عطاء الحق قاسمی کی نثر میں انگریزی معاشرت اور ثقافت کے ساتھ ساتھ انگریزی فنون لطیفہ کے بارے میں ہم گزشتہ ابواب میں بحث کر چکے ہیں۔ انہوں نے انگریزی لفظیات کا استعمال بڑی خوب صورتی سے اپنی نثر میں کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انہوں نے بعض انگریزی لفظیات کے لیے انگریزی ہی کے ہجے استعمال کیے ہیں اور بعض لفظیات کو اردو کے ہجوں میں تحریر کیا ہے۔ اس لیے ان کی انگریزی لفظیات بھی اسی انداز میں یہاں درج کی جائیں گی۔ ان کی نثر میں استعمال ہونے والی انگریزی لفظیات اور ان کے اردو متبادلات کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

انگریزی لفظیات اردو متبادلات

ڈسپوز آف(۱۵۵)

"ا۔ (الف) نمٹنا، عہدہ برآ ہونا، (ب) چھٹکارا پانا، دفع کرنا، م (ج) ختم کرنا۔ انجام دینا، (د) مار ڈالنا۔ ۲۔ فروخت کرنا، ۳۔ رد کرنا ۴۔ استعمال میں لانا (صرف کرنا)۔(۱۵۶)

سٹریٹس(۱۵۷)

ا۔ بستی میں واقع سڑک۔ ۲۔ بازار جس کے گرد دکانیں اور مکانات ہوں۔(۱۵۸)

TABOO ((۱۵۹)

ا۔ کسی شخص یا شے کو حرام یا حلال، نجس یا پاک قرار دینے کا دستور یا عمل

۲۔ بندش، ممانعت، تحدید، کسی شے کو شجر ممنوعہ قرار دینے کا عمل(۱۶۰)

فلیٹ میٹ (۱۶۱) ایک ہی فلیٹ میں رہنے والے

انسپائر[۱۶۱]

ا۔ اکسانا ابھارنا (کسی شخص کو) خصوصاً تخلیقی عمل پر۔ ۲۔ کسی کی روح کو جگانا، ۳۔ سمجھانا، راہ دینا[۱۶۲]

ایڈونچر[۱۶۳]

ا۔ غیر معمولی یا ہیجان خیز تجربہ، ۲۔ جراتمندانہ اقدام، جوکھوں کا کام ۳۔ مہم جوئی، ۴۔ سٹہ بازی[۱۶۴]

COUPLES[۱۶۵]

ا۔ دو عدد، ۲۔ جوڑا، ۳۔ شادی شدہ یا منسوب شدہ جوڑا، ۴۔ رقص یا کھیل میں دو ساتھیوں کی جوڑی[۱۶۶]

THRILLING[۱۶۷]

"سنسی، جذبے کی لہر، عصبی ارتعاش، ۲۔ اعصاب کا جھنجھوڑتے ہوئے[۱۶۸]

DATE[۱۶۹]

"ا۔ مہینے کا دن جسے عدد سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ ۲۔ ملاقات وغیرہ کے لیے پیشگی وقت کا تعین ۳۔ کسی سے ملاقات کا وقت طے کرنا۔[۱۷۰]

بائی روڈ[۱۷۱]

"ا۔ ذیلی سڑک سے، ۲۔ سڑک کے ذریعے[۱۷۲]

ویٹ اے منٹ[۱۷۳]

"ا۔ ایک منٹ ٹھہرو"[۱۷۴]

رسک[۱۷۵]

"ا۔ خطرہ، ۲۔ خدشہ، ۳۔ نقصان"[۱۷۶]

گلٹی[۱۷۷]

"ا۔ مجرم، قصوروار، خطاکار۔ ۲۔ احساس جرم کا حامل، احساس جرم پر مبنی، ۳۔ جرم سے متعلق"[۱۷۸]

پاپولر[۱۷۹]

"مقبول، پسندیدہ، سب کا یا کسی مخصوص طبقے کا منظور نظر[۱۸۰]

گڈ مارننگ[۱۸۱]

"ا۔ صبح بخیر، ۲۔ صبح کا سلام"[۱۸۲]

سٹوپڈ[۱۸۳]

"۱۔احمق، کم عقل، سست دماغ" [۱۸۴]

WISH کرنا[۱۸۵]

"چاہنا، آرزو، تمنا، خواہش رکھنا۔"[۱۸۶]

بیل BELL[۱۸۷]

"۱۔قیفیا پیالہ نما گھڑیال، جرس۔ ۲۔گھنٹے کی آواز"[۱۸۸]

ڈائننگ روم[۱۸۹]

"کھانے کا کمرہ۔ ریلوے کا ڈبہ جسے طعام خانہ بنادیا گیا ہو" [۱۹۰]

CHOICE[۱۹۱]

"انتخاب، انتخاب کیا ہوا شخص" [۱۹۲]

SILLY[۱۹۳]

"سادہ لوح، ناسمجھ، بے شعور، کمزور ذہن کا"[۱۹۴]

ونڈو شاپنگ[۱۹۵]

"۱۔درشنی خریداری کرنا۔ ۲۔کوئی چیز خریدے بغیر دوکان کی کھڑکیوں میں سجامال دیکھ کر دل خوش کرنا"[۱۹۶]

انڈر[۱۹۷]

"نیچے، تلے، زیر، کم تر، معمولی" [۱۹۸]

اولڈ پیپلز ہوم[۱۹۹]

"بوڑھے لوگوں کی دیکھ بھال کا ادارہ"[۲۰۰]

ناک KNOCK[۲۰۱]

"کسی سطح پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنا، دروازے پر دستک دینا" [۲۰۲]

سیکسی[۲۰۳]

"۱۔جنسی کشش رکھنے والا۔ ۲۔ جنسی خواہش کے زیر اثر۔ ۳۔جنسیات جنسیات سے متعلق" [۲۰۴]

WORRY[۲۰۵]

"۱۔پریشان ہونا، فکر مند ہونا، ذہنی کوفت میں مبتلا ہونا، ۲۔پریشان کرنا، ستانا"[۲۰۶]

CHEEK[۲۰۷]

"ا۔ گال، کلہ۔ ۲۔ چہرے پر آنکھ کے نیچے ابھار"(۲۰۸)

آرٹ(۲۰۹)

"ا۔ انسانی تخلیق، ہنر۔ ۲۔ فن پارہ ۳۔ تخلیقی کام"(۲۱۰)

سینٹ(۲۱۱)

"ا۔ برگزیدہ، عالم بالا پر فائز" (۲۱۲)

سپیشلائزیشن(۲۱۳)

"اختصاص"(۲۱۴)

باتھ روم(۲۱۵)

"غسل خانہ جس میں عموماً نہانے کے علاوہ صفائی کی دوسری سہولتیں بھی ہوتی ہیں" (۲۱۶)

بس سٹاپ(۲۱۷)

"ا۔ بس کے ٹھہرنے کی مقررہ جگہ ۲۔ اس (بس) کا نشان" (۲۱۸)

انڈسٹری(۲۱۹)

"ا۔ صنعت و حرفت کے کاروبار اور اشیا کی تیاری کا ایک شعبہ۔ ۲۔ تجارت اور حرفت کے لیے مشترک نام"(۲۲۰)

گن مین(۲۲۱)

"ا۔ بندوق سے مسلح آدمی (خصوصاً ارتکاب جرم کے وقت" (۲۲۲)

پروڈیوسر(۲۲۳)

"ساخت کنندہ، کارخانے دار، کسی چیز کا بنانے والا، ناٹک وغیرہ کی پیش کش کرنے کا عمومی نگران یا نشریے، صوتی ریکارڈ وغیرہ کی تیاری کا مہتمم" (۲۲۴)

ریسرچ(۲۲۵)

"تحقیق، باقاعدہ چھان بین" (۲۲۶)

ڈکشنری(۲۲۷)

"ا۔ لغت، ۲۔ کتاب اللغات"(۲۲۸)

میرج(۲۲۹)

"شادی" [۲۳۰]

ہینڈسم [۲۳۱]

"خوبرو، خوش منظر، فراخدلانہ، فیاضانہ" [۲۳۲]

ڈائیلاگ [۲۳۳]

"گفتگو، کلام، تحریری کلام جو انشا سے تعلق رکھتا ہو، مباحثہ" [۲۳۴]

[۲۳۵] BREAD

"روٹی (اکثر خمیری)، غذا، خوراک، روزی" [۲۳۶]

ٹائلٹ [۲۳۷]

"طہارت (کرنے) کی جگہ، طہارت کا عمل" [۲۳۸]

آرڈر [۲۳۹]

"نظم و ترتیب، کسی با اختیار کی طرف سے واجب التعمیل حکم" [۲۴۰]

کلچر [۲۴۱]

"فنون اور دیگر ذہنی کمالات، کرشمے، بحیثیت مجموعی تہذیب و ثقافت" [۲۴۲]

بیوٹی پارلر [۲۴۳]

"زنانہ سنگھار خانہ" [۲۴۴]

رورل [۲۴۵]

"ا۔ دیہاتی، مضافاتی، گاؤں کا" [۲۴۶]

[۲۴۵] BROTHER IN LAW

"برادر نسبتی، سالا" [۲۴۶]

ٹائم [۲۴۷]

"زمان، ماضی، حال اور مستقبل کے واقعات کا تسلسل، وقت" [۲۴۸]

ٹارگٹ [۲۴۹]

"ا۔ ہدف، کوئی نشانہ جس کو شست باندھی جائے" [۲۵۰]

ائیرپورٹ [۲۵۱]

"ہوائی اڈا، طیران گاہ"[۲۵۲]

وہیل چیئر[۲۵۳]

"پہیے دار کرسی، کرسی جس میں پہیے لگے ہوں"[۲۵۴]

ٹارچر[۲۵۵]

"آزادی، تعذیب، تشدد، جسمانی اذیت پہنچانے کا عمل"[۲۵۶]

فراڈ[۲۵۷]

"دھوکے بازی، فریب دہی، مکاری، چال بازی"[۲۵۸]

اوریجنل[۲۵۹]

"۱۔ابتدائییا آغاز سے موجود، خلقی، فطری۔

۲۔ابتدائی نمونہ نہ کہ نقل"[۲۶۰]

اسٹارٹ[۲۶۱]

"شروع کرنا کرنے لگنا"[۲۶۲]

انجائے[۲۶۳]

"لطف اندوز ہونا، کسی چیز کو کام میں لانا یا اس سے استفادہ کرنا۔مزے کرنا، مگن ہونا"[۲۶۴]

ڈس کوالیفیکیشن[۲۶۵]

"نااہل قرار دینے کی کارروائی، نااہلیت کی بنیاد یا سبب"[۲۶۶]

انوسٹ[۲۶۷]

"۱۔رقم لگانے، سرمایہ کاری کا عمل۔ ۲۔لگایا ہوا سرمایہ ۳۔وہ جائیداد یا املاک جس میں سرمایہ لگایا ہو۔"[۲۶۸]

لنچ[۲۶۹]

"دوپہر کا کھانا، ہلکی خوراک جو کسی وقت کی بھی ہو"[۲۷۰]

پرنٹنگ پریس[۲۷۱]

"چھاپہ خانہ، مطبع"[۲۷۲]

ری ایکشن[۲۷۳]

"ردعمل، جوابی عمل، تعامل"[۲۷۴]

کارنر [۲۷۵]

"۱۔ کونہ، وہ جگہ جہاں دو کنارے ملتے ہوں۔ ۲۔ خصوصاً دو سڑکوں کا اتصال" [۲۷۶]

کلینک [۲۷۷]

"نجیبا خصوصی ہسپتال، ۔ ۲۔ مقام یا محل و موقع جہاں خصوصی طبی علاج کیا جائے یا مشورہ دیا جائے۔" [۲۷۸]

جیلس [۲۷۹]

"۱۔ حاسد، ۲۔ دوسروں کے فائدے سے جلنے والا" [۲۸۰]

بلیک میل [۲۸۱]

"دھمکی دے کر رقم وصول کرنا۔ دھمکانا، ڈرانا، اخلاقی دباؤ" [۲۸۲]

میٹنگ [۲۸۳]

"جلسہ مشاورت، جمع ہونے والے، ملاقات" [۲۸۴]

ٹرائی کرنا [۲۸۵]

"کسی بات یا کسی کامیابی کے لیے کوشش کرنا" [۲۸۶]

کمپرومائز [۲۸۷]

"سمجھوتا، کسی تنازع کا تصفیہ کچھ لو کچھ دو کے اصول پر کرنا" [۲۸۸]

ریپوٹیشن [۲۸۹]

"شہرت، عام رائے" [۲۹۰]

ڈائریکٹ [۲۹۱]

"براہِ راست، مستقیم، سیدھی سمت میں رواں، سیدھا، بلا ہیر پھیر اصل نکتے پر مرکوز، بلاواسطہ" [۲۹۲]

پِک [۲۹۳]

"چننا، انتخاب کرنا" [۲۹۴]

بجٹ [۲۹۵]

"کسی خاص مد کے لیے درکار یا مہیا رقم، قومی آمدن اور اخراجات کا تخمینہ، آمدنی کی نسبت سے اخراجات کا اندازہ" [۲۹۶]

لش [۲۹۷]

"لہلہاتا، پھبکتا، شاداب، بھرپور، فراواں"(۲۹۸)

ڈیمانڈ(۲۹۹)

"مطالبہ، پرزور مانگ بطور استحقاق" (۳۰۰)

ٹیلی کمیونیکیشن(۳۰۱)

"تار برقی، ٹیلی فون یا نشریات کے ذریعے فاصلے پر پیغام رسانی " (۳۰۲)

ماڈرن(۳۰۳)

"جدید یا حالیہ دور کا ۲۔ رائج، رواں، چالو۔ ۳۔ آج کے دور کا آدمی " (۳۰۴)

سپورٹ(۳۰۵)

"ا۔ کسی کا کل یا کچھ بوجھ اٹھانا۔ ۲۔ گرنے، ڈوبنے، ہارنے سے بچانا، ۳۔ پالنا، خرچ اٹھانا"(۳۰۶)

گیسٹ روم(۳۰۷)

"مہمان کا کمرہ"(۳۰۸)

سروس(۳۰۹)

"ا۔ خدمت ۲۔ کسی شخص یا ادارے کے کام انجام دینا۔ ۳۔ سماجی کام کرنا۔ ۴۔ انجام دیا جانے والا کام ۵۔ کسی کے ساتھ حسن سلوک(۳۱۰)

سلیپنگ سوٹ(۳۱۱)

"ا۔ شب خوابی کا لباس، خصوصاً بچوں کا اکہرا پاجامہ"(۳۱۲)

(۳۱۳)SMELL

"سونگنے کی حس، شامہ، بدبُو۔ ناگوار بُو"(۳۱۴)

(۳۱۵)SHARE

"شرکت کا حصہ جو دیا جائے یا لیا جائے، حصہ، پتی، شراکت داری، تقسیم، بٹوارہ کرنا"(۳۱۶)

ریڈی میڈ گارمنٹس(۳۱۷)

"معیاری ناپ اور وضع کے مطابق تیار کیے ہوئے کپڑے، سلے سلائے کپڑے"(۳۱۸)

پبلسٹی(۳۱۹)

"شہرت، نشرواشاعت، کسی تجارتی مال یا کمپنی کے نام یا فروخت کو فروغ دینے کی پیشہ ورانہ کوشش"(۳۲۰)

ڈیمانسٹریٹ[۳۲۱]

"نمائش، اظہار کرنا، کر کے دکھانا، عملاً واضح کرنا، منطقی طور پر ثابت کرنا۔"[۳۲۲]

عطاء الحق قاسمی نے انگریزی کے ان اردو متبادلات میں سے ان متبادل الفاظ کے طور پر انگریزی لفظیات استعمال کی ہیں جو سماج میں عام مستعمل ہیں۔ اس وجہ سے انگریزی لفظیات کے استعمال کے باوجود بھی ان کی نثر سماج کے عام لسانی منظر نامے سے میل کھاتی ہے۔ اس امر نے ان کی نثر کے اسلوب کو سلیس، رواں، شستہ اور آسان فہم بنا دیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص ۳۹

۲۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی، ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۳۴۱۳

۳۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۴۵

۴۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۹۲۷

۵۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۴۶

۶۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۴۲۶۷

۷۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۴۷

۸۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۱۸۰۴

۹۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۴۸

۱۰۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹،، ص ۲۱۰۳

۱۱۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۵۲

۱۲۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹،، ص ۱۶۳۸

۱۳۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۵۴

۱۴۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹،، ص ۹۲۳

۱۵۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۵۵

۱۶۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۱۰۶۱

۱۷۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۵۶

۱۸۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۱۳۵۶

۱۹۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۵۸

۲۰۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۲۸۷۰

۲۱۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۶۰

۲۲۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۲۱۱۶

۲۳۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۶۰

۲۴۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۱۳۴۳

۲۵۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۶۱

۲۶۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۱۳۴

۲۷۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۶۲

۲۸۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۲۰۸۱

۲۹۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۶۵

۳۰۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۱۶۵۵

۳۱۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۷۳

۳۲۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۷۷

۳۳۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۹۲۸

۳۴۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۷۸

۳۵۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۲۲۸۸

۳۶۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۷۹

۳۷۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۲۱۲

۳۸۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۸۶

۳۹۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۱۳۵۹

۴۰۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۲۶۷۱

۴۱۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۸۹

۴۲۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۱۰۴۳

۴۳۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۹۱

۴۴۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۹۳

۴۵۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۳۴۲۸

۴۶۔ عطاءالحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، ص۹۵

۴۷۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۲۱۳

۴۸۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۶

۴۹۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۵۴۳

۵۰۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۱۸

۵۱۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۲۹۳۹

۵۲۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۲۹۲۵

۵۳۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۲۲۶۷

۵۴۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۱۹

۵۵۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۲۸۹۱

۵۶۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۲۲

۵۷۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۲۴

۵۸۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۲۳۱

۵۹۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۳۲۲

۶۰۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۲۵

۶۱ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۹۵

۶۲۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۲۷

۶۳۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۱۳۵۱

۶۴۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۲۸

۶۵۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۱۰۱۷

۶۶۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۲۹

۶۷۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۵۱

۶۸۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۳۲

۶۹۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۵۱۲

۷۰۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۴۱

۷۱۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۲۶۴۶

۷۲۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۵۰

۷۳۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۵۳۴

۷۴۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۵۰

۷۵۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۱۷۴۳

۷۶۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۶۰

۷۷۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۲۸۶۷

۷۸۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۶۲

۷۹۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۱۵۷

۸۰۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۶۶

۸۱۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۹۹

۸۲۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۸۷

۸۳۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۸۰۲

۸۴۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۹۱

۸۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۱۹۲

۸۶۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۱۱۳۱

۸۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۲۱۰

۸۸۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۳۷۹

۸۹۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۳۸۰

۹۰۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۲۲۱

۹۱۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۲۳۰

۹۲۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۱۰۴۴

۹۳۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۲۳۰

۹۴۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۲۳۰

۹۵۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۰۳۴
۹۶۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۲۳۴
۹۷۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۲۹۹
۹۸۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، ص ۲۳۴
۹۹۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۴۸۶
۱۰۰۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۱۰۲، ص ۶۱
۱۰۱۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۶۸۳
۱۰۲۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، ص ۲۴
۱۰۳۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۳۴۹۳
۱۰۴۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، ص ۲۶
۱۰۵۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۵۸
۱۰۶۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، ص ۶۹
۱۰۷۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۳۶۰
۱۰۸۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، ص ۸۲
۱۰۹۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص ۶۹۵
۱۱۰۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، ص ۸۲

۱۱۱۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹،
ص ۱۳۶۴

۱۱۲۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، ص ۹۵

۱۱۳۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹،
ص ۶۸۴

۱۱۴۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، ص ۱۰۴

۱۱۵۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، ص ۱۱۴

۱۱۶۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹،
ص ۱۰۲۴

۱۱۷۔ عطاء الحق قاسمی، روزنِ دیوار سے، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۳، ص ۶۰

۱۱۸۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹،
ص ۱۱۰

۱۱۹۔ عطاء الحق قاسمی، روزنِ دیوار سے، ص ۱۹۱

۱۲۰۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی
ایوارڈ، ۲۰۰۹، ص ۳۱۹۲

۱۲۱۔ عطاء الحق قاسمی، روزنِ دیوار سے، ص ۳۰

۱۲۲۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹،
ص ۱۰۲۴

۱۲۳۔ عطاء الحق قاسمی، روزنِ دیوار سے، ص ۳۵

۱۲۴۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹،
ص ۲۸۵

۱۲۵۔ عطاء الحق قاسمی، روزنِ دیوار سے، ص ۹۳

۱۲۶۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹،
ص ۱۷۱۶

۱۲۷۔ عطاء الحق قاسمی، روزنِ دیوار سے، ص۸۷

۱۲۸۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۹۰۳

۱۲۹۔ عطاء الحق قاسمی، روزنِ دیوار سے، ص۸۹

۱۳۰۔ عطاء الحق قاسمی، روزنِ دیوار سے، ص۱۶۱

۱۳۱۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء۲

۱۳۲۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۶۸

۱۳۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۳۵

۱۳۴۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۱۳۲

۱۳۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۶۵

۱۳۶۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۸۲۵

۱۳۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۵۷

۱۳۸۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۲۵۵۱

۱۳۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، ص۳۸

۱۴۰۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۴۵۲۵

۱۴۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۱۱۰

۱۴۲۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء، ص۱۳۴۹

۱۴۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۱۳۷

۱۴۴۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء،
ص۷۹۹

۱۴۵۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۱۴۲

۱۴۶۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء،
ص۳۵۷۸

۱۴۷۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۱۴۹

۱۴۸۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء،
ص ۲۳۴

۱۴۹۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۱۶۰

۱۵۰۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء،
ص۱۰۳۱

۱۵۱۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۱۶۲

۱۵۲۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء،
ص۴۹۱

۱۵۳۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۱۸۱

۱۵۴۔ سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابیادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹ء،
ص۳۱۴۹

۱۵۵۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۲۳

۱۵۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص ۴۴۲

۱۵۷۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۳۷

۱۵۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۱۷۲۱

۱۵۹۔ عطاءالحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۴۴

۱۶۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۱۷۶۶

۱۶۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۴۵

۱۶۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۸۲۴

۱۶۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۴۵

۱۶۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۲۳

۱۶۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۶۱

۱۶۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۳۳۹

۱۶۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۶۳

۱۶۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۸۲۷

۱۶۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۶۴

۱۷۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۳۸۰

۱۷۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۷۱

۱۷۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۱۹۰

۱۷۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۲۷

۱۷۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۲۰۱۲

۱۷۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۳۷

۱۷۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۴۵۶

۱۷۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۷۷

۱۷۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۶۲۹

۱۷۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۷۷

۱۸۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۰۷

۱۸۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۹۲

۱۸۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۲۸۲

۱۸۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۹۴

۱۸۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۶۷۹

۱۸۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۹۷

۱۸۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۷۳۱

۱۸۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۱۰۰

۱۸۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۲۰۶۵

۱۸۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۱۰۳

۱۹۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۱۹

۱۹۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۱۱۳

۱۹۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۴۲۸

۱۹۳۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۱۲۰

۱۹۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۲۴۷

۱۹۵۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص ۱۵۰

۱۹۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۰۶۲

۱۹۷۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۱۵۵

۱۹۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۲۰۶۰

۱۹۹۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۱۷۶

۲۰۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۹۲۳

۲۰۱۔ عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۱۷۸

۲۰۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۱۲۶

۲۰۳۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۳۷

۲۰۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۸۷۹

۲۰۵۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۳۹

۲۰۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۵۷۰

۲۰۷۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۴۰

۲۰۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۲۰۷۸

۲۰۹۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص۵۷

۲۱۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۲۳۹

۲۱۱۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص۸۰

۲۱۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۶۶

۲۱۳۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص۸۲

۲۱۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۱۴۹۴

۲۱۵۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص۸۳

۲۱۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۱۱۹۳

۲۱۷۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص۸۳

۲۱۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۱۶۶۱

۲۱۹۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص۸۴

۲۲۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۱۰۷

۲۲۱۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص۸۵

۲۲۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء،
ص۱۸۵

۲۲۳۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص۸۶

۲۲۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص ۸۱۱

۲۲۵۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص ۸۸

۲۲۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص ۷۰۳

۲۲۷۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص ۸۹

۲۲۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص ۱۳۲۱

۲۲۹۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص ۸۹

۲۳۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص ۱۴۲۸

۲۳۱۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص ۹۱

۲۳۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص ۴۲۲

۲۳۳۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص ۹۱

۲۳۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص ۹۸۰

۲۳۵۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص ۹۲

۲۳۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص ۱۴۷

۲۳۷۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص ۹۴

۲۳۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص ۴۲۰

۲۳۹۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص ۹۵

۲۴۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۵

۲۴۱۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۹۵

۲۴۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۴۴

۲۴۳۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۹۶

۲۴۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۴۱

۲۴۵۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۹۶

۲۴۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۳۶۳

۲۴۷۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۹۶

۲۴۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱۳

۲۴۹۔ عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۹۷

۲۵۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۴۸۵

۲۵۱۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۳

۲۵۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۴

۲۵۳۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۶

۲۵۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۸۳۶

۲۵۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۱۸

۲۵۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳،
ص۱۷۸۸

۲۵۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۱۸

۲۵۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳،
ص۳۲

۲۵۹۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۱۹

۲۶۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی
پریس، ۲۰۰۳، ص۲۰۴۴

۲۶۱۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۲۱

۲۶۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳،
ص۱۸۵۴

۲۶۳۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۲۲

۲۶۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳،
ص۶۲۵

۲۶۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۲۵

۲۶۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی
پریس، ۲۰۰۳، ص۱۱۴۶

۲۶۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۲۶

۲۶۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳،
ص۱۶۴۵

۲۶۹۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۲۸

۲۷۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳،
ص۵۱۶

۲۷۱۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۲۸

۲۷۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۴۴۳

۲۷۳۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳۰

۲۷۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۸۴۰

۲۷۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳۳

۲۷۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۹۵۱

۲۷۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳۳

۲۷۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۱۵

۲۷۹۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۳۸

۲۸۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۳۸۸

۲۸۱۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۴۵

۲۸۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۳۲۸

۲۸۳۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۶۸

۲۸۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۲۶۵

۲۸۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۴

۲۸۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۸۵۴

۲۸۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۱۷۹

۲۸۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۳۷

۲۸۹۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۸۲

۲۹۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۹۹۶

۲۹۱۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۸۹

۲۹۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۸۹۱

۲۹۳۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۹۲

۲۹۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۲۹۷

۲۹۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۹۵

۲۹۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۴۲۷

۲۹۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۱۹۴

۲۹۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۴۳۰

۲۹۹۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۲۰۲

۳۰۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۲۳۹

۳۰۱۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۲۰۴

۳۰۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۷۸

۳۰۳۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسارونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴، ص۲۰۴

۳۰۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۹۵۲

۳۰۵۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۲۰۵

۳۰۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۳۹۹

۳۰۷۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۲۰۵

۳۰۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۹۷

۳۰۹۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۲۱۶

۳۱۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۲۹

۳۱۱۔ عطاء الحق قاسمی، ہنسا رونا منع ہے، مشمولہ، مجموعہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴ء، ص ۲۱۷

۳۱۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۷۵۴

۳۱۳۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۱۰۲ء، ص ۹

۳۱۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۷۰۰

۳۱۵۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۱۰۲ء، ص ۱۳

۳۱۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۵۶۴

۳۱۷۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۱۰۲ء، ص ۱۳

۳۱۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۶۹

۳۱۹۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۱۰۲ء، ص ۳۲

۳۲۰۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈیونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۶۲۸

۳۲۱۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۱۰۲، ص۳۵

۳۲۲۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈیونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۰۴۷

۳۲۳۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۱۰۲، ص۵۶

۳۲۴۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈیونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۵۷۴

۳۲۵۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۱۰۲، ص۷۷

۳۲۶۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈیونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۱۳۹۰

۳۲۷۔ عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۱۰۲، ص۸۳

۳۲۸۔ شان الحق حقی، مرتب، اوکسفرڈ انگلش اردو ڈکشنری، کراچی، اوکسفرڈیونی ورسٹی پریس، ۲۰۰۳، ص۴۰۲

باب پنجم

مجموعی جائزہ، استخراجِ نتائج، سفارشات

الف: مجموعی جائزہ

اردو زبان آغاز ہی سے مختلف زبانوں اور بولیوں کے الفاظ اپنے اندر سموتی چلی آئی ہے جس سے ایک طرف اس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہوا ہے تو دوسری طرف اس میں لکھنے والوں کے لیے مختلف علاقوں اور مختلف اقوام کی سماجی اور ثقافتی صورت حال کی عکاسی میں بھی آسانی پیدا ہوئی ہے۔

کوئی بھی زبان جامد نہیں رہ سکتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے عناصر زبان میں تبدیلی لانے کا باعث بنتے رہتے ہیں اور زبان ان عناصر سے متاثر ہو کر ارتقائی مراحل طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف زبانوں میں لکھا گیا ادب بھی دوسری زبانوں کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی پیدا کرنے کا باعث بنتا ہے۔

زبان میں تبدیلی کا یہ عمل مختلف انداز میں جاری رہتا ہے۔ کہیں تو اس پر سیاسی اور سماجی حالات کا گہرا سایہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے زبان میں تبدیلی آتی ہے۔ اس کی بڑی مثال ہم آج کے دور میں شہری اور دیہاتی ماحول میں بولی جانے والی اردو سے ہی لیتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شہر میں بولی جانے والی اردو میں انگریزی الفاظ کی کثیر تعداد شامل ہوتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ شہر میں ہونے والی تیز ترین ترقی اور اس ماحول میں بسنے والے لوگوں کا تعلیمیافتہ ہونا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شہر میں استعمال ہونے والی جدید ایجادات کے نام انگریزی میں ہونے کی وجہ سے بھی اس ماحول کی اردو میں انگریزی زبان کے الفاظ کی آمیزش زیادہ ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جب ہم دیہات میں بولی جانے والی اردو زبان کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دیہات میں بولی جانے والی اردو میں انگریزی کی بجائے پنجابی زبان کے الفاظ کی آمیزش زیادہ ہے۔ پنجابی زبان کے ان الفاظ کی شمولیت کی بڑی وجہ دیہاتی لوگوں کا پنجابی سے گہرا لگاؤ ہے۔ یہ لگاؤ اور روزمرہ بول چال میں پنجابی کے استعمال کی وجہ سے اس ماحول میں بولی جانے والی اردو میں بھی پنجابی زبان کے الفاظ کی خاصی تعداد شامل ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دیہات میں بولی جانے والی اردو میں لہجے کی بنا پر بھی شہری علاقوں میں بولی جانے والی اردو میں فرق ہو گا۔ دیہاتی علاقوں کے لوگوں کی اردو کا لہجہ بھی پنجابی سے ملتا جلتا ہو گا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان میں آنے والی تبدیلیاں خواہ وہ نحوی سطح پر ہوں یا صوتی سطح پر، ان پر سماج اور ماحول کا خاصا

گہرا اثر ہوتا ہے۔ یہ اثرات آگے چل کر زبان کے حوالے سے کئی نئے در وا کرتا ہے اور نئی جہتوں سے آشنائی دلاتا ہے۔ اس حوالے سے اردو کو دیکھا جائے تو ہر بدلتے دور کے ساتھ ساتھ اس کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ لسانی حوالے سے اس میں بھی تبدیلیاں ہوتی آئی ہیں۔ ان تبدیلیوں کے پیچھے مختلف سماجی اور ثقافتی عناصر کارفرما ہیں۔ اردو نے بہت سی زبانوں کے اثرات قبول کیے ہیں جن میں پنجابی اور انگریزی اہم ہیں۔ پنجابی اور اردو کا آپس میں گہرا لسانی رشتہ ہے۔ اردو کے بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو پنجابی کی دین ہیں اور آج بھی پنجابی اور اردو دونوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سماجی اور ثقافتی اشتراکات بھی ان دونوں زبانوں کو خاصے مضبوط رشتے میں باندھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں لکھی گئی اکثر تحریروں میں پنجابی لفظیات کا استعمال کثرت سے ملتا ہے۔ پنجابی کی طرح اردو نے انگریزی سے بھی خاص اثر قبول کیا ہے۔ انگریزوں نے جو تقریباً ایک صدی کا عرصہ برصغیر پر حکمرانی کی اس میں انہوں نے یہاں کی عوام سے صرف حاکم اور محکوم کا رشتہ ہی نہیں رکھا بلکہ انہوں نے وسیع المدتی پالیسیاں اپناتے ہوئے یہاں کے سماج، ثقافت اور معیشت کو اپنے حق میں ڈھالنے کے جتن بھی کیے۔ زبان چوں کہ سماج، ثقافت اور معیشت کے اظہار میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے یوں جب ان تینوں ستونوں میں مغربی انداز فکر کی تبدیلی آنی پیدا ہوئی تو زبان بھی متاثر ہوئی۔ اور اردو زبان میں انگریزی لفظیات کا استعمال بڑھنا شروع ہو گیا۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ نوآبادیاتی عہد میں ادبی حوالے سے صورت حال استعمار کاروں سے خاصی متاثر نظر آتی ہے اور یہ اثرات لسانی سطح پر بھی نظر آتے ہیں۔

پنجاب کی لسانی صورت حال کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہیے کہ زبان کوئی جامد شے نہیں ہوتی۔ دنیا کی تمام زبانیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے الفاظ کو متروک کرتی چلی جاتی ہیں اور بتہ سے نئے الفاظ زبانوں میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اردو کا دامن اس لحاظ سے خاصا وسیع ہے کہ اردو میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سی زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے گئے اور یہ شمولیت اس انداز میں ہوئی کہ وہ الفاظ اردو کے قواعد میں ڈھل کر اردو ہی کے بن کر رہ گئے۔ پنجابی اور اردو کے لسانی اشتراک خاصے وسیع ہیں۔ پنجابی کے الفاظ اردو میں یوں شامل ہوتے ہیں کہ وہ اپنا سماجی اور ثقافتی پس نظر بھی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اس تناظر میں عطاء الحق قاسمی کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی تحریروں میں شامل ہونے والے پنجابی الفاظ تحریر میں ٹھونسے ہوئے معلوم نہیں ہوتے بلکہ

وہ جہاں بھی پنجابی الفاظ استعمال کرتے ہیں وہاں اس الفاظ کا ایک خاص سماجی تناظر سامنے آتا ہے اور ان کی تحریر حقیقی معنوں میں پنجابی معاشرت کی تصویر سامنے لانے لگتی ہے۔

پنجاب کے خطے کی سماجی صورت حال ہر دم تغیر پذیر ہے یہاں کی تعلیمی حالت دیگر علاقوں کی نسبت خاصی بہتر ہے۔ تعلیمی بہتری کی وجہ سے روزگار اور معاشی حوالے سے بھی یہاں کے لوگ برصغیر کے دیگر علاقوں کی نسبت خاصے مضبوط ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی سطح پر مثبت اقدار فروغ پاتی ہیں۔ اس کے علاوہ پنجاب کی مٹی نے بہت سی تہذیبوں کو جنم دیا ہے۔ تہذیبی ارتقا اس خطے کے باشندوں کی زندگیوں میں واضح نظر آتا ہے۔ اس خطے کی معاشرت اور تہذیب میں مثبت اقدار کے فروغ پانے کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کے طرز زندگی اور انداز معاشرت میں حسن جھلکتا نظر آتا ہے۔ یہاں کے لوگ ایک دوسرے کو اجنبی نہیں سمجھتے۔ تقسیم ہند کے وقت ہندوستان سے کثیر تعداد میں مہاجرین اس خطے میں آ کر آباد ہوئے۔ ان کے آنے سے سماجی سطح پر خاص تبدیلیاں بھی رونما ہوئیں لیکن پنجابی معاشرت کا بنیادی ڈھانچہ ارتقا کی طرف ہی گامزن رہا۔ ملک میں اٹھنے والی تمام بڑی تحریکوں نے پنجاب ہی سے جنم لیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجابی سماج کے باشندے اپنے مسائل اور اپنے حقوق کے بارے میں خاصی آگاہی رکھتے ہیں۔ یہ آگاہی ان کے شعور کو جلا بخشتی ہے اور وہ اپنے حقوق کی خاطر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ رسوم و رواج کے حوالے سے پنجابی سماج کو دیکھا جائے تو یہاں خوشی و غم کے عالمگیر تصورات پائے جاتے ہیں۔ خوشی و غمی کی رسومات پنجابی سماج اور پنجابی معاشرت میں بسنے والے باشندوں کییک جہتی اور یگانگت کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ لسانی حوالے سے دیکھا جائے تو پنجاب کی زبان یعنی پنجابی زبان کے اردو پر گہرے اثرات نظر آتے ہیں۔ مختلف ادیبوں کی تحریروں میں اردو میں پنجابی زبان کے الفاظ کی شمولیت تحریر کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ اس تناظر میں جب ہم پنجابی معاشرت کی عکاسی کے حوالے سے دیکھتے ہیں تو عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں پنجابی زبان کے الفاظ کا معاشرتی تناظر خاصا وسیع نظر آتا ہے۔ ان کی تحریریں پنجابی معاشرت کی بخوبی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔

جب ہم عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں پنجابی اور انگریزی زبان کی لفظیات کے استعمال کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی تحریروں میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کا استعمال تحریر کا بارعب بنانے کے لیے دانستہً نہیں کیا گیا بلکہ یہ ان اثرات کا نتیجہ ہے جو اردو زبان پر پڑتے رہے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی ادبی شخصیت کی تکمیل ایک مزاح نگار کے طور پر ہی نہیں بلکہ سفر نامہ نگاری اور کالم نگاری میں بھی انہوں نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کے سفر نامے ان کے گہرے مشاہدے کے غماض ہیں۔ انہوں نے اپنے سفر ناموں میں نہ صرف مختلف ممالک کے حالات اور اپنے مشاہدات بیان کیے ہیں بلکہ ان ممالک کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی صورت حال کو بھییوں بیان کیا ہے ایک پورا منظر نامہ قاری کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ وہ قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلتے ہوئے اسے ان ممالک کے مختلف مناظر کی سیر کرواتے ہیں جہاں جہاں وہ خود چل رہے ہوتے ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں قاری کو ظاہری مناظر کے ساتھ ساتھ ان ممالک کے لوگوں کی نفسیات کے حوالے سے بھی خاصی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے سفر ناموں میں مختلف ممالک کی ثقافت کو بیان کرنے کے لیے جو پنجابی اور انگریزی لفظیات استعمال کی ہیں انہوں نے نہ صرف ان کی تحریر میں دلکشی پیدا کر دی ہے بلکہ مکالماتی حوالے سے ان کی تحریر اصلیت کے قریب نظر آنے لگتی ہے۔ ان تحریروں میں پنجابی لفظیات کے ذریعے کے نہ صرف پنجابی زبان کو فروغ دیا گیا ہے بلکہ پنجابی معاشرت اور ثقافت کی بھی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ انہوں نے پنجابی ثقافت کی عکاسی کرتے ہوئے پنجاب کے مختلف ثقافتی عناصر کی جھلک قاری کو دکھائی ہے۔ لڈی، ناچ، بھنگڑا اور اس طرح کے دیگر ثقافتی مظاہر ان کی تحریروں میں پنجابی ثقافت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی اردو نثر میں پنجابی ثقافت کی عکاسی اصل میں ان کے پنجاب سے گہرے لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ وہ ایک حساس طبع لکھاری ہیں۔ انہوں نے پنجاب کی بود و باش اور ثقافت کا گہرا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں پنجاب جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ پنجاب کی ثقافت کی مثال ایک رنگارنگ گلدستے کی سی ہے جس میں کئی قسم کے اور کئی رنگوں کے پھول سجے ہوتے ہیں۔ وہ تمام پھول ایک طرف تو مل کر گلدستے کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہے ہوتے ہیں تو دوسری طرف ان کی انفرادی حیثیت بھی مسلمہ ہوتی ہے۔ اسی طرح پنجاب کی ثقافتی اکائیاں آپس میں مل کر جہاں ایک طرف پنجاب کی مجموعی ثقافت کی تشکیل کر رہی ہوتی ہیں وہیں دوسری طرف ہر ثقافتی اکائی اپنا بھی ایک خاص وجود رکھتی ہے، یہ انفرادیت پنجاب کے مختلف خطوں کی مختلف ثقافتی اکائیوں میں پائی جاتی ہے۔ اس تناظر میں عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں پنجابی ثقافت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انہوں نے جہاں پنجاب کی مجموعی ثقافت کو اپنی تحریروں میں سمویا ہے وہیں ان کی تحریروں میں مختلف علاقوں کی انفرادی ثقافت کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ خاص طور پر لاہور کے بارے میں لکھے گئے مضامین اور دیگر تحریروں میں لاہوری ثقافت کی خوب عکاسی کی

گئیہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عطاء الحق قاسمی ثقافت کو اس کی اکائیوں کے ساتھ دیکھنے کے عادی ہیں۔ انہیں مختلف علاقوں کی ثقافت سے نہ صرف بخوبی آگاہی ہے بلکہ وہ زمانے کے ساتھ ساتھ ثقافت کی بدلتی صورت حال کو بھی خاص طور پر پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں کی بڑی خوبییہ ہے کہ وہ کسی علاقے کی ثقافت کی عکاسی کرتے وقت جو زبان استعمال کرتے ہیں وہ بھی اس علاقے کی لسانی صورت حال کی ترجمان بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کی نثر میں موجود پنجابی الفاظ شعوری طور پر ٹھونسے ہوئے معلوم نہیں ہوتے بلکہ انہوں نے ایک روانی کے ساتھ ساتھ عام آدمی کی بول چال کی زبان کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔ وہ جس علاقے کی ثقافت کی عکاسی کر رہے ہوتے ہیں وہاں کی لسانی صورت حال سے خوب آگاہ ہوتے ہیں، لسانی صورت حال کو رواج دینے کی وجہ سے ان کی تحریریں حقیقت کے قریب نظر آتی ہیں۔

پنجابی لفظیات کے استعمال کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہاں بھی ان کے ہاں ایسی صورت حال نظر آتی ہے جو انہیں عصر حاضر کے دیگر ادیبوں سے منفرد کرتی ہے۔ انہوں نے پنجابی لفظیات کا استعمال متنوع انداز میں کیا ہے۔ کہیں تو وہ پنجابی لفظیات کو ان کے اصلی معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور کہیں وہ انہیں مزاح پیدا کرنے کے لییوں استعمال کرتے ہیں کہ ان کی تحریر میں بات سے بات جڑتی چلی جاتی ہے اور قاری کو حیرت میں ڈال دیتے ہیں کہ ایسا بھی ہو سکتاہے۔ قاری ان کی تحریر کے سحر میںیوں کھو جاتا ہے کہ ایک طرح کی سرشاری اور سرمستی جنم لینے لگتی ہے۔

ثقافت کے بعد جب ہم پنجاب کے سماج کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیت سامنے آتی ہے کہ پنجاب کا سماج ایک منفرد سماج ہے۔ اس سماج میں مختلف سماجی عناصر ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایسی سماجی فضا کی تشکیل کرتے ہیں جو پنجاب کے باسیوں کے حقیقی سماج کو سامنے لاتی ہے۔ اس سماجی فضا میں مختلف عناصر ایک دوسرے سے مل کر ایک ایسا سماج تشکیل دیتے ہیں جو ایک طرف قدیم روایات کا امین بن کر سامنے آتا ہے تو دوسری طرف اس سماج میں جدید رجحانات سے ہم آہنگ ہونے کی بھی پوری استطاعت موجود ہے۔

پنجابی سماج میں بھی پنجابی ثقافت کی طرح مختلف سماجی اکائیاں ملی ہوئی ہیں۔ یہ اکائیاں مل کر ایک سماج کی تشکیل کر رہی ہیں۔ پنجاب ایک ایسا خطہ ہے جس میں ایک علاقے کی سماجی صورت حال دوسرے علاقے سے نہ صرف مختلف ہے بلکہ ہر علاقہ اپنی انفرادی سماجی شناخت بھی رکھتاہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس قدر سماجی اقدار اور رسومات پنجاب کے خطے میں پائی جاتی ہیں کسی اور میں ان کا وجود محال ہے۔ اس متنوع سماجی صورت

حال کے باعث پنجاب کی سماجی فضا میں مختلف رنگوں کی آمیزش نظر آتی ہے جو اس کے سماجی منظر نامے کو عیاں کرتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں پنجابی سماج کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ انہوں نے پنجابی سماج کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ وہ خود پنجاب سے تعلق رکھنے کی بنا پر اس خطے کی رسوم اور روایات سے بخوبی واقف ہیں۔ ان کی اردو نثر کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پنجابی ثقافت کے ساتھ ساتھ پنجاب کی معاشرت کے حوالے سے بھی ان کی تحریریں خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی تحریروں میں پنجابی لفظیات کے ذریعے پنجاب کے لوگوں کی معاشرت اور سماجی رویوں کی بھی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ یہ بات حقیقت ہے کہ انہوں نے یہ تحریریں زیادہ تر ان ممالک کے اسفار کے حوالے سے لکھی ہیں جہاں پنجابی بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن قاسمی صاحب کے انداز بیان نے ان تحریروں میں بھی پنجابی زبان کی لفظیات کو یوں استعمال کیا ہے کہ وہ لفظیات کہیں بھی تحریر میں نہ تو ٹھونسی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور نہ ان کے استعمال سے تحریر میں ابلاغ کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے بلکہ پنجابی لفظیات کو انہوں نے تحریر میں یوں سمویا ہے کہ نثر مزید رواں ہونے کے ساتھ ساتھ قاری کی دلچسپی میں اور اضافہ کا باعث بن گئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قاسمی صاحب کا پنجابی زبان، پنجابیسماج اور پنجابی ثقافت کا مطالعہ خاصا وسیع ہے۔ انہوں نے پنجابی زبان کی لفظیات کا استعمال اسی سیاسی، سماجی اور ثقافتی منظر نامے کو بیان کرنے کے حوالے سے یوں کیا ہے کہ پنجابی ثقافت اور سماج کا نقشہ قاری کی آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔

پنجاب مختلف سماجی رویوں اور ثقافتی اکائیوں پر مشتمل خطہ ہے۔ یہاں کی معاشرت اور ثقافت اپنی خاص پہچان رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب پنجابی زبان کی لفظیات اردو کی کسی تحریر میں سامنے آتی ہیں تو اس سماج اور ثقافت کی رنگارنگی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور جھلکنے لگتا ہے۔ لڈی ہی کو لے لیجیے۔ پنجاب کے تمام علاقوں میں لڈی نہیں ڈالی جاتی لیکن جن علاقوں میں یہ ناچ ہوتا وہاں اس کا رواج اس قدر ہے کہ یہ پورے پنجاب کی پہچان بن کر ابھرنے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی بھی تخلیق کار اردو میں لکھتے وقت لڈیا لڈیاں پاؤنا کے الفاظ استعمال کرتا ہے تو تحریر خواہ کسی بھی علاقے کے حوالے سے لکھی جارہی ہو ایک بار یہ لفظیات تخلیق کار اور قاری دونوں کو پنجاب میں لاکھڑا کرتے ہیں اور پنجاب کی ثقافت کا پورا منظر نامہ سامنے آنے لگتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قاسمی کا لوگوں کا مطالعہ خاصا وسیع ہے اور لوگ اور افراد ہی کسی ثقافت کی تشکیل کے اہم

عناصر ہوتے ہیں۔ یہ عناصر زبان کے ساتھ ساتھ کسی بھی خطے کی سماجی اور ثقافتی ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں پنجابی زبان کی لفظیات اور پنجابی سماج، ثقافت اور فنون لطیفہ کی عکاسی خوب ملتی ہے۔ پنجاب اپنے سماج اور سماجی اقدار کے ساتھ ساتھ ثقافتی اقدار کے حوالے سے بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان کی ترویج میں بھی پنجاب اور پنجابی زبان کا جو عمل دخل ہے وہ نمایاں ہے۔ پنجاب نے اردو زبان اور اردو ادب کی ترویج میں اہم کردارادا کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اردو دان طبقے کے ہاں جس طرح پنجابی زبان کا چلن عام نظر آتا ہے اسی طرح اردو کے تخلیق کاروں کے ہاں بھی پنجابی لفظیات کا استعمال خوب کیا جاتا ہے۔ پنجابی کیبیہ لفظیات ایک طرف اردو کو دلکش بناتی ہیں تو دوسری پنجابی سماج اور پنجابی ثقافت کی عکاسی میں بھی نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والی پنجابی زبان کی لفظیات اپنا خاص سماجی اور ثقافتی تناظر رکھتی ہیں اورانہوں نے اس سماجی اور ثقافتی منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے ہی پنجابی لفظیات کا استعمال کیا ہے۔ ان کے ہاں پنجابی کی لفظیات کا استعمال پنجابی کی اصل ثقافت کی ترجمان بن کر سامنے آئی ہیں۔

ثقافت کے حوالے سے دیکھا جائے تو کسی بھی عمل کے ثقافتی معنوں کے قیام اور استحکام میں اس سماج کے مختلف افراد کی اجتماعیت کو خاص عمل دخل ہوتا ہے۔ ثقافت کا استحکام اجتماعیت کا مرہون منت ہے جب تک کسی سماج کے افراد کا کوئی اجتماعی رویہ سامنے نہیں آتا ان کا انفرادی عمل ثقافتی معنی اختیار کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اور اجتماعیت کا عمل بھی کثیر رخی ہوتا ہے۔ یہ ایک سماج کے مختلف طبقات کے مابین پائی جانے والی مسابقت کی کشمکش سے بھی جنم لیتا ہے۔ اس کشمکش کے دوران مختلف طبقات متصادم مفادات حاصل کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ داخلی اور خارجی سماجی حدود میں شکست وریخت اور ان کی تعمیرِ نو کے عمل کو بھی جاری رکھتے ہیں۔ تعمیر نو کا یہ عمل ثقافت اور سماجی ہم آہنگی پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ جب کسی ایک سماجی منظر نامے کی مختلف اکائیاں اپنے اپنے مفادات کے حصول کی خاطر مختلف پالیسیاں اختیار کرتے ہیں تو اس دوران میں وہ اپنے درمیان پائی جانے والی مختلف مطابقتوں اور مخالفتوں کے ذریعے اپنے سیاسی اور سماجی مقام و مرتبے کا تعین کرتے ہیں۔ اسی تعین کرنے کے عمل سے کئی طبقات اور گروہ سامنے آنے لگتے ہیں۔ ان میں سے ہر گروہ اپنی خاص عادات و اطوار کا حامل ہوتا ہے اور ان کے اظہار کے لیے دوسروں سے مختلف علامات کا استعمال کرتا ہے۔ یہی علامات مختلف گروہوں کو ایکدوسرے

سے قریب بھی کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے دوری کا ذریعہ بھی بنتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں شامل ہونے یا کسی گروہ سے خارج ہونے میں بھی سماجی اور ثقافتی اظہار کی علامات اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اظہار کی یہی علامات زبان کے قالب میں ڈھلنے لگتی ہیں۔ یوں زبان اور ثقافت ایک دوسرے کا اظہاریہ بن کر سامنے آنے لگتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی ایک زبان میں کسی دوسری زبان کی لفظیات استعمال ہوتی ہیں تو وہ لفظیات اپنے اندر ایک پورا سماجی اور ثقافتی منظر نامہ لیے ہوتی ہیں اور تخلیق کار ان لفظیات کے استعمال سے صرف اپنی تحریر کو دلکش ہی نہیں بناتا بلکہ وہ غیر محسوس انداز میں ثقافتی اور سماجی منظر نامے کو بھی بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اس تناظر میں جب عطاء الحق قاسمی کی نثر میں استعمال ہونے والے پنجابی اور انگریزی زبان کی لفظیات کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ عطاء الحق قاسمی نے اپنی نثر میں جو پنجابی اور انگریزی لفظیات استعمال کی ہیں وہ خاص سماجی اور ثقافتی منظر نامے کی عکاسی کرتی ہیں۔ وہ صرف ان کی تحریر کو دلچسپ ہی نہیں بنائی بلکہ معنوی سطح پر بھی اپنا گہرا تاثر چھوڑتی ہیں۔ جس سے اس سماج میں پائی جانے والی مختلف رسوم اور رواج کے حوالے سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنی اردو نثر میں جن پنجابی رسومات اور ثقافتی و سماجی عناصر کی عکاسی کی ہے ان میں بھنگڑا کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی ایک منفرد خوبی یہ ہے کہ ان کی تحریروں میں پنجابی معاشرت کی عکاسی اس انداز میں ملتی ہے کہ وہ پنجابی معاشرت کی دیگر معاشرتی رجحانات کے ساتھ موازنہ کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ یہ موازنہ وہ مختلف سماجی اور ثقافتی اکائیوں کو سامنے رکھتے ہوئے کرتے ہیں۔ اس موازنے میں ان کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ وہ ایک ثقافت کو دوسری سے برتر یا کم تر ثابت نہیں کرتے بلکہ مختلف ثقافتوں کی مختلف اکائیوں کو بڑے لطیف انداز میں قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ قاری کے لیے پنجابی ثقافت کے ساتھ ساتھ دیگر ثقافتوں کی صورت حال سے آگاہی اس کے علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ اپنی ثقافتی اقدار کی پہچان کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔ پنجابی ثقافت کے ساتھ ساتھ دیگر ثقافتوں کی عکاسی اور موازنے کی فضا قائم کرنے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے دنیا بھر کے اسفار کیے تھے اور دنیا بھر کے سماج کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے ہیں یوں جب وہ کسی موضوع کو احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں تو مختلف معاشروں کے سماجی رویوں اور سماجی رجحانات کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کی نفسیات کو بھی بخوبی بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک جہاں گرد شخص ہیں۔ اس جہاں گردی میں انہوں دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف اقوام کے سماجی اور ثقافتی منظر نامے کو

انتہائی قریب سے دیکھا ہے۔ وہ ان علاقوں میں موجود مختلف سماجی عناصر سے بھی بخوبی آگاہی رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں مختلف علاقوں میں عالمی صورت حال کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتی سماجی اور ثقافتی اقدار سے بھی بخوبی آگاہی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک مختلف سماجی رویوں میں پروان چڑھنے والے انسان مختلف اقدار کے حامل ہونے کے باوجود کسی نہ کسی انداز میں ایک دوسرے میل جول لازمی رکھتے ہیں اور یہی میل جول ایک معاشرت کو جزوی طور پر دوسری معاشرت میں رواج پانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی معاشرت بھی رنگا رنگ کی حامل ہے۔ اس رنگا رنگی عکاسی ان کی تحریروں میں خوب ملتی ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی نثری تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انھوں نے خود کو کسی ایک موضوع یا ایک نوع کے موضوعات کا پابند نہیں بنایا بلکہ ان کی تخلیقی کائنات کی موضوعاتی وسعت خاصی وسیع ہے۔ یہ وسعت انکے موضوعات کو ہمہ گیریت اور عالمگیریت عطا کرتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ ان کے مطالعہ اور مشاہدہ کا وسیع ہونا ہے۔ وہ چیزوں کو صرف دیکھتے نہیں بلکہ ان کے بارے میں خود غور و فکر کرتے ہیں اور معاشرتی ناہمواریوں کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انکی تحریریں شگفتگی اور شائستگی کے عنصر لیے ہوتی ہیں۔

عطاء الحق قاسمی کی وہ نثری تحریریں جو سفر ناموں کی صورت میں شائع ہوئی ہیں ان کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ انہوں نے جن ممالک کے اسفار کے تاثرات و مشاہدات اپنے سفر ناموں میں بیان کیے ہیں، ان ممالک کی تاریخ، ثقافت، سماج اور کلچر سے وہ گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان ممالک کے سماج کو گہرا مشاہدہ انتہائی قریب سے کیا ہے اور وہاں رہنے والے مختلف مذاہب اور مختلف اقوام کے لوگوں کی نفسیات کا بھی بڑی باریک بینی سے تجزیہ کیا ہے۔ ان کے ہاں چیزوں کو محض سرسری نظر سے دیکھنے کا رجحان نہیں ملتا بلکہ وہ جس چیز کو بیان کرنا چاہتے ہیں اس کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد اسے صفحہ قرطاس پر منتقل کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک ہی واقعہ ایک ہی چیز کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کا رجحان خاصا توانا ہے۔ وہ کسی چیز کو محض سرسری انداز میں دیکھ کر آگے نہیں گزر جاتے بلکہ وہ ایک کہنہ مشق تخلیق کار کی نظر سے اس کا ہر پہلو سے جائزہ لیتے ہیں۔ یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ عطاء الحق قاسمی کا چیزوں کو دیکھنے اور بیان کرنے کا انداز ایک فوٹو گرافر کا نہیں بلکہ ایک مصور کا سا ہوتا ہے۔ وہ چیزوں کے بیان میں ان کی نوک پلک سنوارنے کے حوالے سے خاص کام کرتے ہیں۔ ان کا تاریخ عالم کا مطالعہ اور عالمی سماج کا مشاہدہ خاصا وسیع ہے۔ وہ جس ماحول کے بارے میں بات کر رہے ہوتے ہیں اس ماحول کی لسانی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے

خیالات، احساسات اور مشاہدات صفحہ قرطاس پر اتارتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں ایک خاص طرح کی جاذبیت اور دلکشی پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ معنوی سطح پر بھی تحریر میں وسعت پیدا ہونے لگتی ہے۔

زبان کسی بھی تحریر کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار جس قدر بھی اعلیٰ خیالات اور افکار کا حامل اور اس کے مشاہدات اور تصورات کسی بھی حد تک وسیع کیوں نہ ہوں جب تک اسے اس زبان پر گرفت حاصل نہیں ہوگی جس میں وہ ادب تخلیق کر رہا ہے تب تو اس کے ہاں ابلاغ کے مسائل سر اٹھاتے رہیں گے۔ سفر نامہ نگاری ایک اسی صنف نثر ہے جس میں ایک تخلیق کار کے لیے زبان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ سفر نامہ نگار کو اپنے سفر کے دوران میں قدم قدم پر نئی نئی چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اور اس سماج میں ان نئی چیزوں کے نام اور ان کے استعمال کے بارے میں ایک سے زیادہ الفاظ بھی استعمال ہو سکتے ہیں جو معنوی سطح پر جا کر اس چیز کے مفہوم کو واضح کرتے ہیں۔ ہم پنجاب میں ہی دیکھتے ہیں کہ ایک ہی علاقے کے لوگوں یعنی تمام پنجابیوں کے ہاں ایک سے زیادہ لفظیات مختلف چیزوں کے لیے استعمال ہوتی ہیں اور ہر چند کلومیٹر کے بعد زبان میں تبدیلی واقع ہوتی نظر آتی ہے۔ یہی معاملہ دیگر علاقوں اور ممالک کی زبانوں کے ساتھ بھی کم یا زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی زبان ٹھوس یا جامد نہ ہوتی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔ مقامی لوگوں کی بول چال، باہر سے آئے لوگوں کے مقامی لوگوں سے ملاپ اور دیگر مختلف امور کی وجہ سے زبان میں کچھ نہ کچھ تبدیلی لازمی واقع ہوتی جاتی ہے۔ ہر زبان وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے اپنے الفاظ کو متروک کرتی چلی جاتی ہے اور بہت سے الفاظ دیگر زبانوں کے اس میں شامل ہوتے جاتے ہیں، یہ عمل زبان کے زوال کا نہیں بلکہ اس کے ارتقا کا عمل ہوتا ہے۔ اگر یہ عمل رک جائے تو زبان کا ذخیرہ الفاظ محدود ہوتے ہوتے زبان معدوم ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں بھی پنجابی اور انگریزی زبانوں کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سی زبانوں کے الفاظ شامل ہوتے رہتے ہیں اور زبان کے ارتقا کا عمل جاری رہتا ہے۔

زبان کے بدلاؤ اور ارتقا کی اس صورت حال کے تناظر میں تخلیق کار کے کردار اور تخلیق کار پر اس کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اچھا تخلیق کار زبان کے اس ارتقائی عمل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنی تخلیق کے مراحل طے کرتا ہے۔ اس سے ایک طرف زبان کے ارتقا میں مدد حاصل ہوتی ہے تو دوسری طرف اس کی تخلیق بھی عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔

اس تناظر میں جب ہم عطاء الحق قاسمی کی نثر کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ قاسمی کے ہاں جہاں زبان کے بدلاؤ کی صورت میں زبان ارتقائی مراحل طے کرتی نظر آتی ہے وہیں ان کے ہاں زبان میں دیگر زبانوں خاص طور پر پنجابی اورانگریزی زبان کی لفظیات اپنے اپنے علاقے کی سماجی اور ثقافتی صورت حال کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ ان کے ہاں زبان جامد نہیں بلکہ متحرک صورت اختیار کرتی نظر آتی ہے۔ وہ جس علاقے یا جس سماج کے بارے میں اپنے خیالات، تاثرات اور مشاہدات بیان کرر ہے ہوتے ہیں اسی سماج کی زبان کی چاشنی ان کی اردو نثر میں نظر آتی ہے۔

یورپ کا سماج مختلف النوع سماج کی سی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سماج میں سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو خاصی مستحکم اور تسلی بخش صورت حال سامنے آتی ہے۔ وہاں منتخب حکومتوں کے تختے الٹے جانے کا رواج ایشیائی ممالک کی نسبت بہت کم ہے۔ اکثر حکومتیں وہاں جب عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آتی ہیں تو اپنی مدت پوری کرنے کے بعد دوبارہ انتخابات کے ذریعے یا تو خود دوبارہ منتخب ہو جاتی ہیں یا اقتدار جیتنے والی پارٹی کو منتقل کر دیتی ہیں یوں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ سیاسی استحکام سماجی سطح پر بھی خوش حالی لانے کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان ممالک میں سرمایہ کاری اور صنعتی ترقی ایشیائی ممالک کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان ممالک میں بنیادی انسانی اقدار بری طرح پامال ہو رہی ہیں۔ اس ضمن میں دو زاویے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ عورت اور بزرگ۔ سماج کے ان دو عناصر کی سماج کے لیے خدمات اور اہمیت کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہیں۔ سماج میں ان دونوں کو جو عزت اور وقار ملنا چاہیے وہ یورپ اور دیگر انگریزی سماج میں مفقود ہے۔ وہاں عورت ایک مشینی پرزے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا کام گھر سنبھالنے کے ساتھ ساتھ دفاتر، فیکٹریوں اور دیگر مزدوریوں کی صورت میں کام کرنا اور خود کو اس کام میں کھپا دینا بھی شامل ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ ان کام کرنے والی جگہوں اور سماج کے دیگر افراد کی جنسی ہوس کا نشانہ بھی بنتی ہے۔ جنس کا کاروبار وہاں صرف عورت کی مجبوری کی وجہ سے عروج پر نظر آتا ہے۔ وہاں عورت کو گھر والی کی بجائے بستر والی بنا دیا گیا ہے جس کا کام بستر کا انتظام کرنا اور بستر پر آنے والے لیے لذت فراہم کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سماج میں عورت نام نہاد ترقی اور آزادی نسواں کے نعرے کے فریب میں آ کر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھنے کے باوجود بھی عزت اور وقار سے محروم ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اپنے انگریزی ممالک کے سفر ناموں میں عورت کی اس پامالی کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے مختلف نجی محفلوں کے ساتھ ساتھ نائٹ کلبوں اور دیگر مختلف مقامات پر مرد کی

ہوس کا نشانہ بنتی عورت کی عکاسی کی ہے۔ عورت کے اس معاشرے میں پائے جانے والے مختلف روپ انہوں نے انگریزی لفظیات اور انگریزی انداز تکلم کا استعمال کرتے ہوئے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں مغربی معاشرے میں پائی جانے والی عورت کا ہر روپ نکھرتا اور اپنی حقیقت بیان کرتا نظر آتا ہے۔ وہ مغربی سماج میں عورت کا مشاہدہ ایک ایسے نقاد کے طور پر کرتے نظر آتے ہیں جو تعصبات سے ماوراہوتا ہے اور دل میں حقیقی اصلاح کی لگن لیے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے یورپی سماج میں عورت کی جو تصویر اپنے سفر ناموں میں پیش کی ہے اس کی پیش کش کے دوران میں انہوں نے کہیں بھی غیر اخلاقییا گھٹیا لفظیات استعمال نہیں کیں۔ جہاں کہیں ایسی صورت حال پیدا ہونے بھی لگتی ہے وہ انگریزی لفظیات کا سہارا لے کر تحریر کو اس خوب صورتی سے آگے بڑھالے جاتے ہیں قاری ان کی فن پر گرفت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ انہوں نے مغربی معاشرے میں عورت کو دیے جانے والے آزادی اور حقوق کے فریب کے پردے کو چاک کرنے میں اپنی نثر میں خاصا کام کیا ہے۔ جو نہ صرف ان کی یورپی سماج کے بارے میں معلومات کی عکاسی کرتا ہے بلکہ وہاں کے سماج کے گہرے مشاہدے کو بھی سامنے لاتا ہے۔

سماج کا دوسرا اہم عنصر بزرگ طبقہ ہے۔ یہ سماج کا ایسا طبقہ ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی ایام سماج کی بہتری کے لیے صرف کر دیے ہوتے ہیں اور اب بڑھاپے میں پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ بڑھاپے میں ان کو اس سماج کی ضرورت ہوتی ہے جس کے لیے انہوں نے اپنی توانائیاں اور زندگی کے قیمتی لمحات خرچ کیے ہوتے ہیں۔ انگریزی سماج میں فرد کی حیثیت محض اقتصادی بہتری کی حد تک ہے۔ جو انسان جب تک کام کرتا ہے اور سماج کو معاشی حوالے سے مستحکم کرنے میں اپنا حصہ ڈالتا رہتا ہے سماج بھی اسی وقت تک اسے قبول کرتا ہے لیکن جونہی وہ خود کام کاج کرنے کے قابل نہیں رہتا اسے سماج پر ایک ایک بوجھ قرار دے دیا جاتا ہے۔ اس کے تجربات، مشاہدات او دیگر امور جن سے سماج نے ارتقائی مراحل طے کیے وہ سب غارت چلے جاتے ہیں اور انہیں گھر سے نکال کر اولڈ پیپلز ہوم میں داخل کروا دیا جاتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی نے اولڈ پیپلز ہوم اور سینئر سیٹیزن کے انگریزی الفاظ ان بزرگ لوگوں کی عکاسی کرتے وقت کئی جگہوں پر استعمال کیے ہیں۔ انگریزی سماج میں بوڑھے لوگوں جن کو ان کی زبان میں سینئر سیٹیزن کہا جاتا ہے ان کی ناقدری کے حوالے سے عطاء الحق قاسمی کے قلم کی کاٹ نے اس معاشرے کی اخلاقی پستی کو بڑی چابکدستی سے نمایاں کیا ہے۔ انہوں نے ان بزرگوں کے جذبات کی عکاسی کی ہے جن کی ضرورت محض اس وقت تک ہی ہوتی ہے جب تک وہ معاشرے اور گھر کی آمدنی میں اضافے کے لیے کام کرنے کے

اہل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد وہی معاشرے اور گھر والوں کے ایک فضول قسم کی چیز بن جاتے ہیں جسے وہ اپنے پاس رکھنا یا ان کی خدمت کرنا گوارا نہیں کرتے۔ انہیں " اولڈ پیپلز ہوم" میں داخل کروا دیا جاتا ہے جہاں وہ اپنی زندگی کے باقی دن اپنی اولاد اور رشتہ داروں کے بغیر گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس امر کی عکاسی عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے اردو نثر لکھتے ہوئے بھی ان بزرگوں کے حوالے سے قائم کیے گئے اولڈ پیپلز ہوم کو انگریزی لفظیات میں ہی بیان کیا ہے اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس سماج میں ان قیام گاہوں کے لیے یہی لفظ استعمال ہوتا ہے اور یہ لفظ ان قیام گاہوں کی پہچان بن گیا ہے۔ اس کا استعمال کرنے سے اس سماج کی حقیقی عکاسی ہوتی ہے۔ اور ان قیام گاہوں کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ اگر "اولڈ پیپلز ہوم" کی جگہ "قیام گاہ برائے بزرگ شہری" کے الفاظ استعمال کیے جائیں تو لسانی حوالے سے کوئی خاص فرق نہ بھی پڑے سماج اور ثقافت کی عکاسی میں ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہونے کا خدشہ ضرور سر اٹھاتا نظر آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ " اولڈ پیپلز ہوم" کی لفظیات انگریزی کے ساتھ ساتھ اب اردو میں بھی رائج ہو چکی ہے۔ سکول، کورٹ، مارکیٹ، گراؤنڈ اور دیگر بہت سی جگہوں کو بیان کرنے کے لیے جس طرح انگریزی لفظیات اردو میں اپنا مفہوم اس انداز میں واضح کرتی ہیں کہ اردو دان طبقہ اور اردو سماج کے لیے ان کے استعمال سے ابلاغ کے مسائل پیدا نہیں ہوتے اسی طرح "اولڈ پیپلز ہوم" کا استعمال بھی اردو میں تواتر کے ساتھ ہونے کی وجہ سے اردو نثر میں اس کے استعمال سے ابلاغ کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ قیام گاہیں یورپ اور مغربی ممالک کی اختراع ہیں اور وہاں ہی ان کا چلن عام ہے اس لیے اسی زبان کی لفظیات کا استعمال تحریر کو حقیقت کے قریب لے جانے میں مدد فراہم کرتا ہے۔

"اولڈ پیپلز ہوم" کی طرح بزرگوں کی عکاسی کے لیے "سینئر سیٹیزن" کی لفظیات بھی قاسمی کی تحریروں میں عام ملتی ہیں۔ انہوں نے یہ لفظیات ان لوگوں کے لیے اس وقت استعمال کی ہیں جب انگریزی سماج کے کسی شخص سے مکالمے کی صورت پیدا ہوئی اور انہوں نے اس کی زبان میں ہی مکالمہ ادا کروایا یا پھر ان بزرگ لوگوں کے لیے مختص کی جانے والی سہولیات کا جہاں ذکر کیا تو وہاں انہوں نے اس سماج اور اس میں ملنے والی بزرگوں کی سہولیات کے تذکرے کے لیے اس اصطلاح کا استعمال کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے ملک یا دوسرے سماج کی عکاسی کرتے وقت تحریر میں زبان کے استعمال کی باریکیوں سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ یہ زبان پر ان کی گرفت کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ جس سماج کی بات کر رہے ہوتے اس کی لفظیات کو اس قدر خوب صورتی سے تحریر میں سموتے ہیں کہ وہ ان کی اپنی زبان کی لفظیات ہی بن کر رہ جاتی ہیں۔

غیر جانبدارانہ تجزیہ اور مشاہدہ اور پھر نتائج کو انتہائی غیر جانب دارانہ انداز میں بیان کرنا خاصا مشکل کام تو ضرور ہے لیکن جب کوئی ادیب اس وصف کو اختیار کر لیتا ہے تو نہ صرف اس کی تحریر میں جان پڑ جاتی ہے بلکہ اس کی تحریر حقیقی معنوں میں سماج، سیاست اور ثقافت کے تمام پہلوؤں کو سامنے لانے میں کامیاب نظر آنے لگتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اگر ادیب تعصب کی عینک چڑھا کر سماج اور سیاست کو دیکھے گا تو اسے ہر سماج میں بہت سی برائیاں اور لغزشیں نظر آئیں گی اور وہ انہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھے گا جب کہ اس سماج میں ان برائیوں اور لغزشوں کے ساتھ ساتھ بہت سی اچھائیاں اور مستحسن امور بھی لازمی شامل ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ہی وہ سماج کھڑا اور ارتقائی مراحل طے کر رہا ہوتا ہے۔ ایک غیر متعصب ادیب ہی ان اچھائیوں اور مفید کاموں کو سامنے لانے کا جتن کر سکتا ہے۔

نتائج

اس تحقیقی مقالے میں عطاء الحق قاسمی کی اردو نثر میں استعمال ہونے والی پنجابی اور انگریزی لفظیات کو سماج، ثقافت اور اسلوب کے تناظر میں دیکھنے کے بعد یہ نتائج سامنے آئے ہیں کہ:

ا۔ انگریزی معاشرے کی عکاسی کرتے ہوئے قاسمی صاحب کا انداز یہ ہے وہ مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو سامنے لائے ہیں۔ اس حوالے سے ہم مذہب اور مذہب سے وابستگی کی مثال پیش کر سکتے ہیں۔ کہ انگریزی معاشرے میں اس حوالے مثبت اور منفی دونوں رویے پائے جاتے ہیں۔ مذہب سے دوری اختیار کرنے والے لوگوں کی تعداد بھی خاصی زیادہ ہے تو مذہب سے گہر الگاؤ رکھنے والے بھی کم نہیں ہیں۔ عام طور پر ہمارے سامنے مغرب کا جو نقشہ پیش کیا جاتا ہے اس میں مغرب کو انتہائی مذہب بے زار اور فحاشی و عریانی کی لت میں ڈوبے ہوئے سماج کا نقشہ پیش کیا جاتا ہے۔ لیکنیہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہاں بھی مذہب سے گہر الگاؤ رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ اس ضمن میں صرف مذہب اسلام کے پیروکاروں کو ہی دیکھیں تو وہاں دو صورتیں نظر آتی ہیں۔ ایک صورت میں وہ مسلمان نسل ہے جو خود مذہب کی پیروکار ہے اور مذہبی اقدار پر کاربند ہے تو دوسری نسل وہ ہے جو مذہب سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ اس دوسری نسل میں بھی بعض وہ لوگ ہیں جو گھر میں مذہب سے وابستگی کا عملی نمونہ دیکھتے ہیں اور اس کی طرف راغب ہوتے ہیں، جب وہ سماج میں نکلتے ہیں تو سماج میں پائی جانے والی مثبت اقدار بھی ان کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہیں اور یوں ان کی شخصیت کی

تکمیل بڑے مستحسن انداز میں ہوتی چلی جاتی ہے۔جب کہ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو مذہب سے دور ہیں۔

۲۔ مذہب سے دوری انسان کو بے حیائی اور بدکاری کے قریب کر دیتی ہے ۔یہی وجہ ہے کہ مغربی معاشرے میں دو طرح کے لوگ سامنے آنے لگتے ہیں ۔ ایک وہ جو عورت کے وجود کو اپنی جنسی تسکین کی خاطر استعمال کرتے ہیں اور دوسری وہ عورتیں جو اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دوسرے کا ہاتھوں اپنا استحصال کروانے پر مجبور ہیں ۔عطاء الحق قاسمی نے ان دونوں طرح کے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی معاشرہ میں اشیا کی قدر بڑھ جانے سے انسان کی قدر کم ہوتے ہوتے ختم ہونے تک پہنچ گئی ہے اور انسان سمجھ بھی نہیں پارہا کہ وہ اپنی ذات کی نفی کر کے، خود کو مٹا کر جو یہ مادی اشیا حاصل کرنے کی دوڑ میں لگا ہے اس کا مقصد کیا ہے۔انسان اپنی پہچان بھول گیا ہے۔وہ دوسروں کے ہاتھوں آلہ کار بن گیا ہے اور محض اشیا کے حصول کی خاطر اس نے اپنا ذہن اور اپنی فکر تک دوسروں کی غلام بنادی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جوان لڑکیاں جو خوب صورتی اور دلربائی کا نمونہ ہیں وہ اپنے اس حسن کو بوڑھے امیروں کے سامنے پیش کرنے پر آمادہ ہیں تاکہ اشیا کے حصول کی خاطر کسی دوسرے کا محتاج نہ ہونا پڑے۔اخباروں رسالوں کے لیے اپنے حسن کی نمائش کی جارہی ہے تاکہ اشیا کا حصول ممکن ہوسکے۔یوں معلوم ہوتا ہے کہ انگریزی معاشرے میں مادیت پرستی کا جادو چڑھ کر بول رہا ہے اور اسی مادیت پرستی نے اخلاقی اور روحانی طور پر اس معاشرے کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ آج وہاں مادیت کے ڈسے لوگ ذہنی تسکین کے متلاشی ہیں لیکن انہیں ذہنی سکون میسر نہیں۔ہر آنے والا دن ان کے لیے مادیت کے عفریت کو طاقت ور بنانے کے ساتھ ساتھ ذہنی سکون اور روحانی تسکین سے دوری کا دن ثابت ہو رہا ہے۔عطاء الحق قاسمی نے اپنے اسفار کے دوران میں یورپی معاشرے کے اس مادیت پرستی کے پہلو پر خاص نگاہ ڈالی ہے اور گہرے مشاہدے کے ذریعے انھوں نے اس امر کو واضح کیا ہے کہ یورپی معاشرے میں انسان کی قدرو منزلت مادی اشیا کے حصول کے حوالے سے ہے۔

۳۔ مغرب میں جنسی تسکین کا سامان کرنا وہاں ایک اہم صنعت کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔نام نہاد روشن خیالی اور سیکولرازم کا پرچار کرنے والوں نے عورت کو گھر کی چاردیواری سے حقوق کا لالچ اور خواب دکھا کر نکالا اور اسے ہر جگہ استعمال کیا۔یوں جنس کا کاروبار ترقی کرتا چلا گیا اور اس کاروبار میں نت

نئے انداز اور نئی نئی چیزیں سامنے آتی گئیں۔ آج جنسی کاروبار یورپ میں ایک اہم کاروبار کا درجہ حاصل کر چکا ہے وہاں عورت سے لے کر فیکٹریوں میں پلاسٹک کے جنسی اعضا کی تیاری تک، عورت کی عریانی سے لے کر دوسروں سے مالی مفاد کے حصول کے لیے اپنا آپ ان کے سپرد کر دینے تک ہر جگہ اس جنسی کاروبار نے اپنے آپ کو مضبوط کیا ہوا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے انگریزی لفظیات کے استعمال سے اس کاروبار کی بھی عکاسیوں کی ہے کہ تحریر میں کسی حد تک طنز کے عناصر بھی پیدا ہو گئے ہیں۔

۴۔ صنعتی معاشرے میں انسان کی صلاحیتوں کا سب سے زیادہ ضیاع ہوتا ہے۔ ایسے ایسے قابل انسان محض مشینی پرزے بن کر رہ جاتے ہیں جن کو اگر زندگی موقع اور وسائل فراہم کرتی تو وہ معاشرے کے لیے بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن وسائل سرمایہ دار کے ہاتھ میں جانے سے ترقی کے مواقع بھی اسی کے پاس سمٹ کر رہ گئے اور انسان سرمایہ دار کے غلام بنتے چلے گئے۔ یورپی اور دیگر انگریزی معاشروں میں ہونے والی صنعتی ترقی نے بھی انسان کے ساتھ ایسا ہی کھیل کھیلا کہ وسائل چند ہاتھوں میں رہ گئے اور انسانوں کی اکثریت ان سرمایہ داروں کے لگائے گئے سرمائے اور ان کی مشینوں کے غلام بن کر رہ گئے۔ انگریزی صنعتی معاشرے میں انسانوں کی جگہ مشینوں کی افادیت بڑھی تو انسانوں میں احساس مروت نے دم توڑنا شروع کر دیا اور نتیجہ یہاں تک پہنچ گیا انسان محض مشینوں کے لیے ہی رہ گیا اور انسان کو معاشرہ کا مفید رکن اسی وقت تک مانا جاتا ہے جب تک وہ ان مشینوں کو حرکت دینے کے قابل رہتا ہے اور ان کے ساتھ ایک پرزے کی طرح چلتا رہتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے انسانیت کی اس تذلیل کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔ اپنے اسفار اور بیرون ممالک میں مختلف فرائض کی بجا آوری کے لیے اپنے وہاں قیام کے دوران انھوں وہاں کی صنعتی ترقی اور اس صنعتی ترقی میں انسان کی اہمیت کا عمیق مشاہدہ کیا تھا۔ انھیں اس بات کا ادراک ہو گیا تھا انگریزی معاشرہ مالی مفادات کے حصول پر قائم ہے اور مشینیں جو کہ مالی مفاد کے حصول کا ایک اہم ذریعہ ہیں ان کی اہمیت اس معاشرے میں انسانوں سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسری بات یہ ہے کہ اس معاشرے میں بعض بچے اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ بھی وہاں کی مشینی دوڑ ہے جس میں پڑ کر وہاں والدین جو مشرق سے حصول زر کی خاطر گئے ہوتے ہیں اس مصروف اور مشینی معاشرے میں دن رات ان کی مصروفیت اس حد تک بڑھی ہوتی ہے کہ وہ خود

بھی اسلامی شعائر سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں یوں وہاں کا ماحول ان والدین کو بھی مشینی پرزوں کی طرح بنا کر رکھ دیتا ہے، کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت کا حصول جب ان کا مطمع نظر ٹھہرتا ہے تو دین سے رغبت کم ہوتی چلی جاتی ہے اور آخر ان کی اولاد ان کے ہاتھ سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ یہی اولاد جب اس مادر پدر آزاد معاشرے میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو ہر طرف پھیلی جنس اور پیسے کی چکا چوند میں اس حد تک محو ہو جاتی ہے کہ اپنی اقدار اور روایات سے دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ اب یہ نسل جو خود اپنی اقدار سے دور ہو رہی ہے وہ ان اقدار کو اگلی نسل میں کیسے منتقل کرے گی اس بارے میں وہاں منتقل ہونے والی نسل جو اچھے مستقبل کے خواب آنکھوں میں سجائے وہاں منتقل ہوئی تھی وہ بھی پریشان ہے اسی پریشانی کو عطاء الحق قاسمی نے اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ ان کی تحریروں کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ وہ نہ صرف یورپی معاشرے میں مسلمانوں کی موجودہ صورت حال سے آگاہی رکھتے ہیں بلکہ اس معاشرے میں اسلامی اخلاقی اقدار اور روایات کے مستقبل کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ جہاں ایک طرف اس امر پر مطمئن نظر آتے ہیں کہ وہاں مسلمان کمیونٹی مساجد اور دیگر اسلامی مراکز کی تعمیر میں سنجیدہ کوششیں کر رہی ہیں جس سے اسلامی اقدار کے احیا میں معاونت مل رہی ہے وہاں وہ اس بات کا خدشہ بھی ظاہر کر رہے ہیں کہ وہاں پیدا ہونے والی مسلمان نسل کو اگر صحیح معنوں میں اپنی اقدار سے آگاہ نہ کیا گیا اور انھیں اپنی روایات پر کاربند نہ رکھا گیا تو وہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک غلط مثال بھی بن سکتی ہیں۔ جو اپنی ثقافت اور تہذیب سے دوری کے ساتھ ساتھ بنیادی انسانی اقدار سے بھی دوری کا سبب بن سکتی ہے۔ اسی طرح وہاں کے ثقافتی مظاہر اور ان میں تبدیلی اور نئی مسلمان نسل کے دوسری ثقافتوں میں پڑ کر اپنی شاندار ثقافتی روایات اور اخلاقی اقدار سے دور ہونے کا بیان کرتے وقت بھی وہ تصویر کے دونوں رخ دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ یہ ان کی اسی غیر جانب داری کا نتیجہ ہے جو وہ مشاہدے اور تجزیے کے دوران میں اختیار کرتے ہیں اور پھر اپنی تحریروں میں بھی تعصب اور جانب داری سے ماورا ہو کر بیان کرتے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں حقیقت سے قریب ہونے کا عنصر نمایاں ہو کر سامنے آنے لگتا ہے۔ یہی غیر جانب داری انہیں اپنے معاصرین میں ادبی حوالے سے اہم مقام و مرتبہ عطا کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے سفر ناموں کے دوران اپنے قارئین کو مغربی معاشرے کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے روشناس کروایا ہے۔

۵۔ انگریزی سماج کی زبوں حالی کا بیان کرتے وقت عطاء الحق قاسمی نے اپنی تحریروں میں وہاں کے مختلف اداروں اور خاص طور پر ذرائع ابلاغ کی کارستانیوں کو بھی نمایاں کیا ہے کس طرح وہاں ذرائع ابلاغ لوگوں کو ذہنی طور پر مفلوج کرتے چلے جا رہے ہیں۔ وہاں کے انسان کا جسم تو مشینوں کا غلام ہو کر رہ گیا ہی ہے ان کے ذہن ذرائع ابلاغ نے فتح کر لیے ہیں اور سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں ذرائع ابلاغ کے رحم و کرم پر آگئی ہیں۔ ذرائع ابلاغ جو دکھاتے اور بتاتے ہیں اس سماج کے باشندے اسی پر یقین لانے اور اس کے مطابق اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کرنے پر مجبور ہیں یوں جسمانی غلامی کے ساتھ ساتھ ذہنی غلامی بھی اس سماج کے باشندوں کا مقدر بن چکی ہے۔ اس ذہنی غلامی کا شکار صرف وہاں کے مقامی باشندے ہی نہیں بنے بلکہ پاکستان سے وہاں جانے والے لوگ بھی شکار ہوئے ہیں۔ حقیقت کی آنکھ سے دیکھا جائے تو یہ غلامی ہی وہ طوق ہے جسے آزادی حاصل کرنے کے بعد بھی پاکستان سماج کے بعض لوگ اپنے گلوں سے اتار نہیں پا رہے اور مغرب کی ظاہری چکا چوند سے متاثر ہو کر وہاں جا بسنے یا روزگار حاصل کرنے کے لیے وہاں جانے پر اصرار کرتے ہیں۔ اور وہاں جا کر اپنا تشخص بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ اس المیے کا اظہار بھی قاسمی صاحب کی تحریروں میں ملتا ہے۔

٦۔ عطاء الحق قاسمی نے معاشرے کی سماجی صورت حال کی اس ابتری کو بڑے بہترین انداز میں پیش کیا ہے کہ یورپی سماج کا "چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر" ہے۔ اور یہ لوگ ایک طرف تو سماجی ترقی اور آزادی نسواں کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں تو دوسری طرف ان کے ہاں انسانیت حقیقی خوشیوں کے لیے سسکتی نظر آتی ہے یوں یورپی سماج ابتری کی آخری حدوں کو چھوتا نظر آتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی نے سماج کی اس صورت حال کو ہی بیان نہیں کیا بلکہ انہوں نے سماج کی ابتری میں کردار ادا کرنے والے عناصر کو بھی نمایاں کیا ہے اور اس سارے عمل کے دوران میں انہوں نے انگریزی لفظیات کا استعمال بڑے خوب صورت انداز میں کیا ہے۔ یوں انگریزی لفظیات کے استعمال اور انگریزی سیاست، سماج اور فنون لطیفہ کی عکاسی قاسمی صاحب کی تحریروں میں بڑے ماہرانہ انداز میں کی گئی ہے۔

۷۔ عطاء الحق قاسمی کی اردو نثر میں پنجابی لفظیات کا استعمال پنجاب کے سماجی اور ثقافتی اور تناظر میں خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں پنجاب میں بسنے والی مختلف اقوام کے رویوں، ان کے رسم و رواج اور ان کی سماجی و اخلاقی اقدار کو پنجابی لفظیات کے ذریعے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ پنجابی لفظیات کے

استعمال سے ان کی تحریر پنجاب کے لسانی ماحول کے قریب ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ پنجابی لفظیات کا استعمال ان کی نثر میں شگفتگی بھی پیدا کرتا ہے۔

۸۔ سماجی اور ثقافتی تناظر کے ساتھ ساتھ عطاءالحق قاسمی کی تحریروں میں استعمال ہونے والی پنجابی اور انگریزی لفظیات کا فنی تناظر بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ فن پر ان کی گرفت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اردو میں دیگر زبانوں کی لفظیات استعمال کرنے کے باوجود ان کے ہاں کہیں بھی ابلاغ کے مسائل پیدا نہیں ہونے پائے بلکہ انہوں نے دیگر زبانوں کی لفظیات کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ وہ اردو کی لفظیات کے بہترین متبادل بنتے نظر آتے ہیں۔

اسلوب کسی بھی تحریر کا جاندار بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔اسلوب کے حوالے سے دیکھا جائے تو پنجابی اور انگریزی زبان کی لفظیات کے استعمال کے باوجود عطاءالحق قاسمی کی اردو نثر کا اسلوب شستہ اور رواں ہے اور اس میں کہیں بھی قاری کو قرات کے حوالے سے مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ انہوں نے اسلوب میں قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے بہت سے روایتی حیلے بھی استعمال کیے ہیں۔ تشبیہات ، استعارات، محاورات وغیرہ کا استعمال بڑی خوبصورتی سے اور بڑے برمحل انداز میں ان کے ہاں ملتا ہے۔ ان کی تحریریں فکری بالیدگی کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے بھی اردو کے اسلوب میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ انہوں نے تشبیہات کا استعمال کرتے وقت ایسی تشبیہات استعمال کی ہیں جو صورت حال کو نمایاں کرنے اور قاری کو حقیقت کے قریب لے جانے کے ساتھ ساتھ تحریر میں دلکشی اور جاذبیت بھی پیدا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ تشبیہات کا استعمال کرتے وقت تک وہ تشبیہ کے جملہ لوازمات کو بھی مدنظر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ جس کام یا جس چیز کے لیے تشبیہ استعمال کر رہے ہوتے ہیں ان کی تشبیہ اس کو بخوبی واضح کرتی ہے۔ استعارات کے استعمال میں بھی ان کے ہاں فن پر خاصی گرفت نظر آتی ہے۔ انہوں نے استعارات عام فہم استعمال کیے ہیں۔ ادق اور بوجھل استعاروں کے استعمال سے تحریر کو بارعب بنانے کی بجائے روزمرہ کی بول چال کے استعارات سے اپنی تحریر کو مزین کیا ہے۔

۹۔ محاورہ جہاں کسی تحریر کی جان ہوتا ہے وہاں اس کا استعمال بھی خاص مہارت کا متقاضی ہوتا ہے۔ کسی بھی تخلیق کار کے لیے اپنی تحریر میں کسی محاورے کا برمحل استعمال کرنا خاصا محنت طلب کام ہوتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ محاورہ مجازی معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تخلیق کار کو محاورہ استعمال

کرتے وقت صورت حال اور محاورہ کے مجازی معنوں میں ایک خاص ربط تلاش کرنا ہوتا ورنہ محاورہ کا ذرا سا بھی غلط استعمال پوری تحریر کو صوری اور معنوی دونوں حوالوں سے متاثر کر سکتا ہے۔ عطاء الحق قاسمی کی فنی مہارت کا ثبوت ان کے ہاں تحریر میں محاورات کے استعمال سے بھی ملتا ہے، انہوں نے محاورات کے ساتھ ساتھ دیگر فنی حربوں کو استعمال کرتے وقت سماجی اور ثقافتی تناظرات اور ان کے وسیع معنوی تناظر کو بھی سامنے رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں تحریر میں فن کی پختگی نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فکری اور موضوعاتی حوالے سے اعلیٰ درجے کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ فنی حوالے سے بھی ان کے ہاں فن پر گرفت خاصی مظبوط ہے اور وہ نثر کے جملہ تقاضوں پر پورا اترنے میں کافی حد تک کامیاب رہے ہیں۔

سفارشات

اس مقالے کی تیاری کے دوران موضوع پر توجہ مرکوز رکھی گئی۔ دوران تحقیقیہ بات سامنے آئے کہ اس موضوع کے علاوہ بھی عطاء الحق قاسمی کی تحریریں مختلف سماجی اور سیاسی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں جن کا کھوج لگانا ضروری ہے۔ اس ضمن میں درج ذیل سفارشات پیش کی جاتی ہیں۔

ا۔ عطاء الحق قاسمی ایک ہمہ جہت قلم کار ہیں۔ انہوں نے مختلف ادبی جہات میں خامہ فرسائی کی ہے۔ جہاں ان کے ہاں اصناف ادب کے حوالے سے مختلف اصناف ادب میں تخلیق کاری کا رجحان پایا جاتا ہے وہیں ان کے ہاں موضوعاتی حوالے سے بھی خاصا تنوع پایا جاتا ہے۔ انہوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن سب کا اس تحقیقی مقالے کے موضوع کی حدود میں احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ دوران تحقیقیہ بات سامنے آئی ہے کہ اس مقالے کے موضوع کے علاوہ بھی عطاء الحق قاسمی کی بہت سے ادبی جہات ایسی ہیں جن پر تحقیقی کام ہو سکتا ہے۔ اس مقالے میں راقم نے حتیالوسع ان کی متفرق ادبی جہات کو تحقیقی و تنقیدی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے تاہم توجہ کا مرکز مقالے کا موضوع اور اس کی حدود ہی رہی ہیں جو ظاہر عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں پنجابی اور انگریزی لفظیات کے سماجی، ثقافتی اور فنی تناظرات کے حوالے سے ہی ہے۔ اس امر کی سفارشات پیش کی جاتی ہیں کہ عطاء الحق قاسمی کے فن اور شخصیت کے حوالے سے مختلف تحقیقی و تنقیدی موضوعات کے ضمن میں مزید کام کروایا جائے، اس ضمن میں راقم کا یہ تحقیقی مقالہ مزید تحقیقی و تنقیدی کام کے کئی دروازے کھولنے کا سبب بن سکتا ہے۔

۲۔ عطاء الحق قاسمی کی تحریروں میں عالمی سماجی صورت حال کے تناظر میں تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ اس میں مختلف ممالک کی سماجی اقدار اور ان میں بسنے والی مختلف اقوام کے انفرادی رویوں کی عکاسی پر تحقیقی کام کرایا جاسکتا ہے۔

۳۔ عالمی کساد بازاری اس وقت دنیا میں عام ہو چکی۔ عطاء الحق قاسمی کی نثری تحریروں میں انھوں اس کی بھی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اس ضمن میں بھی تحقیقی کام کی ضرورت ہے۔ جس سے واضح ہو سکے کہ موجودہ دور میں عالمی کساد بازاری کی نوعیت اور حربے کیا ہیں اور قاسمی صاحب نے اسے کس طرح اپنی تحریروں میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

4 ۔ اخلاقی اقدار کی پامالی مشرق اور مغرب دونوں کے سماج کا وطیرہ بن چکا ہے۔ اقدار کے نام پر موجودہ زمانے میں بہت سی خرافات بھی سماج کا حصہ بنتی جا رہی ہیں۔ اس ضمن میں ایک طنز اور مزاح نگار کے طور پر قاسمی صاحب کی تحریروں میں خاصا مواد موجود ہے۔ اس حوالے سے ایک الگ مقالہ تحریر کرایا جائے۔

۵۔ مغرب و مشرق کے امتزاج سے پروان چڑھنے والی نئی نسل کے مسائل اور دیگر بہت سے موضوعات پر الگ الگ مقالہ جات کی صورت میں تحقیقی و تنقیدی کام کروائے جاسکتے ہیں جن سے عطاء الحق قاسمی کی شخصیت اور فکر و فن کے مزید کئی پہلو سامنے آسکتے ہیں۔

کتابیات

بنیادی مآخذ

عطاء الحق قاسمی، بلبلے، مشمولہ مجموعہ، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴

عطاء الحق قاسمی، شوق آوارگی، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۲

عطاء الحق قاسمی، عطایئے، مشمولہ مجموعہ۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴

عطاء الحق قاسمی، گوروں کے دیس میں، مشمولہ، سفر نامے۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۵

عطاء الحق قاسمی، ہنسنا رونا منع ہے، مشمولہ مجموعہ،۔ اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۲۰۱۴

عطاء الحق قاسمی، بارہ سنگھے،۔ لاہور: نستعلیق، مطبوعات، اشاعت دہم، ۲۰۰۹

عطاء الحق قاسمی، شر۔ گوشیاں۔ لاہور: نستعلیق، مطبوعات، اشاعت ہشتم، ۲۰۱۲

عطاء الحق قاسمی، سفر نامے، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، جولائی ۲۰۱۵

عطاء الحق قاسمی، ہر فن مولا (ڈراما)، تدوین و تسوید، ڈاکٹر ثوبیہ نسیم۔ لاہور، سنگ میل پبلیکیشنز، ۲۰۱۵

عطاء الحق قاسمی، روزنِ دیوار سے، لاہور، نستعلیق مطبوعات، ۲۰۱۳

ثانوی مآخذ

ازہر منیر، یہ نصف صدی کا قصہ ہے۔ لاہور: تخلیقات، مارچ ۱۹۹۳

اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، عطاء الحق قاسمی شخصیت اور فن۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۰

انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، گلہائے تبسم۔ اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹

انور سدید، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر تاریخ، لاہور: عزیز بک ڈپو، طبع سوم ۱۹۹۸

پروین شاکر، انکار۔ جہانگیر بک ڈپو لاہور، س ن۔

جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد اول۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۔ طبع ہفتم، ۲۰۰۸

خلیل صدیقی لسانی مباحث۔ کوئٹہ: زمرد پبلی کیشنز، س۔ ن

خلیل صدیقی، زبان کا مطالعہ، مستونگ: قلات پبلشرز، ۱۹۲۴ء

رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری۔ لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۹۵۲

سجاد نقوی، سید۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین (مرتبہ)، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۹۵

سردار محمد خان، مؤلف، پنجابی اردو ڈکشنری، لاہور، سچل سٹوڈیو پاکستانی پنجابی ادبی ایوارڈ، ۲۰۰۹
سرسید احمد خان۔ مقالات سرسید، لاہور: مجلس ترقی ادب ۱۹۶۳
سکندر حیات میکن، شگفتہ مسافر۔ عطا الحق قاسمی۔ سرگودھا: لاہور بکس ظفر اللہ چوک، ۲۰۱۲
سلیم احمد۔ مضامین سلیم احمد [مرتب: جمال پانی پتی]، کراچی: اکادمی بازیافت، جنوری ۲۰۰۹
سلیم احمد۔ کلیات سلیم احمد، کراچی: رنگ ادب پبلی کیشنز، ۲۰۱۵
سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو زبان کیا ہے۔ لاہور: سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۳
سلیم اختر، ڈاکٹر۔ تنقیدی اصطلاحات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۱
سلیم حسن مرزا۔ کیمرے کے روبرو۔ راولپنڈی: نقش گر، جنوری ۲۰۱۰
سلیم کوثر۔ جنھیں راستے میں خبر ہوئی، کراچی: الف ب ت بی ۱۲ الہلال سوسائٹی، ۲۰۱۷
سہیل بخاری، ڈاکٹر، اردو کی کہانی، لاہور: مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۵ء
سید عبداللہ، ڈاکٹر۔ ولی سے اقبال تک لاہور: سنگ میل، ۲۰۱۴
شرر، عبدالحلیم۔ لکھنؤ۔ لاہور: پرنٹ لائن پبلشرز، ۲۰۰۰
شکیل الرحمن، زبان اور کلچر، سری نگر: شاہین بک اسٹال، ۱۹۵۸ء
شوکت سبزواری، ڈاکٹر، اردو قواعد، کراچی: مکتبہ اسلوب، ۱۹۸۲ء
ظفر اقبال۔ اب تک، لاہور: ملٹی میڈیا افیئرز، ۲۰۱۲
ظفر علی خان، مولانا۔ خیالستان، لاہور: مولانا ظفر علی خان ٹرسٹ، مارچ ۲۰۱۳
عبادت بریلوی، ڈاکٹر۔ روایت کی اہمیت، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۳
عبادت بریلوی، ڈاکٹر۔ اردو تنقید کا ارتقاء، کراچی: انجمن ترقی اردو، ۲۰۱۵
عبدالحق، مولوی۔ چند ہم عصر، لاہور: علم و عرفان پبلشرز ۲۰۱۱
عبدالحق، مولوی۔ انتخابِ کلامِ میر، لاہور: علم و عرفان پبلشرز، نومبر ۲۰۱۱
عبدالحق، مولوی، ڈاکٹر۔ قواعد اردو۔ لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۵
عین الحق فرید کوٹی، اردو زبان کی قدیم تاریخ، لاہور: اورینٹ ریسرچ سنٹر، ۱۹۸۸
فقیر حسین ساگا، ڈاکٹر۔ پنجاب کے لوک رقص۔ لاہور: گورا پبلشرز، ۱۹۹۶
فوزیہ چودھری، ڈاکٹر۔ عطاء الحق قاسمی شاداب موسموں کی آواز۔ لاہور: نستعلیق پبلشرز، ۲۰۰۹
قرۃ العین حیدر۔ آگ کا دریا۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰

کلیم الدین احمد۔ اردو شاعری پر ایک نظر، لاہور: الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۶
کلیم الدین احمد۔ اردو تنقید پر ایک نظر، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۲
گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، اردو زبان اور لسانیات، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۷ء
گیان چند جین، ڈاکٹر، عام لسانیات، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۸۵ء
گیان چند جین، ڈاکٹر، لسانی رشتے، لاہور: مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۳ء
مالک رام۔ قدیم دلی کالج"، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو، ۲۰۱۱
مالک رام۔ قدیم دلی کالج۔ نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۲۰۱۱
محمد اشرف کمال، ڈاکٹر۔ اصطلاحات، کراچی: بک ٹائم، ۲۰۱۷
محمد اقبال۔ کلیات اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع ہفتم ۲۰۰۶
محمد جمیل احمد۔ اُردو شاعری کی مختصر تاریخ، لکھنؤ: نول کشور پریس، ۱۹۴۱
محمد باقر، ڈاکٹر۔ اُردوئے قدیم، دکن اور پنجاب میں، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲
محمود شیرانی، حافظ۔ پنجاب میں اُردو، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۸
مرزا خلیل احمد بیگ، ڈاکٹر، اردو کی لسانی تشکیل، علی گڑھ: فیصل ولا سر سید نگر، ۱۹۸۵ء
محی الدین زور، ڈاکٹر۔ سید، ہندوستانی لسانیات۔ لاہور: مکتبہ معین الادب، جنوری ۱۹۶۱
مودودی، ابواعلیٰ، اسلامی تہذیب، اس کے اصول اور مبادی، لاہور: اسلامک پبلیکیشنز، س ن
مولانا بہاء الحق قاسمی۔ تذکرہ اسلاف، بار دوم۔ لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۸ء)، اندرونی فلیپ۔
ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر۔ ۱۲۵۔ اہل قلم۔ لاہور: مقبول اکادمی، ۲۰۱۷
یاسر جواد۔ انسائیکلوپیڈیا ادبیات عالم۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۱۳

لغات

۱ فرہنگ آصفیہ۔ سید احمد دہلوی، لاہور: مشتاق بک کارنر، ۲۰۱۵
۲ فرہنگ تلفظ۔ شان الحق حقی، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۱۲
۳ نور اللغات۔ (دوئم)، نور الحسن، مولوی، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، طبع سوم، ۲۰۰۶

انگریزی لغات:

1. BBC English Dictionary, Harper Collins Publishers London, 1992
2. Blooms burry English Dictionary, Bloomsbury publishing Plc., London, 2nd Ed, 2004.
3. Gem Practical Dictionary, Urdu o English, 21st Century Edition, Azhar Publication, Lahore.
4. Oxford English Urdu Dictionary, Shanl Haq Haqqee, Oxford University Press, Karachi, 2003.
5. The concise oxford Dictionary of Current English Edited by J. B. Sykes. 7th Edition OUP New York 1982

ضمیمہ:

عطاء الحق قاسمی سے مصاحبہ

سوال نمبرا: آپ نے مختلف ممالک کے سفر کیے۔ ان میں سے زیادہ تر آپ نے سرکاری فرائض کی انجام دہی یا مختلف کمپنیوں کی دعوت پر کیے۔ آپ اس بارے کیا فرماتے ہیں کہ ایک سیاح جس طرح سماج کی گہرائی میں اتر کر مشاہدہ کرتا ہے آپ دیگر مصروفیات کے ساتھ ایسا مشاہدہ کر پائے ہیں؟

عطاالحق قاسمی: پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ کا سفر کس نوعیت کا ہوتا ہے۔ آپ کو سب سے زیادہ اپنے اسی مقصد کو دیکھنا ہوتا ہے جو اس سفر کا سبب بنا ہوتا ہے۔ تو جہاں تک میرے اسفار کا تعلق ہے تو میں نے مختلف کمپنیوں اور سرکاری فرائض کی انجام دہی کے لیے اسفار ضرور کیے ہیں لیکن میں نے خود کو ایک سیاح کے طور پر بھی ان اسفار میں شامل رکھا ہے۔ ویسے بھی بیرون کا سفر کوئی ایک آدھ دن کا تو ہوتا نہیں کہ آپ گئے اور کام کر کے شام کو واپس آ گئے۔ وہاں طویل عرصہ کے قیام کے دوران میں آپ کو بہت سے مواقع ملتے ہیں جن میں آپ صرف سیاح ہی بن کر گھوم پھر سکتے ہیں۔ میں نے ان مواقع سے خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ ایک سیاح کی نسبت مجھے وہاں کے سماج کو سمجھنے اور مشاہدہ کرنے کے زیادہ مواقع ملے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سماج کے آدمی سے لے کر وہاں کی اشرافیہ تک میری رسائی تھی۔ آپ کو دیکھ سکتے ہیں کہ میری تحریروں میں بیرون ممالک کے تمام طبقات کی عکاسی ہو رہی ہو گی۔ یہ عکاسی میری کوئی شعوری کاوش نہیں ہے بل کہ اس کے پیچھے وہی اسفار ہیں جو میں نے ان ممالک میں کیے اور سماج کے تمام طبقات کا مشاہدہ کیا۔ اس کے علاوہ سرکاری امور کی انجام دہی کے دوران میں بھی مجھے مختلف طبقات کے لوگوں سے ملنے اور ان کو جاننے کا موقع ملا۔ خاص طور پر سفارت کاری کے دوران میں لوگوں کے مسائل کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کے ایسے مواقع بھی ملے جو عام سیاح کو میسر نہیں ہوتے۔ ایک بات واضح کرتا جاوں کہ سیاحت صرف یہ ہی نہیں ہوتی کہ آپ اپنا بوریا بستر اٹھا کر چل پڑیں اور کسی صحرا یا گاوں میں ڈیرے لگا لیں، چار دن گھومیں پھریں وہاں بسنے والے لوگوں سے ملیں جلیں اور واپس آ کر سفر نامہ لکھ دیں۔ سیاحت میں جب آپ سماج کی بات کرتے ہیں تو سماج میں صرف معاشرے کے عام افراد ہی نہیں بل شہر میں بسنے والی اشرافیہ بھی تو سماج کا حصہ ہے اس تک رسائی بھی ضروری ہے اور مجھے یہ سب کچھ میسر تھا اس لیے میں تو یہی کہوں گا کہ میں نے بیرون ممالک کے سماج کا مشاہدہ ایک روایتی سیاح سے بھی زیادہ گہرائی سے کیا ہے۔

سوال نمبر۲: آپ کی نثر میں پنجابی زبان کے الفاظ کی شمولیت کا جواز تو بنتا ہے کہ آپ بنیادی طور پر پنجابی ہیں۔ لیکن انگریزی زبان کے الفاظ کا اس قدر زیادہ استعمال کیا آپ نے شعوری طور پر تحریر کو بارعب بنانے کے لیے کیا ہے یا آپ کی باڈی لینگو ئج بن چکی ہیں۔؟

عطاء الحق قاسمی: جو جواز آپ پیش کر رہے ہیں صرف یہ ہی نہیں ہو تا بل کہ زبان میں کسی دوسری زبان کے الفاظ کی شمولیت کے پس پردہ بہت محرکات ہوتے ہیں۔ آپ کا سماجی ماحول اثر انداز ہوتا ہے آپ کے گھر والوں کے بول چال کا بھی خاصا اثر ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ آپ جو کچھ پڑھتے ہیں اور جس حلقہ احباب میں رہتے ہیں یہ سب کچھ اثر انداز ہوتے ہیں اس لیے زبان کی تبدیلی محض علاقائی نسبت سے نہیں ہوتی۔ جہاں تک میری ادبی زبان کا تعلق ہے تو اس میں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے الفاظ کسی شعوری کوشش کے تحت شامل نہیں کیے گئے بل کہ اس عمل میں بھی ان تمام اسباب کا عمل دخل ہے جو ابھی میں نے بیان کیے ہیں۔ آپ کے سوال کو دیکھیں تو انگریزی کے حوالے سے یہ کہوں گا کہ میں نے انگریزی بھی پڑھی ہے اور انگریزی میں لکھا ہوا بھی بہت کچھ پڑھا ہے انگریزوں میں رہا بھی ہوں، اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے انگریزی سے خصوصی واسطہ بھی پڑتا رہا۔ سفارت کاری کے دوران میں تو اور بھی انگریزی سے لگاو بڑھا تو لازمی امر ہے ان کا سب کا اثر زبان پر لازمی پڑنا تھا اور پڑا بھی، یوں آپ اسے میری باڈی لینگوئج ہی قرار دے لیں۔

سوال نمبر۳: اگر یہ باڈی لینگوئج بن چکی ہے تو اس کا محرکات کیا ہیں؟

عطا الحق قاسمی: ابھی میں نے باتوں کا بیان کرنا چکا ہوں جو اس باڈی لینگوئج کے محرکات قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اصل میں زندگی کے لمحات گزارنے کے لیے آپ جس ماحول میں رہتے ہیں، جن لوگوں سے ملتے ہیں، جس سماج میں آپ پرورش پاتے ہیں۔ اور جن پیشہ ورانہ اموار کی انجام دہی آپ کے زمہ ہوتی ہے یہ سب انسان کے ذہن، اس کی فکر اور اس کی زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ ہر گز نہیں ہو سکتا کہ آپ نے جس زبان میں پڑھا لکھا ہو ساری عمر زبان خالص حالت میں آپ اختیار کیے رکھیں، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں تبدیلی آتی جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔

سوال نمبر۴ : آپ کیا سمجھتے ہیں کہ انگریزی زبان کے اس قدر زیادہ استعمال سے کیا اردو نثر متاثر نہیں ہو رہی جب کہ بیشتر الفاظ کے اردو متبادل نہ صرف موجود بلکہ مستعمل بھی ہیں۔

عطاالحق قاسمی: یہاں یہ دیکھنا ہوگا کہ متاثر کس حوالے سے ہو رہی ہے بات یہ ہے کہ زبان کوئی ٹھوس یا جامد شے تو ہے نہیں کہ جو ایک بار جس قالب میں ڈھل گئی اسی میں قائم رہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان ارتقائی مراحل طے کرتی چلی جاتی ہے۔ اس میں بہت سے نئے الفاظ دوسری زبانوں سے داخل ہوتے چلے جاتے ہیں اور بہت سے الفاظ متروک ہوتے جاتے ہیں۔ یہ کوئی بری بات بھی نہیں۔ ارتقا کا عمل ایسے ہی ہوتا ہے۔ آج ہمارے سامنے اردو کی جو صورت ہے وہ ابتدائی صورت سے خاصی مختلف ہے، یہی صورت حال انگریزی اور پنجابی میں بھی نظر آتی ہے۔ دوسری بات قارئین کی ہے۔ اگر زبان میں تبدیلی واقع ہو رہی ہوتی ہے۔ تو ساتھ اس زبان کے قارئین اور سامعین بھی اسی معاشرے کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اسی تبدیلی کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں اس لیے ان کے ہاں وہ زبان جس میں دیگر زبانوں کے الفاظ شامل ہو رہے ہوتے ہیں وہ کوئی ابلاغ کے مسائل پیدا نہیں کرتی۔ اب صورت حال یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ زبان کے الفاظ اور ان کے متبادلات دونوں سماج کے سامنے ہوتے ہیں، ان میں سے جو بھی زیادہ مستعمل ہو جاتا ہے وہ اس زبان میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس زبان کے قواعد میں ڈھل کر وہ اسی زبان کا لفظ شمار ہونے لگتا ہے۔ اس لیے اس بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزی کے الفاظ کی شمولیت اردو کو کسی منفی انداز میں متاثر کریں گے نہیں بل کہ یہ ارتقائی عمل ہر دور میں جاری رہا ہے اور زبان کے ارتقا کے لیے اسے جاری رہنا بھی چاہیے۔

سوال نمبر ۵: سیاحت کا شعبہ ترقی کی طرف جا رہا ہے انگریزی ممالک کے علاوہ ایران روزس سنگاپر اور دیگر بہت سے ممالک کی طرف بھی سیاح رخ کر رہے ہیں اور لازمی امر ہے ان میں کچھ سفر نامے بھی لکھے گئے آپ کیا سمجھتے ہیں ان ممالک میں میں بولی جانے والی زبانوں ان سفر ناموں پے پر سکتا ہے اگر پڑ سکتا ہے تو کس حد تک؟

عطاالحق قاسمی: یہ تو کسی صورت ممکن نہیں نہ کہ آپ کسی ملک کا سفر کریں اور سفر نامہ تحریر کریں تو اس ملک کی زبان اور سماج کو اگنور کر دیں۔ شعوری اور لاشعوری طور پر انہیں ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے رہی بات وہاں کی زبان کی اثرات تو ظاہری سی بات ہے۔ سفر نامہ نگار کی یہ مجبوری ہوتی ہے کہ وہاں کی سماجی حالات اور لوگوں کے سوچنے اور بیان کرنے کے انداز کو سامنے لانے کے لیے وہاں کی زبان کسی نہ کسی حد تک اختیار کرنا پڑتی ہے۔ ایسا کرنے سے ہی حقیقی تصویر سامنے لائی جا سکتی ہے لیکن اس کے اثرات اتنے زیادہ نہیں ہیں کہ اردو زبان کے بنیادی ڈھانچے کو ہی تبدیل کر دیں۔ دوسری طرف ایسے سفر ناموں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں کہ

ہمارے سماج کے تمام طبقیات میں پڑھے جا رہے ہوں۔ اس لیے یہی کہوں گا کہ سفر نامہ نگار دوسرے ممالک کی زبان کے الفاظ شامل تو ضرور کرے گا لیکن اس سے اردو کے زیادہ متاثر ہونے کے کوئی چانسز نہیں ہیں۔

سوال نمبر۶: انگریزی ثقافت مشرقی ثقافت سے مختلف تو ہے ہی آپ نے مختلف یورپی ممالک کے اسفار کیے ہیں۔ مختلف ممالک کی تہذیب و ثقافت کا بھی مشاہدہ کیا۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں ان انگریزی ممالک کے آپس میں ثقافتی اور تہذیبی اشتراکات کیا ہیں اور اختلافات کس نوعیت کے ہیں؟

عطاء الحق قاسمی: تہذیب و ثقافت مشرق کی ہو یا مغرب کی مختلف علاقوں میں اس کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ مشرق میں ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت دونوں مشرقی ممالک ہونے کے باوجود تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے حوالے سے قطبین پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہی صورت حال مغرب کی بھی ہے۔ چند بنیادی اقتدار کے علاوہ مغرب کی تہذیب و ثقافت میں بھی مختلف ممالک میں خاص اختلاف نظر آتا ہے۔

سوال نمبر۷: آپ کے خیال میں کس انگریزی ملک کی زبان کے اثرات اردو پر زیادہ پڑ رہے ہیں؟

عطاء الحق قاسمی: کسی بھی زبان پر کسی دوسری زبان کے اثرات پڑنے کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ ان میں آپ کا سماج، ثقافت اور اقتصادیات بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ کی دوسرے سماج کو اپنائیں گے اس سماج کی زبان بھی لازمی طور پر آپ کی زبان میں داخل ہوگی۔ اردو کے حوالے سے دیکھا جائے تو برصیغر کو اردو کا اصل گھر ہے اس پر سب سے زیادہ اثرات برطانیہ کے ہیں۔ انھوں نے یہاں حکومت کی، یہاں کی ثقافت اور سماجی اقدار کو بدلنے کی کوشش کی اور اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے تو تقسیم سے قبل بھی اردو پر برطانوی انگریزی کے اثرات واضح طور پر پڑ رہے تھے اب بھی یہی صورت حال ہے۔

سوال نمبر۸: عام مشاہدے کی بات ہے کہ مشرق سے بہت زیادہ لوگ حصول روزگار یا دیگر مصروفیات کی وجہ سے مغرب میں مقیم ہیں۔ آپ کو ان کے بارے میں جاننے کا اتفاق ہوا؟ کیا وہ مشرق اقدار پر کاربند ہیں یا انگریزی رنگ میں رنگے گئے ہیں؟

عطاء الحق قاسمی: ماحول کا بہت اثر ہوتا ہے۔ اور مغرب کا جو ماحول ہے وہ ظاہری چکا چوند کی بنا پر اچھوں کا بھٹکا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشرق کے لوگ اس ماحول میں جا اپنی اصل سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ خاص طور پر وہ لوگ جو اپنی فیملیز کے ساتھ وہاں مقیم ہیں ان کی آنے والی نسلوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ جلد از جلد واپس لوت آئیں۔ بعض لوگ اپنی مشرقی روایات و اقتدار کے پابند بھی ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہاں رہنے والے مشرق لوگوں کو دن رات جن لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے اور سماجی

رویے پروان چڑھتے ہیں وہ ان کے آنے والی نسلوں کے لیے کسی طور بھی سود مند نہیں ہیں۔ اس لیے میں تو یہی کہوں گا کہ مغرب کی ظاہری چکاچوند کو دیکھ کر اپنی نسلوں کو اپنی اقدار سے بے گانہ مت کیجیے۔

سوال نمبر۹: ان مشرقی لوگوں کی آنے والی نسلوں کے سامنے وہاں زبان کے حوالے سے دو باتیں ہیں ایک تو گھر میں بولی جانے والی مشرقی زبانیں دوسری معاشرے میں رائج انگریزی زبان، آپ کیا دیکھتے ہیں کہ آنے والی مشرقی نسل (جو مغرب میں مقیم ہے) زبان کے حوالے سے مسائل کا شکار نہیں ہو گی؟

عطاءالحق قاسمی: مادری زبان کے اثرات تو انسان پر سے ختم نہیں ہوتے لیکن جو صورت حال آپ یہاں بیان کر رہے ہیں اس میں یہ ہے کہ ان کے گھر کی زبان اور سماج کی زبان میں اختلافات ضرور ہے لیکن وہاں اس سماج میں رہتے ہوئے خاص طور پر وہ نسل جو اس سماج میں پیدا ہوئی ہو اور وہاں پروان چڑھ رہی ہو اس کے لیے زبان کے مسائل اتنے زیادہ نہیں ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس سماج میں وہ پرورش پا رہے ہیں وہ لاشعوری طور پر اس سماج کی زبان کو سیکھتے چلے جا رہے ہیں۔ مسائل تو اس وقت سامنے آئیں جب وہ گھر میں اردو یا پنجابی سیکھیں اور بولیں لیکن سماج میں وہ انگریزی میں اپنا مافی الضمیر بیان نہ کر پائیں۔ ایسی صورت حال وہاں پروان چڑھنے والی نسل میں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ اس لیے میرا نہیں خیال کہ ان کے لیے زبان کے کوئی مسائل پیدا ہوں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان کی اردو اور پنجابی میں انگریزی کی آمیزش کچھ زیادہ ہی ہو گی۔

سوال نمبر۱۰: کیا مشرقی زبانوں کے بھی انگریزی زبان پر کوئی اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

عطاءالحق قاسمی: کسی زبان کے کسی دوسری زبان پر اثرات کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر میں بھی کر چکا ہوں۔ جہاں تک مشرقی زبانوں کے انگریزی پر اثرات کا تعلق ہے تو وہ اسباب مثلاً مشرق کی اقتصادیات اور ثقافت وغیرہ مغرب کو زیادہ متاثر نہیں کر رہی، اور پھر مغرب میں جو مشرقی لوگ موجود ہیں ان کا تناسب یہاں مشرق میں مقیم مغربی لوگوں سے خاصا زیادہ ہے۔ مغرب کے جو لوگ مشرق میں ہیں وہ یہاں کی زبانیں سیکھتے ضرور ہیں لیکن انھیں ان کے استعمال کی زیادہ ضرورت نہیں پڑتی کیوں کہ ہمارے بہت سے امور ابھی بھی انگریزی میں ہی انجام دیے جا رہے ہیں جس کی وجہ سے وہ مغربی لوگ یہاں آ کر بھی ہماری مشرقی زبانوں سے دور ہی رہتے ہیں اس لیے مشرق زبانوں کے کوئی خاص اثرات انگریزی پر نہیں پڑ رہے۔

سوال نمبر۱۱: دوران سفارت کار آپ کو بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑا ہو گا جو مختلف ممالک کے تھے۔ آپ کیا سمجھتے ہیں اردو ادب اردو زبان مستقل میں کس زبان سے متاثر ہو گی۔؟

عطاالحق قاسمی: ایک دور تھا کہ ہمارے ہاں فارسی کی حکمرانی تھی اس دور میں ہماری زبان اور ادب دونوں فارسی سے بہت متاثر ہوئے تھے، بہت سی اصناف ایسی ہیں جو فارسی سے اردو میں آئیں۔ پھر انگریزوں کا یہاں غلبہ اور حکمرانی ہونے کی وجہ سے انگریزی کی اثرات پڑے اور انگریزی اصناف اردو میں داخل ہوئیں۔ ابھی تک تو صورت حال یہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے مترجم انگریزی تخلیقات اور تنقیدی کتب کو اردو میں ترجمہ کر رہے۔ آنے والے سالوں میں بھی میں تو یہی دیکھ رہا ہوں کہ اردو زیادہ تر انگریزی سے ہی متاثر ہو گی۔ انگریزی ادب کو اردو میں ترجمہ کرنے اور اپنی آنے والی نسلوں کو اس سے روشناس کروانے کے سلسلے نہ صرف ابھی تک جاری ہے بل کہ اس میں زیادہ شدت بھی آتی جا رہی ہے۔ جب آپ دوسری زبان کے ادب میں دلچسپی زیادہ لیں گے تو لازمی امر ہے کہ اس زبان اور ادب کے اثرات آپ کی زبان اور ادب پر مستقبل میں ضرور پڑیں گئے۔

سوال نمبر ۱۲: پنجابی اور اردو کے لسانی اشتراکات بہت ہیں کیا مستقبل میں اردو نثر پر پنجابی کے اثرات مزید گہرے ہوں گے یا اردو اپنی الگ راہ نکالنے میں کامیاب ہو جائے گی۔؟

عطاالحق قاسمی: اردو اور پنجابی تو لازم وملزوم ہیں۔ دونوں ایک ساتھ پلی بڑھی ہیں ایک ہی علاقے میں ان دونوں کی پرورش ہوئی ہے اس لیے ان دونوں کے لسانی کے ساتھ تہذیبی اور ثقافتی اشتراکات بھی بہت زیادہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو متاثر کرتی بھی ہیں اور اثرات قبول بھی کر رہی ہیں۔